www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلوچ قوم

2

قبائلی اور جاگیرداری عہد

شاہ محمد مری

گوشۂ ادب
جناح روڈ، کوئٹہ
e-mail: goshaeadab@yahoo.com

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

زعیم بخاری نے
گوشۂ ادب سے شائع کی

کتاب	:	بلوچ قوم: قبائلی اور جاگیرداری عہد
مصنف	:	شاہ محمد مری
اشاعت	:	2014ء
قیمت	:	390روپے

اسٹاکسٹ:
سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ۔
فون:092-81-2843229، فیکس:092-81-2837672

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انتساب

اُس خوش نصیب ساعت کے نام
جب انسان نے اولین آلہِ پیداوار ایجاد کیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست

پیش لفظ 8

پہلا باب: بلوچ سرقبیلوی نظام
13

بلوچ قبائل 18
قبیلے کا تنظیمی ڈھانچہ 59
قبائلی اور علاقائی اتحادیے 69
بلوچ قبائلی جنگی معیشت 75

دوسرا باب: بلوچ مویشی بانی
81

بھیڑ......بلوچ کی روٹی روزی 85
بھیڑ پال معیشت میں طبقاتی درجہ بندی 86
اون اور منڈی کا پھندا 91
جلو اور سات 94
جانوروں کا قتلِ عام 97
شیر وروغن 103
شتربانی (جت) 108
اشیائے ضرورت کی مقامی صنعتیں 111
ٹیکس اور امدادِ باہمی 116

تیسرا باب: بلوچ زراعت
121

لُڑآف 131
سیاہ آف 139
لُڑآف کے پیداواری رشتے 154

چوتھا باب: سمندری پیداواری رشتے
165

ماہی گیری 167
بوجیگ 174

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کشتی سازی	176
ماہی گیری کا جال	177

پانچواں باب: بلوچوں کا ویلیو سسٹم 183

پیدائش سے جوانی تک	188
طرزِ معاشرت	197
مذہبی معاملات	201
ممنوعات	209
کھیلیں	210
ادب	214
موسیقی	217
رقص	222
لوک کہانی	223
حال حوال	225
گالی	230
نظام انصاف	231
دستار و داڑھی	236
بیماری کے عقائد	236
موت کی رسوم	239

پیش لفظ

بلوچ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس ہے۔ ہر نارمل انسان کی طرح وہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے آباؤاجداد کا تذکرہ احترام کے ساتھ کیا جائے، اُسے اشراف نسل کا بتایا جائے۔ اپنا چونکہ نظریہ ہی یہ ہے کہ انسان ہوتا ہی اشرف المخلوقات ہے۔نسل اور خون کا خالص، ناخالص ہونا تو بس گپ ہے جو حاکم اور زورآوروں نے قائم کر رکھی ہے۔اصل میں اصل اور نقل، خاندان اور کمینہ تو کرتوتوں سے متعین ہونا چاہیے مگر فیوڈلوں نے اس کی بجائے پیشہ کو اصل اور نقل کی بنیاد بنا کر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔لوہے کا کام کرنے والا نقلی اور کچھ کام نہ کرنے والا بادشاہ۔ غدار بادشاہ ہے، اور عوام کا خادم کمینہ۔لطیفے ہیں بھئی۔اور اِن غیر سنجیدہ باتوں کو سنجیدہ بنانے والوں کے خلاف ہی تو ساری جنگ رہی ہے اپنی۔

بلوچ پر لکھنے والے آج تک کے سارے مؤرخوں نے ڈنڈا لے کر بلوچ کو بھگائے رکھا۔ہمیں سکونت نصیب ہی نہ ہونے دی۔کسی نے ''بھئو'' کہہ کہ ہمیں کسپین سی سے دوڑا دیا، کسی نے حلب سے ہماری دوڑ کی لگوادی اور کسی نے فارس سے......ہم اپنی دلیلوں کی عاجزانہ ٹوکری لے کر اُن سب سے الگ نظریہ لے آئے۔وہ یہ کہ ہم کہیں سے مہاجرت کر کے نہ آئے۔ بلکہ ہزاروں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برسوں سے یہی ہمارا وطن رہا ہے اور یہی ہمارا وطن ہے۔

ایک دوسری غلط فہمی ہم میں یہ ڈال دی گئی ہے کہ ہم تو گویا دو الگ الگ نسلوں یعنی دراوڑ اور آریا سے بنے ہوئے ہیں۔ کسی نے ہماری کھوپڑی ناپنی شروع کردی تو کسی نے ہماری ناک کو تولنا شروع کردیا۔ کسی نے ہمارے دانتوں کے بیچ فاصلے کو بیان کیا تو کسی نے ہماری زبان کا آریائی دراوڑی میں بٹوارہ کردیا۔ دراوڑستان تک قائم ہونے لگا۔ مگر مہر گڑھ دریافت نے اِن سب کے فرسودہ ترازو توڑ کر اور فیتہ ٹیپ کو اُن کے استادکار ہاتھوں سے چھین کر انہیں تاریخ کی ردی ٹوکری میں جا کے پھینک دیا۔

اور پھر، کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ قبائل روزِ اول سے موجود تھے اور آخر تک اسی طرح قائم رہیں گے۔ یہ غلط تصور ہے۔ قبائل میں تو ساخت و بگاڑ ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ خود ہماری زندگیوں میں نئے نئے قبیلے سامنے آئے۔ پہلے سے موجود قبیلوں کی بڑی بڑی شاخیں کسی دوسرے قبیلے میں جا کر ضم ہوگئیں۔ لہٰذا صرف تبدیلی کو دوام ہے۔ جو نہ تھا موجود ہوا، جو مستحکم وجود رکھتا تھا تحلیل ہوا۔

ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ سرقبیلوی نظام خود فارم بھی ہے اور کانٹینٹ بھی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ غلام داری، سرقبیلوی، جاگیرداری، سرمایہ داری اور ایک بڑی حد تک سوشلزم سب کے سب طبقاتی سماج ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سارے سماجوں میں طبقاتی تضاد وتصادم ایک بڑی حقیقت کے بطور ہمیشہ موجود رہتا ہے اور چونکہ دنیا میں ہر جگہ سرقبیلوی نظام متصل ہوتا ہے فیوڈل نظام سے، اس لیے اس میں کسان اور جاگیردار کے بیچ تلخ و شیریں تعلقات رہتے ہیں۔ اپنی آزادی کے لیے کسان طبقہ کبھی خفیہ و خفتہ اور کبھی اعلانیہ اور متحرک قسم کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ جبکہ فیوڈل اُسے ایسا کرنے نہیں دیتا، طاقت سے بھی، پیر کے دم درود سے بھی، اور شاعر کی دانشوری سے بھی۔

بلوچوں میں بھی قبائلی نظام کے ساتھ ساتھ (اور اُس کے بطن سے) فیوڈل نظام پروان چڑھتا رہا۔ اور قبائلی نظام میں رہتے ہوئے بھی کسان بغاوتیں نمودار ہوتی رہیں۔ سرقبیلوی نظام کے

آقا نے اپنے انتظامات کے ذریعے اِن کسان بغاوتوں کے ذکر کو کتابوں، محاوروں اور شاعری سے پرے رکھا۔ یوں بے شمار کسان مزاحمتیں بلا نوٹس و تذکرہ وقت کی دھند میں گم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک کسان تحریک آج سے پانچ صدی قبل 1574 میں چلی تھی۔ جو کہ بٹائی کی شرح میں کمی کے مطالبہ سے شروع ہوئی تھی۔ ''جالاریں کرخا'' کے علاقے سے شروع ہونے والی اس کسان بغاوت کی قیادت سومار رکھیا کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک سندھ تک پھیل گئی۔ جاگیرداروں نے خان قلات کو مدد کے لیے پکارا۔ چنانچہ 1574 میں امیر سنجر نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی میرو کے ساتھ ایک بڑا لشکر ''جلاّریں کرخا'' بھیج دیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ کسانوں کا لیڈر سومار جنگ میں مارا گیا اور کسان تحریک کچل دی گئی۔ کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ان چھوٹی بڑی مزاحمتوں اور ان سے متعلق ادبی کاوشوں کو ڈھونڈ کر کتاب میں شامل کیا جائے۔

ان ساری کسان، اور بین القبائلی لڑائیوں میں ان ساری نقل مکانیوں میں نہ تو ساری آبادی قتل ہوئی اور نہ ہی سب کے سب لوگ علاقہ چھوڑ گئے۔ ان پہاڑوں، دروں اور غاروں میں کچھ انسان تو ضرور بچ گئے ہوں گے جو بلوچوں کے کسی نہ کسی قبیلے سے متعلق تھے یا پھر اس قبیلے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ رند کے آنے سے قبل بلوچستان کا کوئی حصہ بھی آدم زاد سے خالی ہرگز نہ تھا۔ اس لیے ہم اپنی داستانوں میں جب پوری بلوچ قوم کو محض فردِ واحد کی اولاد کہتے ہیں تو یہ مکمل سچ نہیں ہے۔ ہم چاکر اور گوئہرام کی اولاد ضرور ہیں مگر چاکر اور گوئہرام بھی کسی کے بیٹے پوتے اور پڑپوتے تھے۔ وہ ہمارے اجداد تو تھے ہمارے جدامجد بالکل بھی نہیں۔ ہمارے دریا کا سرچشمہ تو بہت دور واقع ہے۔

ہمارے بارے میں انگریز کی مرتب کردہ تاریخ بھی لفظ بہ لفظ درست نہیں ہے۔ اس میں گردن توڑ جھول موجود ہیں۔ دانستہ اور غیر دانستہ دونوں طرح سے غلط بیانی کی گئی ہے۔

اسی طرح، نظریہِ پاکستان، مقتدرہ زبان اردو اور اسلام کی تکون، تاریخ کو اپنے مخصوص نکتہ نگاہ کے اندر سکیڑ کر بلوچ کی سالمیت کو مجروح نہیں کرسکتے۔ تاریخ کے بارے میں یہ تینوں سیٹ (یعنی ہماری سینہ بہ سینہ چلنے والی روایت، برطانوی ہینڈ بیگ والی تاریخ اور شناخت کی تلاش میں سرگرداں بے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شناختہ پاکستانی مؤرخ) بلوچ کے بارے میں ہماری معلومات کو محدود رکھنے کے وسیلے رہے ہیں۔

خود بلوچ مؤرخوں نے جب بھی تاریخ نویسی کے لیے قلم سنبھالا تو دراصل اپنے قومی مستقبل کے لیے موت کا نوحہ ہی لکھا، اس لیے کہ ہم نے اپنی قوم کو ایک ایسی نفسیات دے دی جس میں ان کے لیے ماضی میں کھو کر رہ جانے کی منظر کشی کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے مؤرخ نے قوم کو مستقبل دیا ہی نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہم ماضی سے رشتہ توڑنے کی حماقت بالکل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ترقی تو نام ہے تواریخی تسلسل کا۔ ماضی کے پیٹ سے حال اور حال کے بطن سے مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ بلوچ کے پاس بلاشبہ ایسی تاریخ موجود ہے جس پہ شرمندگی کے بجائے فخر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس اثاثہ کو سنبھال کر اسے جھاڑ صاف کر کے ہمیں حسین، روشن اور ناقابلِ بیاں مستقبل کے لیے قوم کی فکری راہنمائی کرنا ہوگی۔ بلوچ مؤرخ اور دانشور ابھی تک اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا نظر نہیں آتا۔ وہ اس تابناک تاریخی ورثے پر ایک حسین مستقبل کے خدوخال نہ دے سکا۔ یعنی وہ، تاریخ کو اُس نقطۂ نظر سے دیکھ ہی نہ سکا جو ہمیں ماضی پرستی سے نکال لے۔ بلوچ کی حرکت و جہد بھری تاریخ اُس کے لیے شاندار حال اور روشن مستقبل کے تسلسل میں بڑی اہلیت رکھتی ہے۔ میں نے اسی اہلیت کو دیکھنے جانچنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور گوشہ تحقیق و تالیف و تصنیف سے مبرا رہ گیا ہے۔ بلوچ کی مرحلہ وار معاشی سرگرمیوں کی سیڑھی چڑھنے کا آنکھوں دیکھا حال ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک طائرانہ نگاہ ہم نے ڈال تو دی مگر یہ ناکافی ہے۔ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اعداد و شمار سے مکمل طور پر محروم ملک میں ہم اعداد و شمار دے ہی نہیں سکتے۔ جو منابع ہیں بھی وہ سب کے سب غلط اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ پچھلے ایڈیشن تک تو پھر بھی کچھ نہ کچھ باوردار ڈیٹا موجود تھا۔ اُس کے بعد کی مجرم وفاقی اور چور صوبائی حکومتوں نے اعداد و شمار سے یوں خوف کھایا جیسے پاگل کتے کا کاٹا، پانی سے خوف کھاتا ہے۔ وہ Movable کو دبئی لے گئے، Immovable پر گرد و غبار کی ایسی تہیں چڑھا دیں کہ کوئی شریف حکومت ہی سے مطلع صاف ہوسکتا ہے۔ اور شریف حکومت اس منطقے میں بورژوا الیکشن سے تھوڑی بنتی ہے؟!

ایک آخری بات؛ وہ یہ کہ بلوچ کا رہن سہن، رسوم و عقائد، تہذیب و ثقافت کیا ہے؟۔ یہ بحث ہم اس جلد میں جان بوجھ کر لائے۔ اس لیے کہ رسوم و رواج صرف اور صرف قبائلی اور زرعی دور بنتے ہیں۔ صنعتی دور میں رواج نہیں، لکھا ہوا آئین بنتا ہے۔ رسوم و رواج اپنے، مقامی اور دیسی ہوتے ہیں جبکہ آئین میں درآمدی شقیں بہت ساری ہوتی ہیں۔ رواج شروع میں سب اچھے ہوتے ہیں، آگے جا کر سماجی ترقی انہیں اپنے لیے رکاوٹ یا زنجیر دیکھتی ہے اور انہیں یکسر ختم کرنے یا بدل دینے کی کوششیں کرتی ہے۔ ہم نے ان بند و رواں تبدیلیوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔

اس خواہش کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ خدا کرے بلوچ سما کی روانی جاری و ساری رہے، اسے سکوت و جمود نصیب نہ ہو۔

شاہ محمد مری

ماوند

جنوری 2014

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلا باب

بلوچ سرقبیلوی نظام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسان ایک سماجی مخلوق ہے ۔ لہٰذا وہ الگ تھلگ رہ ہی نہیں سکتا۔ کرۂ ارض پہ اس کی سرشت اور حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ اس کے دشمن بہت ہوتے ہیں۔ اور خواہ کوئی فرد کتنا ہی رستم اور سہراب (دونوں بلوچ تھے) کیوں نہ ہو، اسے اِدھر اُدھر خود سے زیادہ قوی اور طاقتور مخلوق سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے فرد کو تحفظ چاہیے، حفاظت چاہیے۔ اور چونکہ انفرادی طور پر حفاظت کرنے کے وسائل ایک اوسط آدمی کے پاس نہیں ہوتے اس لیے وہ ایک اجتماع، ایک اکٹھ، اور ایک ایسوسی ایشن بناتے ہیں۔ وہ اپنے وسائل اور قوتیں باہم ضم کر دیتے ہیں تا کہ وہ ایک نارمل زندگی گزاریں۔

..........یوں گروہی (قبائلی) زندگی شروع ہوئی تھی۔

اس گروہی زندگی (حکومت) نے اپنے ممبروں کو سیکورٹی دی، اور بہبود دی۔ اس کا سماجی ڈھانچہ کچھ اس طرح منظّم ہے کہ جب لوگ اس سماجی سیٹ اپ میں پیدا ہوتے ہیں تو انہیں آٹو میٹک انداز میں اس کی ممبرشپ ملتی ہے۔ انسان کی گروہی زندگی اس زمانے میں شروع ہوئی جب وہ خانہ بدوشی پہ مجبور تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خانہ بدوشی ایک تہذیبی ادارہ ہے۔ اتنا ہی جدید، ترقی

یافتہ اور منظّم جتنی کوئی بھی تہذیب ہوسکتی ہے۔ یہ حکومت کی اولین صورت تھی۔ دوسری کسی بھی تنظیم کی طرح اسے بھی اپنا تنظیمی ڈھانچہ اور لیڈرشپ بنانے پڑے۔ قبیلے نے خود اپنا ضابطہ اخلاق اور ضابطۂ وقار بنائے۔ اس نے ایک کلچر پیدا کیا جس نے سب کے لیے مرکزی ویلیو سسٹم کے بطور کام کیا۔ اس کلچر کی پابندی سب پر لازم ہوئی۔ یہی کلچر گویا اس کا آئین بن گیا۔ قبیلے کے سارے ممبروں کے لیے لازم ٹھہرا کہ وہ اپنے قبیلوی آئین کو تسلیم کریں، اور اسے اپنے دوسرے قبائلی بھائیوں پر لاگو کریں۔

گروہ (قبیلے) کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ حفاظت اور سیکورٹی مہیا کرے۔ پڑوسی ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ جب کوئی جھگڑا شروع ہوتا ہے تو دونوں قبیلے عموماً اسے اپنے کلچر کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جھگڑا ایک جنگ کی شکل اختیار کرے تو قبیلے کی لیڈرشپ کو جنگ کرنا پڑتا ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی طرف اموات کم سے کم کرائے۔ اور جتنی جلد ممکن ہو فتح پائے، یا کوئی حل نکالے۔

جب بھی قبیلہ فرد کو بہبود، سیکورٹی، کلچر اور ایک سیاسی نظام دینے کے قابل نہیں رہتا تو پھر سمجھئے کہ قبائلی ڈھانچہ دیمک زدہ ہوجاتا ہے اور اس نے حتماً رفتہ رفتہ ختم ہوجانا ہے۔

جب بھی ہم کسی قوم بالخصوص بلوچ کی قبیلوی ساخت کی بات کریں گے تو ہم دراصل ایک خانہ بدوش پس منظر رکھنے والے معاشرے کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ (گو کہ اب یہ صورت نیم آبادی اور نیم خانہ بدوشی والی ہے)۔

اسی طرح ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ بلوچ سرقبیلوی نظام کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بلوچستان کے طول وعرض میں قبائلی نظام ایک جیسا اور خالص کلاسیکل انداز میں موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچوں میں سرقبیلوی نظام کے ساتھ ساتھ اس سے پیچھے والے نظام یعنی غلام داری بھی موجود تھی اور اس سے آگے والا نظام یعنی جاگیرداری نظام بھی موجود رہا۔ (ہمارے ہاں قبائلی نظام کے ساتھ ساتھ غلام داری نظام بیسویں صدی کے وسط تک باقاعدہ جاری تھا)۔

بلوچ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس قوم ہے۔ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود کو معزز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محترم اور اصلی قرار دینے میں سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوتا ہے۔ ہر کسی کو اگر اپنی برتری کا نہیں تو کم از کم دوسرے سے برابری کا یقین ضرور ہے۔ ''میں' میرا دادا، میرا قبیلہ'' .... اس ''میں'' نے بلوچ کو تباہ بھی بڑا کیا مگر اسے بقا بھی اسی ''میں'' نے دی۔ بس یہ ''میں'' ذرا سا ''ہم'' ہو جائے تو بلوچ قوم کے وارے نیارے ہو جائیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ ہر انسان اشرف المخلوقات میں سے ہے۔ عربی عجمی پہ کوئی بالا دستی نہیں رکھتا اور گورا کالے پہ کوئی برتری نہیں رکھتا۔ اپنی قوم اور اس وطن کے لیے سب سے غریب اور سب سے دھتکارے ہوئے بلوچ لڑے ہیں۔ بلوچ ویلیو سسٹم کا تقدس انہی غریب (معاشی یا سماجی طور پر) لوگوں کے دم سے قائم ہے۔ فضیلت کے چکر میں پڑے بغیر اپنی اِس تصنیف میں ہم نے مختلف نظریات (اُن کے حوالے دے کر) بیان کر دیے ہیں۔ ہم ہر ہر باب کے اندر اصلی نقلی کی تفریق کے خلاف بات کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جو نہ تو سائنسی ہے، نہ ہی مستند اور نہ ہی علمی ادبی لحاظ سے پسندیدہ۔ شیخ سعدی نے کہا تھا؛

بنی آدم اعضائے یک دیگرانند
کہ در آفرینش زیک گوہرانند
چو عضوے بہ درد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

ایک اور بات کہنی ضروری ہے کہ آج کے ہمارے سارے اہم قبائل بہت بعد میں تشکیل پائے ہیں۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مری، بگٹی، مینگل سے لے کر لُنڈ لیغاری، بزدار، بلیدی اور جکھرانڑیں تک سارے اہم قبائل کا ذکر ہمیں پرانی بلوچی شاعری میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔(1)

ایک بات کا خیال رہے کہ مشرق کی ہر جنگی قوم کی طرح بلوچ قوم اور اس کے ہر قبیلے کی ابتدا اور تاریخ بھی بہت دھندلی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بلوچوں کا ذکر سب سے پہلے ساسانی دورِ حکومت میں (22-651 عیسوی) ''شاہنامہ فردوسی'' میں ملتا ہے۔ جہاں یہ حقیقت چھلکتی ہے کہ بلوچ، ظالم حکمران نوشیروان کے عہد تک ایک منظّم جماعت بن چکے تھے۔ مگر سردار

شیر باز مزاری نے لکھا کہ بلوچ کا اولین تذکرہ بازنطینی تاریخ دان پروکوپیئس کے ہاں ملتا ہے جس نے انہیں چھٹی صدی عیسوی میں کاکسس کے پہاڑوں میں بتایا۔

بلوچوں کی تنظیم بہت ہی متفرق انداز میں قائم ہے۔ اُن میں سے ایک ترکی والی بنیاد ہے۔ بے شمار الفاظ ہم میں اور ترکی زبان میں مشترک ہیں۔ تمن، بولک اور اولس وغیرہ۔ اسی طرح چاکر، سنجر اور زنگی بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے ہمارے ہاں پورے کے پورے قبائل موجود ہیں۔(2) مگر یہ سارا تذکرہ بہت حالیہ ہے۔ ہمیں مہر گڑھ زمانے کے لوگوں کے بارے میں جاننے میں ابھی بہت زمانہ لگے گا۔

1-بلوچ قبائل

اربابی

اِن لوگوں کو کواشی بھی کہتے ہیں۔ بندر عباس کے بلوچوں کو عباسی کہتے ہیں۔ پاکستانی بلوچستان میں یہ علیحدہ وجود نہیں رکھتے۔ مختلف قبیلوں کی بہت چھوٹی ذیلی شاخوں کی صورت وجود رکھتے ہیں۔

اسماعیل زئی

یہ قبائلی اتحاد یہ ماضی قریب میں بلوچوں کے کچھ چھوٹے قبیلوں کے اکٹھے ہونے سے وجود میں آیا۔ یہ لوگ ایران و پاکستان کی سرحد کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے علاقے کوہ یارت، غور بند، چشمی، دامک، حیدر آباد، مزار آب اور دِھک پر مشتمل ہیں۔ 38-1937 کی بغاوت کے دوران شاہِ ایران کی فوجوں نے اسماعیل زئی قبیلے کو شکست دی۔ فقیر زئی، خوذ زئی، کریم زئی اور اللہ بخش اس کے ذیلی طائفے ہیں جبکہ توتو زئی، شاہوزئی، حسن زئی اور محمد زئی نامی دوسرے بلوچ قبائل اس میں جذب ہو چکے ہیں۔

بادینی

یہ بلوچ قبیلہ پاکستان، ایران، افغانستان، ترکمانستان، ماسکو کی بلوچ آبادی میں وجود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھتا ہے۔ یہ بلوچستان کے نوشکی کے علاقے میں آباد ہے۔ اس کے علاوہ سندھ اور پنجاب (مظفر گڑھ اور علی پور) میں بھی بادینی موجود ہیں۔ بلوچستان میں تو بادینی اور مری قبیلے کی بڑانی شاخ الگ الگ موجود ہیں مگر پنجاب میں اس فرق میں اچھا خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔

بادینی کے ذیلی قبائل میں جیند زئی (سردار خیل طائفہ)، انگلزئی، عزت زئی، مصری زئی، جنگے زئی، قمبر زئی، ہالوزئی، گورگیژ، فقیر زئی، مکا کی، کمال زئی، دشتکانڑیں، بنگلانڑیں، مندوزئی، دائزئی اور بلوزئی شامل ہیں (ذرا ملاحظہ کریں کہ بادینی کی ان شاخوں کے نام سے دوسرے بلوچ قبائل میں بھی گروہ شامل ہیں۔ اور کہیں کہیں تو الگ قبائل اس نام سے موجود ہیں)۔

باران زئی یا بارکزئی

بمپور کے بلوچوں کا یہ طاقتور قبیلہ 1928ء تک بلوچستان پر حکمرانی کرتا رہا۔ مغربی بلوچستان کا آخری بلوچ حکمران میر دوست محمد، باران زئی تھا۔ اسے شاہِ ایران رضا شاہ اول نے قتل کر دیا۔ باران زئی جالک، دیزک اور ارفشان میں بھی آباد ہیں۔ اس کے چھوٹے اور الگ الگ فرقے کراچی، اندرون سندھ اور وسطی بلوچستان میں بکھرے انداز میں آباد ہیں۔

بِر ہمانڑیں

یہ قبیلہ ڈیرہ غازی خان، راجن پور، جام پور اور مظفر گڑھ میں آباد ہے۔ اس کا کچھ حصہ لیغاری میں ضم ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بڑا حصہ ڈومبکی قبیلے کو تشکیل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ برہمانڑیں لاڑکانہ، ہالہ، حیدر آباد، کیرتھر پہاڑ اور سمندری ساحل پہ آباد ہے۔ سرائیکی اکثریتی زبان ہے۔ کچھ لوگ سندھی کو مادری زبان کے بطور اپنائے ہوئے ہیں۔ بلوچی سیکھنے کی حسرت عالمگیر ہے۔

بزدار

قبیلہ بلوچوں کا ایک اور بڑا قبیلہ ہے جس کے لغوی مطلب ہیں ''بکریاں پالنے والا''۔ مگر جس طرح ہاتھی کے دکھانے کے دانت اور ہوتے ہیں اور کھانے کے اور۔ اسی طرح بزدار اپنے نام کے برعکس بکریاں نہیں بلکہ بھیڑیں پالنے والا قبیلہ ہے۔

یہ قبیلہ رندولاشار کے زمانے (پندرہویں صدی) تک بطور منظم قبیلہ موجود نہ تھا۔ اس کی موجودہ صورت کی تشکیل، بہت بعد میں ہوئی۔ کوہِ سلیمان میں سنگھڑ درے کا مالک یہ رند قبیلہ کیسرانڑیوں کی طرح موسیٰ خیل اور جعفر قبیلوں کے اڑوس پڑوس میں آباد ہے۔ ڈُرگ کھور، بزدار اور کیسرانڑی کے بیچ حد بندی کرتا ہے۔ بزدار کا علاقہ سارے کا سارا کوہستانی بلندیوں گھاٹیوں پر مشتمل ہے۔ کھترانڑ اور نگٹی بھی بزدار کے پڑوسی ہیں۔ اس کی ذیلی شاخوں میں دولانڑیں، لدوانڑیں، غلامانڑیں، چاکرانڑیں، سیھانڑیں، شاہوانڑیں، جلالانڑیں، دوستلانڑیں، جہانانڑیں، احمدانڑیں، جافرانڑیں، اور رستمانڑیں شامل ہیں۔

بارتھی بزداروں کی وہ بستی ہے جس پر 1857 میں انگریزوں نے قبضہ کر کے اسے آگ لگا دی تھی۔ کوہ سلیمان اور راجن پور کے علاوہ بزدار لوگ ملتان، لیہ، تونسہ، دادو، ٹنڈو اللہ یار، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈو غلام علی، سکھر، میر خانڑیں، خیر پور، گھوٹکی، سیہون، کھپرو، حیدر آباد اور میر پور ماتھیلو میں آباد ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان و پنجاب کے سرحدوں پہ تو مویشی بانی کرتے ہیں اور بقیہ علاقوں میں کاشتکاری۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی ہیں۔

بلفتی

شاہ لطیف کی شاعری میں ''بُرفت'' کے بطور اِن کا ذکر موجود ہے۔ ماوند میں ایک باغار پر اِس قبیلے کی کلمتی قبیلے کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں دونوں کی تباہی کے آثار ابھی تک ''باغار سر'' میں موجود تھے۔ یہ لوگ سہون، کوٹڑی، لیاری، لسبیلہ اور مکران میں بکھرے انداز میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ باہو، چاہ بہار اور ڈیرہ جات میں بھی اس قبیلے کی ٹکڑیاں موجود ہیں۔

بلیدی

(بلیدہ سے بلیدی) یہ ایک قدیم قبیلہ ہے جو رندولاشار سے بھی قبل مکران کے بلیدہ میں آباد تھا۔ اس کے علاقے مغربی (ایرانی) بلوچستان میں رسک، قصر قند اور فانوج ہیں۔ بلیدی مکران میں بہت عرصہ حکمران رہے۔ اس قبیلے کا تعلق دراصل بلیدہ سے ہے جو کہ مکران میں واقع ہے۔ انہوں نے گچکیوں کو شکست دی تھی اور مکران پر قابض ہو گئے تھے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ قبیلہ مری بگٹی علاقے میں آباد تھا۔ بالاچ گورگیژ کی ساری دشمنی اسی قبیلے کے ساتھ تھی۔اور یہ ساری جنگ مری بگٹی علاقے میں لڑی گئی تھی۔

بلیدی سبی، گنداواہ، پٹ فیڈر، جیکب آباد، تنگوانی، کندھ کوٹ اور کشمور اور پنجاب میں آباد ہیں۔گولہ، جوفوزئی، کھر کانڑیں، بجارانڑیں، سُندرانڑیں، پیتافی، سوہریانڑیں، تیغانڑیں، ہاجیجہ، لولائی، پیتافی اور ریعتی اس کی ذیلی شاخیں ہیں۔

انہیں بردی بھی کہا جاتا ہے بالخصوص اس گروہ کو جو سندھ میں آباد ہے۔

بقال

ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والا دکاندار طبقہ ہے۔کہیں بلوچی بولتا ہے تو کہیں براہوئی، کہیں سندھی تو کہیں سرائیکی میں بات کرتا ہے۔سکھ دھرم کی معمولی اقلیت نے بھی خود کو اسی بڑے نام میں شامل کر رکھا ہے۔ بلوچستان میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں کہ ہر جگہ کے لوگوں کو اشیائے صرف کی ضرورت ہوتی ہے۔اشیائے صرف کی ضرورت ایک بنیادی انسانی خاصیت ہے۔ بلوچ معاشرے میں یہ اشیائے تصرف بقال سپلائی کرتے ہیں۔

اپنی مذہبی رسومات میں مکمل آزادی رکھتے ہوئے، سردار کو معمولی ٹیکس نما تحفے تحائف کے عوض تجارت میں مکمل آزادی رکھتا ہے۔

بنگلزئی

یہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔بلوچستان کے کئی علاقوں میں آباد ہیں۔ بنیادی طور پر رند بلوچ ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔ یہ قبیلہ خانِ قلات کے سار اوان قبائل میں شمار ہوتا ہے۔مگران کے کچھ طائفے براہوئی اور سندھی بھی بولتے ہیں۔سندھ میں بکھرے ہونے کے علاوہ اصل قبیلہ اپنے علاقے نرمک وجوہان میں رہتا ہے۔ ان کی سرداری پہلے گوئہرام زئی کے پاس تھی جو بعد میں سید زئی کے پاس آ گئی۔اُن کا فیوڈل ہیڈ کوارٹر اسپلنجی ہے۔اس کے ذیلی طائفے یوں ہیں؛ گوئہرام زئی، دینارزئی، گرانڑیں، شوران زئی، بدوزئی، بجارزئی، شاہوزئی، مندوانڑیں، پُژ، پِھگ۔ملّا مزار بنگلزئی زبردست سامراج دشمن شاعر تھے۔

بیزن جَو

میر غوث بخش بزنجو کا یہ قبیلہ ایک وسیع علاقے میں آباد ہے۔نال تو بابا غوث بخش بزنجو کا گھر ہے،مگر خضدار، آواران، کولواہ، جھاؤ اور بیلہ میں بھی بزنجو آباد ہیں۔ایرانی بلوچستان میں بھی بزنجو دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ بلوچی بھی بولتے ہیں براہوئی بھی ۔ پہاڑ میں بھی رہتے ہیں اور میدان میں بھی۔

میر بیزن نام نہیں ہے بلکہ امتیازی خطاب ہے جس کا اطلاق بعد میں سارے قبیلے پر بزنجو یعنی بیزن کی اولاد کی صورت میں ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب احمد شاہ ابدالی افغانستان کا بادشاہ بنا اور اس کے فوراً بعد اس نے افغان سرداروں کو جو خطاب دیے ان میں سردار میر جہاں خاں پوپلزئی بھی تھے جس کو احمد شاہ نے میر بیزن اور خان خانان کا خطاب دے کر اپنی فوج کا سربراہ مقرر کیا تھا۔

حملانڑیں سردار خیل طائفہ ہے۔اس کے علاوہ بزنجو کی ذیلی شاخیں یہ ہیں؛ تمرانڑیں، ہومرانڑیں اور سیاہ پاذ۔

پرّکانڑیں

چھوٹا مگر قدیم قبیلہ ہے۔ خانہ بدوشی اور مویشی بانی کرتا ہے۔کوئٹہ کے آس پاس اور افغان سرحد پر خانہ بدوشیاں کرتا رہتا ہے۔بھیڑ پالی روٹی روزگار کی مطابقت میں ہمہ وقت چوکنا رہنا اس قبیلے کی اجتماعی نفسیات ہے۔

پرکانڑیں تقریباً سارے کے سارے براہوئی بولتے ہیں۔

پیتافی

بلوچی زبان میں دو خوبصورت باہم متضاد الفاظ ہیں؛ پیتاف اور سابند۔سابند وہ علاقہ ہوتا ہے جہاں اکثر سایہ رہتا ہو۔جبکہ پیتافی دھوپ والے علاقے کو کہتے ہیں۔

یہ کسی بڑے کوہستانی سلسلے کے دامن میں آباد علاقوں کے اوصاف ہوتے ہیں۔

اس قبیلے کے لوگ ڈیرہ جات (غازی خان اور اسماعیل خان) میں آباد ہیں۔ کچھ لوگ مظفرگڑھ میں بھی سکونت رکھتے ہیں۔اسی طرح، منتشر انداز میں سندھ میں بھی اس قبیلے کی چھوٹی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھوٹی ٹکڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔

جام

جام یا جاموٹ ایک خلط ملط بلوچ قبیلہ ہے۔لسبیلہ اور پٹ فیڈر میں رہنے والے یہ لوگ زیادہ تر بلوچوں میں کسان طبقہ تشکیل دیتے ہیں اور کسانوں کی جاگیردار دشمن جدوجہد دراصل اسی مخلوط قبائلی اتحادیے کی جدوجہد ہے۔جام،لسبیلہ کے حاکم بھی ہیں۔جام کا لفظ بلوچ شاعری میں بہت استعمال ہوا۔جس کے مطلب ہیں خوبصورت ، گہرا دوست ،قوی، طاقتور،معتبر......الغرض یہ لفظ پیار کے بہت سے معنی دیتا ہے۔

جاموٹ

بلوچستان کے پٹ فیڈر کے زرعی علاقے میں کسان اپنے طبقاتی حریفوں کی طرف سے،اور خود اپنی طرف سے اس مجموعی نام کو خود پہ مسلط کر چکے ہیں۔اور اگلا ظلم یہ کہ وہ پہلے تو بلوچ کی صفت سے نکالے گئے تھے، اب وہ آہستہ آہستہ برابر درجے کے شہری ہونے سے بھی کیے جارہے ہیں۔طبقاتی نظام اپنے ساتھ بدترین چھوت چھات لاتا ہے۔مگر سچی بات یہ ہے کہ سیاسی تحریک اس ساری جاگیردار ساختہ باتوں روایتوں کو برباد کردے گی۔

جت

جت ایک مخلوط النسل گروہ ہے۔زیادہ تر شتربانی کرتے ہیں۔بلوچ قوم ابھی بلوغت کی اس سطح تک نہیں پہنچی جہاں اپنے سارے ممبروں کو برابری کا درجہ دے سکے۔ جت کی اکثریت بلوچستان کے شمال مشرقی حصے میں رہتی ہے ۔ اس کے فرقے ہیں؛ میر جت ،لاشاری ، براہانی (باہرانی) ، مجیدانی، بُھنڈا،لنجوانی، ببر، وسوانی اور بلادی (3)۔اسی طرح کنڈ کانی، حجانو، دائی دانو بھی جت ہیں۔

شتربانی کرنے والے بلوچ ہیں۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں سرائیکی بولتے ہیں۔مگر قبائل میں بکھرے ہوئے جت بلوچی بولتے ہیں۔سرائیکی بولنے والے باہم نسبتاً زیادہ قریب ہیں،اس لیے ان کی قبائلی حیثیت اُن جتوں سے بہت بہتر ہے جو قبیلوں میں اِکاڈُکا بکھرے ہوئے ہیں۔

جتک

ایک آدھ بکھری اکھڑی شاخیں سندھ اور ڈیرہ جات میں رہتی ہوں گی۔مگر اس قبیلے کا بڑا اور مرکزی حصہ بلوچستان میں رہتا ہے۔نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے اور دیگر بلوچوں کی طرح مویشی بانی کرتا ہے۔ کچھ لوگ کوئٹہ کے گردونواح میں گاؤں آباد کیے ہوئے ہیں جہاں وہ چھوٹا کاروبار، سرکاری ملازمت اور دیگر شہری روزگار کرتے ہیں۔

جتوئی

جتوئی ہزاروں کی تعداد میں سندھ میں رہتے ہیں۔ پنجاب بھر میں موجود ہیں۔ بالخصوص مظفر گڑھ،ساہیوال، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، جھنگ،شاہ پور اور لاہور میں۔اس بلوچ قبیلے کی بہت کم تعداد بلوچستان میں رہتی ہے۔ ہمارا بزرگ جناب حیدر بخش جتوئی انقلابی کے بطور شہرت کے آسمانوں کو چھو گیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت سیاست کی اور شاعری کی۔اس رند قبیلے کی ذیلی شاخیں ہیں؛مظفرانی، فتح ہانڑیں،شاذیں زئی،خلورانڑیں۔

جسکانڑیں

یہ بلوچ قبیلہ بلوچستا ن میں کم، اور سندھ و پنجاب میں زیادہ تعداد میں آباد ہے۔بالخصوص ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں۔کیا یہ لوگ بلوچی لفظ ''جسک'' (Jusk) سے منسوب ہیں جس کے مطلب ہیں؛''جھنجھوڑ ڈالنا''؟۔

جکھڑانڑیں

کچھی اور شمالی سندھ کا بڑا قبیلہ ہے۔رند کی شاعری میں موجود نہیں۔یعنی یہ بعد میں تشکیل پانے والا قبیلہ ہے۔ان میں سیاہ پاذ نامی قبیلہ موجود ہے۔جس کا بڑا حصہ خاران میں آباد ہے۔

جمالی

بلوچستان میں جعفر آباد ، روجھان، اور نصیر آباد میں رہتے ہیں۔ سندھ (مورو، دادو، نواب شاہ، حیدرآباد اور ٹیاری) کے علاوہ پنجاب میں بھی جمالی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ قبیلے کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اہم شاخیں یہ ہیں؛ تھارانی،شاھلیانی،شاھل زئی،مندرانی،ساہریانی (دراصل کھوسہ ہیں)،وسوانی ،بھندانی،بابر،ٹینگیانی،مانجھی،پہنوراور ریحان والس۔(4)

نہری پانی ملنے کے بعد سے یہ قبیلہ بلوچستان کا فیوڈل طبقہ تشکیل کرتا ہے۔اس علاقے میں کسان تحریک کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سر اٹھاتی رہتی ہے۔اس تحریک کو دبائے رکھنے کی خاطر جمالی فیوڈلز مرکزی سرکار کی حمایت پر مجبور رہتے ہیں۔

چانڈیہ

سبی، لاڑکانہ،اورڈیرہ غازیخان میں بودوباش رکھتے ہیں۔چانڈکا کے نام سے تو لاڑکانہ میں اُن کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔اس بہت بڑے مگر بہت بکھرے قبیلے کی شاخیں یہ ہیں؛ گرمانڑیں، حسنانی،آجیانڑیں،سخانڑیں،کمبرانی،غیبانڑیں،مارفانڑیں،چولیانڑیں،بنگلانڑیں، مصرانی،الہیارزئی،میروانڑیں،بھنڈانڑیں،مرزانڑیں،حیدرانڑیں،للوانڑیں،نوثانڑیں......۔ایک ویب سائٹ(5) میں ذکر ہوا کہ یہ قبیلہ رندو لاشار کی جنگ کے زمانے میں ہربوئی اور ڈھاڈر سے نکل کر ڈیرہ غازی خان کے علاقے آیا۔اُن کے اس زمانے کے سردار ہیرین خان کی قبر حضرت سخی سرور کے احاطے میں ہے ۔ یہاں سے یہ قبیلہ لاڑکانہ مائیگریٹ کر گیا۔جنگیں، قحط سالیاں، ناراضگیاں اور چراگاہیں ہماری مہاجرتوں کا سبب رہی ہیں۔

چانڈیو کے نام کے مترادفات بے شمار ہیں۔ذرا سے ہجے بدل دیں تو آپ کو یہ قبیلہ بلوچستان میں سبی، جعفرآباد، اوستہ محمد، بولان، خضدار، کرخ، بارکھان، ماونداور گوادر میں ملے گا۔ سندھ اور پنجاب تو خصوصی طور پر گنجان انداز میں چانڈیہ کے رہائشی مراکز ہیں۔ضلع لاڑکانہ، ضلع کمبر، ضلع دادو، ضلع نواب شاہ، میرپورخاص، بدین، کراچی، شکارپور، سکھر، خیرپور.........سب چانڈیو ہی چانڈیو۔اُدھر آپ ملتان جائیے، مظفرگڑھ جائیے، لیہ اور بکھر اور دریا خان جائیے چانڈیو آپ کو وہاں کے مستقل باشندوں کے بطور ملیں گے۔

حسنی

چاکر و گوئہرام کے معلوم دور تک اس قبیلے کا کوئی نام موجود نہیں ہے۔ یہ بہت بعد میں

تشکیل پایا۔یہ قبیلہ دو بڑی ٹکڑیوں کی صورت بلوچستان میں آباد ہے۔ایک تو رکھی، رڑکھن کے وسیع علاقے میں، ایک دوسری ٹکڑی سبی کے نواح میں آباد ہے۔دونوں حسنی زراعت سے وابستہ ہیں۔ اس قبیلے کی ذیلی شاخیں اس قدر بڑی ہیں، یا، دور بکھری ہیں کہ وہ الگ قبیلے بن چکے ہیں۔لیکن بنیادی طور پر حسنی کی شاخیں یہ ہیں؛ بوبخیانڑیں،تھویانڑیں،رئیسانڑیں،شاہانڑیں،مُمیانڑیں، مندوانڑیں،شیلاچی،نوذہانڑیں،جہلوانڑیں،سوبیانڑیں۔

خشک

یہ بلوچ قبیلہ گھوٹکی، ٹھٹھہ، دادو، کنڈیارو، شکارپور، ٹیاری اور حیدرآباد میں بکھرے انداز میں آباد ہے۔بلوچستان میں سبی، اوستہ محمد، تربت، نصیرآباد، جھل مگسی وغیرہ میں ان کی ٹکڑیاں آباد ہیں۔ڈیرہ غازی خان، رحیم یارخان، مظفرگڑھ اور خان پور میں بھی خشک رہتے ہیں۔

خوجے

قدیم وقتوں سے ساحلی علاقوں کے بلوچ ہیں۔ ہمیشہ سے تجارت سے وابستہ رہے ہیں۔انگریزوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس ہر ملک کا سکہ ہوتا تھا۔ بیورغ رند نے اپنی شاعری میں سبی کے علاقے میں ان کی موجودگی بتائی ہے۔

دامانی

یہ قبیلہ ایران، چاغی اور کوہِ سلیمان میں آباد ہے۔اس کی ذیلی (بہت بڑی) شاخیں ہیں؛ یاراحمدزئی، اسماعیل زئی اور گمشادزئی۔اب تو یہ خود الگ اور آزاد قبیلوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

درزادغ ، نقیب

ان ناموں سے بلوچوں کے گروہ مکران، لسبیلہ اور اندرونِ سندھ میں آباد ہیں۔ یہ کام کرنے والے محنت کش ہیں اور زراعت اور قبل از زراعت پیشوں سے وابستہ ہیں۔ یہ جفاکش لوگ مختلف قسم کی دستکاریوں کے ماہر ہیں۔ثقافتی سرگرمیاں بھی انہی کی توجہ کا محور ہیں۔ خدا ہماری قوم کو اس قابل بنادے کہ ہم اپنے محنت کش، اور فنکار انسانوں اور گروہوں کی توقیر کریں۔ اِن لوگوں نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلوچ قوم کو کچھ بہترین فرزند عطا کیے ہیں۔ جنہوں نے سیاست، جمہوری جدوجہد، اور موسیقی میں بلوچ کا نام روشن کیا۔

دریشک

رند شاخ کا یہ قبیلہ، دریشک کوہِ سلیمان کے قبیلوں میں سب سے بکھرا ہوا قبیلہ ہے جس کے گاؤں زیادہ تر دریائے سندھ کے کناروں پر واقع ہیں۔ پہاڑ میں ان کا کوئی قابل ذکر ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہ قبیلہ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے تک محدود ہے۔ اکا دکّا گھرانے سندھ میں ہوں گے۔

یہ وہ رند ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ جلال خان کے بیٹے ہوت کی اولاد ہیں۔ اس کی قابلِ ذکر شاخوں میں کرمانڑیں ،منگوانڑیں ،گولپاذ، سرگانڑیں، اریانڑیں، اور جسکانڑیں شامل ہیں۔
دریشک کے لفظی معنی ''مضبوط'' کے ہیں۔(6) ان کا صدر مقام راجن پور کے قریب اسنی ہے۔

دشتی

(دشت سے دشتی) سرحد کے پاکستانی اور ایرانی دونوں اطراف یہ لوگ موجود ہیں۔ مری قبیلے میں ایک ذیلی فرقہ بھی اسی نام سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، اور شاہ صدر دین میں شین کے تینوں نکتے حذف ہو کر ایک بڑا قبیلہ ''دستی'' کا موجود ہے۔

دیہوار

زراعت پیشہ یہ لوگ ریاست قلات کو زرعی آمدن عطا کرنے والے رہے ہیں۔ مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ فارسی اور بلوچی سے مخلوط ایک زبان بولتے ہیں۔ خانہ بدوش نہ ہونے اور ایک جگہ پر آباد ہو کر کاشتکاری کرنے کی وجہ سے اُن میں تعلیم، پیشہ ورانہ ہنرمندی حاصل کرنے کے مواقع زیادہ ملے۔ اس طرح دفتری تعلیمی ثقافتی، صحافتی اور سیاسی میدان میں انہیں صحافتی بہت آسانیاں رہیں۔ خانِ قلات کے درباری امور صدیوں تک دیہوار دربار کے لیے سنبھالتے رہے۔ دربار کے لیے ریونیو، ٹیکس جمع کرنا، رسائل ورسائل، ریکارڈ رکھنا اور دربار کا عمومی نظم ونسق یہی لوگ چلاتے رہے۔ اس کے علاوہ خان کے دستۂ خاص میں بھی دیہوار لوگ موجود رہے۔

قلات اور مستنگ شہر شاہی دارالحکومت ہونے کی بنا پر بلوچ سامراج دشمن قومی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بلوچ سیاست (بالخصوص بیسویں صدی میں) پوری کی پوری انہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔

1920 میں ''انجمنِ اتحادِ بلوچاں'' نے بلوچ سیاست میں پہلی بار فیوڈل اور ماقبل فیوڈل صورت بدل ڈالی۔ اس تحریک نے شہری بورژوازی ،تعلیم یافتہ نوجوان اور مذہبی و قبائلی اشرافیہ سے قوم پرست ذہنوں کو اپنی طرف کھینچا۔

اس سب سے زیادہ مخلوط قبائلی اتحاد یہ میں مندرجہ ذیل طائفے شامل ہیں؛
خواجہ خیل، تیر پچی، شیخ ،سارنگ زئی، زڑخیل، آبی زئی، ہیبت زئی، یوسف زئی، محمود زئی، توران زئی، بڈھا زئی، سنجر زئی، مندو زئی، ہوتی زئی، دادی زئی، قاضی، تاجک، ڈھاڈری زئی، رند، ملازئی۔

ڈومبکی

یہ قبیلہ بنیادی طور پر ایرانی بلوچستان کے ڈومبک دریا کے علاقے سے متعلق ہے۔ مری قبیلہ میں بہت ہی شیریں پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اسے ''ڈومبکہ آف'' کہتے ہیں۔ مگر ہماری احساسِ کمتری کو کیا کہیے کہ ڈومبک دریا اور ڈومب (میراثی) کے تلفظ کی یکسانیت کی وجہ سے آج ڈومبکی کے پڑھے لکھے لوگ اپنے خوبصورت نام سے ''ب'' کو چوری چھپے ہٹا دیتے ہیں۔

یہ لوگ ایران کے علاوہ سندھ میں جیکب آباد، کشمور اور بخشا پور میں بھی رہتے ہیں۔ مگر ان کا اصل علاقہ لہڑی ہے۔ یہ رند قبیلہ مشرقی سلیمانی بلوچی بولتا ہے۔ دیر خانی، گبول، دیناری، میروزئی، بھرمانڑیں، بغداد، بھنڈ، غازیانڑیں، براہمانڑیں، شاہ بی ،گشکوری، کھوسہ، لاشاری، محمدانڑیں، شف کور، سنگیانڑیں، سہریانڑیں، تالانی، گورگیژ، ہاڑا، جمبانڑیں اور وزیرانی اس کے مشہور ذیلی فرقے ہیں۔

بلوچوں اور ان کے قبائل کے بارے میں تاریخی معلومات رکھنا اس قبیلے کی موروثی ذمہ داری رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اُن کے پاس ''دفتر علم الانساب'' موجود ہے جو 1840 میں جنرل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوا تھا۔(7)جکھرانی اسی قبیلے کی ایک شاخ ہے جواب خود ایک بڑا قبیلہ بن چکا ہے۔سندھ اور پٹ فیڈ ران کا علاقہ ہے۔

ڈومبکی قبیلہ بہت قدیم قبیلوں میں شمار ہوتا ہے ۔ اس کا ذکر قدیم بلوچی شاعری میں موجود ہے۔

رخشانڑیں

دریائے رخشان سے منسوب ہیں۔رخشانی دراصل اپنی قبائلی بنیادیں ختم کر چکا ہے اور اپنے ذیلی فرقوں میں اس طرح بٹ گیا ہے کہ ہر فرقہ خود ایک بڑا ،مکمل اور الگ قبیلہ بن چکا ہے۔ خاران ، راس کوہ ،نوکنڈی ، دالبندین ،نوشکی ،مکران ، افغانستان (گرم سیل اور گریش)، ایران یعنی سیستان،خراسان،اور ترکمانستان ان قبائل کے وطن ہیں۔ اس اتحادیے میں سیاہ پاد ،بادینی ،جمالدینی ، ریکی ،نوشیروانی ، ماندائی ،اورنوتی زئی شامل ہیں۔ یہ بہت بڑا قبائلی اتحاد یہ ہے ۔یہ بلوچی کے خوبصورت لہجے'' رخشانی'' میں بولتے ہیں۔ یہ شتر پال بھی ہیں اور کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ بلوچستان میں سیاست اور ادب وصحافت کے میدان میں بادینی اور جمالدینی کا اہم مقام ہے۔نوشکی کے ان دو قبائل نے پورے ضلع ،لہٰذا پوری بلوچ قوم کو متاثر کر دیا۔

رخشانڑیں کا ذیلی شاخ ریکی زاہدان کے جنوب مغرب میں آباد ہے اوران کا آباد علاقہ تفتان کے پہاڑوں کے شمالی دامنوں تک پھیلا ہوا ہے۔ لادیز اِس قبیلے کا مرکز ہے جہاں ریکیوں کا موروثی سربراہ رہتا ہے۔ان کی اکثریت مویشی بانی ،شتر بانی اور قالین بافی سے متعلق ہے۔ یہ لوگ جماز نامی اچھی نسل کے اونٹ پالتے ہیں۔عورتیں عمدہ قالین بنتی ہیں۔ان کا جو حصہ لادیز،گل خار اور مہر آباد کے زرخیز میدانوں میں آباد ہے، وہ کاشت کاری کرتا ہے۔ یہ بتیس قبائلی گروپوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ان کے ذیلی طائفے ہیں؛ بالوزئی ، ہاشم زئی ، بردگوئی۔

رند

رندکو اکثر بلوچ قبیلوں کا سرچشمہ جانا جاتا ہے ۔ بالخصوص مشرقی بلوچستان کے بڑے بڑے قبیلے رند کی مشترکہ جڑ کی شاخوں کی حیثیت سے خود کو پہچانتے ہیں۔ مثلاً بزدار، گشکوری ،عمرانی

جکھرانی ، قیصرانی ، مزاری ، مستوئی ،نوشیروانی ،رخشانی وغیرہ۔اسی طرح مری ،بگٹی ، چانڈیا ، کھیری ، ہوت ، جمالی ، بلیدی ، ڈومبکی ،لُنڈ ،لیغاری اور کھوسہ۔

ڈیرہ غازی خان ،ڈیرہ اسماعیل خان ،مظفرگڑھ ، ملتان ، جھنگ ،شاہ پور اور سیالکوٹ میں جو رندرہتے ہیں اُن کی مرکزیت اب ختم ہو چکی ہے۔ چندن ہار کے یہ ٹوٹے دانے شانِ ماضی کی ہی مشترک میراث رکھتے ہیں۔سبی کے غلام بولکوں کا بھی یہی حال ہے۔

میر چاکر خان اور اس کا پورا عہد رندی عہد کہلاتا ہے۔ تاریخ بلوچستان کا ایک پورا باب اس عہد سے وابستہ ہے۔ رند نے بے شمار بلوچ قبائل کو جنم دے کر بھی اپنا اصل نام آج تک برقرار رکھا ہوا ہے ۔ اور سبی وشوران میں آج بھی رند کے نام سے ایک قبیلہ موجود ہے ۔جس کی ذیلی شاخیں یوں ہیں؛ چاکرانڑیں ، چانڈیہ، چلگری ، چولانڑیں ،ازدی ، بادینی ، بجارزئی ، بزدار ، دنیاری، فیروزئی ، گبول ، گدائی ، گدری ، غلام بولک ، ہڈدار ، ہوتانزئی۔

دہلی کے آس پاس رند ملیں گے،ایرانی بلوچستان ، پنجاب ،اور سندھ میں یہ قبیلہ اپنے نام سے وجود رکھتا ہے۔

مگر یہ بلوچ قوم کی ابتدا ہرگز نہیں ہیں۔ بلوچ اِن سے بہت بہت قدیم قوم ہے۔

رودینی

اس قبیلے کا صدر مقام تو سوراب میں ہے مگر یہ کردگاپ میں بھی رہتے ہیں۔ چھوٹا قبیلہ ہے لہٰذا اثر واختیار کے لحاظ سے بہت کم حیثیت رکھتا ہے۔عمومی طور پر براہوی بولتے ہیں۔مگر شہروں کے قریب ہونے کی وجہ سے باہمی میل ملاپ کے سبب بہت سے لوگ بلوچی بھی بولتے ہیں۔

رئیس

کیچ ، پنجگور ، اور باہو میں آباد زراعت سے وابستہ قبیلہ ہے۔اور حاکم گروہوں میں شمار ہوتا ہے۔حالانکہ تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔

رئیسانڑیں

بلوچوں کا تعداد کے لحاظ سے چھوٹا مگر رتبے کے لحاظ سے بڑا قبیلہ ہے جس کا اصل پیشہ

آباد کاشتکاری ہے۔ اگر رئیس اور رئیسانی ایک ہی قبیلہ ہے تو اس قبیلے کا اصلی اور بڑا حصہ (رئیس) مکران میں آباد ہے۔ یہ قبیلہ قلات کی خانی کے عہد میں سراوان کے پورے علاقے کا ایک لحاظ سے انچارج ہوا کرتا تھا۔ ''سرِ سردارانِ سراوان'' ایک بہت بڑا منصب ہوتا تھا جو اِن کے سرداروں کو حاصل تھا۔ کانک، مستنگ، کچھی اور کوئٹہ ان کے علاقے ہیں۔ زیادہ تر زراعت سے وابستہ یہ قبیلہ بہت بکھرا ہوا ہے اور ہر ذیلی فرقہ بذاتِ خود ایک الگ اور مکمل قبیلہ لگتا ہے۔ اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ روشان زئی، جمال زئی، سیاہی زئی، راوٴسین زئی، رستم زئی، سراج زئی۔ کانک صدر مقام ہے۔

زرکانڑیں یا بگٹی

ایران دریائے بگ کی وادی کے تعلق سے اس کا نام بگٹی پڑ گیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اس قبیلے کا ایک اور نام ''زرکانڑیں'' بھی ہے۔ یعنی؛ زر کی معدنی کان۔ یہ بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ زر اور بگٹی!!! ان کا تو آپس میں دور دور کا واسطہ نہ رہا۔

اُدھر مری قبیلے کا ایک اور پڑوسی قبیلہ ''زرکانڑ'' ہے۔ جو بلوچی جیسی پشتو بولتے ہیں صرف آخری حرف ''ی'' نے دو قبیلوں کی نسل، زبان اور ثقافت میں فرق کر ڈالا۔ کتنا دلچسپ ہے انسان اور کتنی دلچسپ ہیں اس کی حکایتیں۔ زرکانڑ موسیٰ خیل قبیلے کی ایک شاخ بتائے جاتے ہیں۔

بلوچی کلاسیکل شاعری میں اُن کا کوئی ذکر اذکار نہیں ہے۔ یہ ابھی ماضی قریب میں تشکیل پانے اور منظّم قبیلے کی صورت اختیار کرنے والا مضبوط قبیلہ ہے۔ مشرقی بلوچستان میں گو کہ پڑ رندوں کی اکثریت مری کے علاقے کے پہاڑوں میں بس گئی اور بالآخر مری بن گئی۔ مگر میر چاکر کا چچا زاد جیاندارا اپنے عزیزوں اور حامیوں کے ساتھ جنوبی گرم تر علاقے میں آ گیا جو بگٹی کا علاقہ بنا۔ اس قبیلے کی بڑی شاخ جیاندار کے بیٹے راہیجہ کے نام سے منسوب ہے۔ مگر جناب عزیز بگٹی راہیجہ کو بجار کا بیٹا اور میر عالی کا پوتا لکھتا ہے۔ اُس کے خیال میں بگٹی میر عالی کی آل اولاد ہیں۔ (8) جس کا ایک ذیلی فرقہ ''بیورغ زئی'' ہے جو کہ بگٹی کا حکمران گھرانہ ہے۔ بگٹی قبیلے کی شاخوں کے نام میر چاکر کے عزیزوں کے ناموں سے منسوب ہیں؛ پیروزانڑیں (پیروز)، کلپر (کلپر)، راہیجہ (راہیجہ)،

موندرانڑیں (موندر) وغیرہ وغیرہ۔ دیگر اہم قبیلوں میں نوثانی، مسوری، پھونگ، شمبانڑیں، سلاماں زئی، سوبھا زئی، سندرانی، پاہی، نوہکانڑیں شامل ہیں۔

بگٹی ابتدائی دور میں ایک چھوٹا قبیلہ تھا۔ اس کے موجودہ علاقے میں بلیدی آباد تھے، جن کو انہوں نے نکال دیا۔ بگٹی کی تاریخ تقریباً مری اور دیگر سلیمانی قبائل کی تاریخ جیسی ہے۔

بگٹی قبیلہ عمدہ گھڑ سوار اور لڑاکا رہا ہے۔ 1845 میں چارلس نیپئر نے اس قبیلے پر حملہ کیا تھا مگر اسے کوئی کنٹرول نہیں کر سکا۔ بس سنڈیمن اپنی سنڈیمنی کی وجہ سے کچھ عرصہ تک اس قبیلے کو چلاتا رہا۔

بیورغ کو حکمران گھرانے کا جدا مجد تصور کیا گیا ہے۔ (بگٹی کے بیورغ نامی تین سردار ہوئے)۔ سکھوں سے لڑ کر انہیں شکست دینے کے علاوہ اس قبیلے نے انگریزوں کے خلاف بھی زبردست جنگیں لڑیں۔ (واضح رہے کہ سکھوں نے مشرقی قبائل پہ زبردست حملے کیے۔ بگٹی نے انہیں شکست دے دی اور ان کے طبلِ جنگ (ڈھل) بھی قبضے میں لے لیا (جواب سوہری کے دربار میں رکھا ہوا ہے)۔ بیورغ، سلام ہان، غلام مرتضٰے، گہنور خان، شہباز خان، محراب خان، اکبر خان اس قبیلے کے بالترتیب سردار ہوئے۔ جو آں سال، بگٹی کا بہت بڑا مفکر اور شاعر ہو گزرا ہے، جبکہ پیر سوہری روحانی پیشوا ہے۔

باپ کے خلاف ''محراب گردی'' نامی پمفلٹ لکھنے والا، اور نامی گرامی سامراج دشمن جمہوری راہنما میر عبدالرحمٰن بگٹی اسی مردم خیز خطے سے تھا۔ پاکستان کو بیش بہا دولت بخشنے والی قدرتی گیس اسی قبیلے کی ملکیت ہے۔ بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی بگٹیوں کے کئی گاؤں موجود ہیں۔ دیگر قبائل کی بہ نسبت، ہندو بڑی دیر تک اس قبیلے کے ساتھ رہے۔ مشرف حملے میں شہید ہونے والے بگٹیوں میں ہندو بگٹی بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔

ڈیرہ بگٹی (دراصل ڈیرہ بیورغ بگٹی) بگٹیوں کے سردار کی جائے رہائش ہے جہاں 1983 میں بجلی آئی۔ حال کی صدی میں بگٹی کا مشہور سردار، نواب اکبر خان رہا جو ایچی سن کالج سے جونیر کیمبرج کرنے کے بعد 1950 کی دہائی میں سکندر مرزا کی حکومت میں وزیر بن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔اور نشیب وفراز بھری اپنی متنازعہ زندگی کے آخری حصے میں پاکستانی افواج سے لڑتے ہوئے شہید، اور سب کا محترم ہو گیا۔

زھری

یومِ شہدائے بلوچستان اسی قبیلے کے بھاری اور عزت دار نام سے منسوب ہے جہاں نواب نورورخان زرکزئی نے اپنے خانوادے کے ساتھ بلوچ قومی حقوق کے لیے ایسی قربانیاں دیں کہ اکثر نے سکھر جیل میں پھانسی پائی اور بلوچوں کے ہیڈکوارٹر قلات کے شاہی قبرستان میں اِن شہیدوں کا مزار بنا۔

خضدار اِن کا مرکز ہے۔مگر یہ بہت وسیع علاقوں میں پھیلا ہوا قبیلہ ہے۔سندھ میں بھی زہری رہتے ہیں۔قلات کی خانی کے زمانے میں جھلاوان کے سیاہ وسفید کا مالک قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ قلات ریاست میں سرِ سرداراِن جھلاوان انہی کے سرداروں کا مقام ولقب تھا۔سرداری اصل میں موسیانڑیں کے پاس تھی اور ہے،مگر شہرت وتوقیر رفتہ رفتہ زرک زئی کو منتقل ہوئی ۔اب زرک زئی اس قبیلے کو سردار مہیا کرتا رہتا ہے۔

زہری کا نام اپنی جائے سکونت کی وجہ سے زہری پڑا۔اسی طرح اس کے ذیلی فرقے نیچاری، پندرانی اور ساسولی بھی اُن کی رہائش کے علاقوں کی وجہ سے ان ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔

زہری کے ذیلی فرقے یوں ہیں؛ موسیانڑیں، نیچاری، زرکزئی،
پندرانڑیں، جتک، ڈاہیہ، رئیس، سیدزئی، ساسولی، خدرانڑیں، باجوئی، محمودانڑیں، لوٹھانڑیں، تراہسانی، ستاڑی۔

ساتک زئی

بہت چھوٹا اور بہت بکھرا قبیلہ ہے۔جو مچھ میں آباد ہے۔کوئلہ کی کان کنی تو بس نام کی ہوتی ہے،مویشی بانی ہی اصل پیشہ ہے۔

ساجدی

یہ ایک بہت ہی قدیم قبیلہ ہے۔مرکزی طور پر گریشہ میں آباد ہیں۔مگر وسطی بلوچستان کی

اور جگہوں پر بھی موجود ہیں۔یہ ایک کوہستانی قبیلہ ہے،مویشی بانی میں مصروف سچے، سُچے لوگ۔

سرپّرہ

یہ قدیم بلوچ قبیلہ پرّ کانڑیں کے ساتھ پرانی تاریخوں میں مذکور ہے۔کردگاپ ہیڈ کوارٹر ہے۔مگر باجرہ کے بیج کی طرح بہت جگہوں میں بکھرا قبیلہ ہے۔لہٰذا کوئی اجتماعی اثر ونفوذ بلوچستان میں نہیں رکھتا۔خشک آبے کی زراعت اور مویشی بانی سے وابستہ رہے ہیں۔

سمالانڑیں

تعداد میں نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے۔وہی عام بلوچوں کی طرح مویشی بانی کرتے ہیں۔کوئلہ مائننگ یا کھیتی باڑی بہت معمولی ہے۔کوئٹہ اور مچ کے بیچ کے پہاڑوں میں مہاجرتیں کرتے رہتے ہیں۔جہاں بارش لے جائے، جہاں گھاس پھونس لے جائے، جہاں بھیڑ بکریاں لے جائیں۔

سنجرانڑیں

چاغی کے خانہ بدوش لوگ تھے جو اب آباد کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ایرانی بلوچستان تک پھیلا ہوا یہ قبیلہ میٹھی رخشانی بلوچی بولتا ہے۔کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان اور جنوبی پنجاب میں اسی نام کے ساتھ شناخت رکھے ہوئے ملتے ہیں۔اسی طرح اس قبیلے کے لوگ ترکمانستان میں بھی آباد ہیں۔میر گل خان نصیر کہیری کو سنجرانڑیں کی شاخ قرار دیتا ہے۔شیہہ مرید کے علاوہ ابھی ماضی قریب کے شیہہ حسن (بلانوش) شیہہ حسین (نورانی) اور دیگر کئی اولیا اسی قبیلے سے ہوئے۔

سنگور

لسبیلہ میں ایک قبیلہ ہے۔نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے۔مویشی بانی ، اور کہیں کہیں خشکابہ کی زراعت کرتے ہیں۔

شاھوانڑیں

یہ رند بلوچ ہیں ۔ بنیادی طور پر یہ ساراوان کا قبیلہ ہے۔خانِ قلات کا بیرک (پرچم) بردار ہے۔ساروان میں خان قلات کے دربار میں رئیسانڑیں کے بعد دوسرا بڑا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درجہ شاہوانڑیں کا ہے۔نصیر خان اول کے دور کا محمد خان شہوانڑیں اُس سے ''یارِ وفادار'' کا لقب پا گیا تھا۔مستنگ ، قلات اور کوئٹہ انہی کی قدیم آبادیاں ہیں ۔جنگوں، قحط سالیوں اور نقل مکانیوں نے البتہ انہیں کہاں کہاں نہیں پہنچایا۔مری میں ایک قبیلہ شیہوانڑیں موجود ہے ۔ بزدار میں بھی شاہوانڑیں ایک الگ طائفہ تشکیل کرتے ہیں۔ پنجاب میں بہت سے علاقوں میں شاہوانڑیں آباد ہیں۔اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ حاجی زئی، راوت زئی، شاذیہاں زئی، چناروزئی، میروزئی، شیرزئی، خواجوزئی، شاہوزئی، کلوزئی، حسنی، سوری زئی، ہومرانی۔

شیر خان زئی

انیسویں صدی کے شروع میں بمپور پہ قابض ہوئے مگر بعد میں انہیں ایرانیوں نے وہاں سے بھگا دیا اور وہ گہیہ، فانوج اور بنٹ میں آباد ہوئے۔

عمرانڑیں

یہ سندھ و بلوچستان میں بکھرا ہوا قبیلہ ہے ۔سبی ، قلات ، پٹ فیڈر اور اس کے ملحقہ سندھ کے علاقوں میں رہنے والے اس قبیلے کے نام پہ مزاری، گورشانی، اور لیغاری میں ذیلی طائفے بھی موجود ہیں۔ یہ قبیلہ نہری زراعت میں بلوچ کا سب سے بڑا فیوڈل طبقہ تشکیل دیتا ہے۔

غلام بولک

سیوی اور اس کے ملحقہ علاقوں میں آباد ہیں۔تعداد میں بہت چھوٹا قبیلہ ہے ۔رند عہد کے لوگ ہیں۔

کلاچی

(کلانچ سے کلانچی)۔مکران میں کولانچ نامی علاقے سے انہوں نے یہ نام لیا ہے۔یہ لوگ ڈیرہ اسماعیل خان میں رہتے ہیں۔اور کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، گھوٹکی، لاڑکانہ اور کراچی میں بادلوں کی تنہا ٹکڑیوں کی صورت میں آباد ہیں۔کراچی کا اپنا نام انہی سے منسوب ہے۔

کلمتی

یہ لوگ چاہ بہار، دشت ، جیوانی ، باہو، گوادر، پسنی ، حب ، لیاری، ملیاری، ٹنڈو آدم اور حیدرآباد میں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''چوکنڈی'' اور حب کے مشہور قبرستان اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔اسی طرح مشرقی بلوچستان میں ماوند کے مقام ''باغار سر'' میں اُن کے کھنڈرات کی موجودگی اور کلاسیکل شاعری میں اس کی تصدیق کی گئی ہے ۔ڈیمز کلمتی اور مری کے مابین جنگ کا تذکرہ کرتا ہے۔مگر ہماری روایتوں اور شاعری میں ایسی کسی جنگ کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔جبکہ ہماری شاعری اور روایتوں میں موجود مری علاقے میں کلمتی اور بلقی کی لڑائی موجود ہے جس کا کہ انگریز محققین نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ہوتمان کلمتی مشہور شاعر گزرا ہے جس نے بقول مولائی شیدائی، حمل کلمتی اور پرتگیز یوں کے بیچ مشہور جنگ کو بیان کیا ہے۔

کلوئی

اِدھر اُدھر بکھرا بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔اس کے لیے اپنی قبائلی الگ شناخت رکھنا محال ہوتا جا رہا ہے۔

کمبرانڑیں

یہ قبیلہ بلوچستان کے خوانین قلات کی تشکیل بھی کرتا ہے۔بلوچستان بھر میں جا بجا بکھرا ہوا یہ قبیلہ بلوچی، براہوئی، فارسی اور سندھی زبانیں مادری قومی زبانوں کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

کوسخ یا کھوسہ

شکار پور کے سندھ اور سکھر کے درمیان کے علاقے سے لے کر تھرپارکر اور روجھان کے مشرقی علاقے تک آباد ہیں۔کوہِ سلیمان میں ڈی جی سیمنٹ فیکٹری سے لے کر مبارکی اور بغلچر تک کا علاقہ کھوسوں کا ہے۔اس کے علاوہ کھوسہ سندھ میں بھی رہتے ہیں ۔یہ وسیع اراضی انہیں ہمایوں نے فوجی خدمات کے صلہ میں دی تھی۔جیکب آباد کے علاوہ بلوچستان کے پٹ فیڈر میں بہت بڑی نہری زمینوں کے مالک بھی کھوسہ فیوڈل ہیں ۔سبی میں بھی کھوسوں کے دو چار گاؤں ہیں ۔سندھ میں تھر اور پارکر میں بھی رہتے ہیں۔سندھ کی زمینیں انہیں ہمایوں نے عطا کی تھیں ۔یہ لوگ ایرانی بلوچستان اور مکران میں بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھوسہ در اصل کیچ کے باسی رند قبیلے سے وابستہ لڑاکا قبیلہ ہے ۔اس قبیلے کو اہلِ یونان،عرب اور چینیوں نے اپنے تذکروں میں یاد کیا ہے ۔بازنطینی انہیں ''کورز'' کہتے ہیں ۔وہ خود کہتے ہیں کہ ان کا نام ان کی گرم اور لڑاکا طبیعت کی بدولت کھوسہ ہے ۔ چونکہ یہ قبیلہ انگریز کے خلاف چھاپہ مار جنگوں میں مصروف رہا اس لیے انگریز کی تحریروں میں کھوسہ ہمیشہ چور اور ڈاکو رہا ہے ۔والکر کی سندھی ڈکشنری میں کھوسغ کا معنی رہزن یا ڈاکو لکھا ہوا ہے ۔1859 میں میجر پولاک نے لکھا: ''کوئی ایسا کھوسہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے جو مویشی چوری کے جرم میں جیل نہ کاٹ چکا ہو یا اس کا مستحق نہ ہو......'' (9)۔ایک اور بیان یہ ہے کہ کھوسغ : کوہ ءِ سگ یعنی پہاڑ کا کتا (رکھوالا) ہے۔ ایک اور حکایت میں کھوسو کو لفظ کوہسار سے بتایا گیا ہے۔ایک آدھ جگہ تو کھوسو کو کاشغر نامی شہر کے باشندے بتا کر کاشغر سے ہوتے ہوتے کھوسو بنا دیا گیا...........

مجھے ایک معقول بلوچ محقق، میر الفت نسیم کی تحقیق سچ کے بہت قریب نظر آئی۔اس نے ایک خط میں مجھے لکھا؛

''یہ قبیلہ موجودہ ایرانی بلوچستان سے کیچ میں داخل ہوا تھا۔''کوسغ'' بلوچی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی داڑھی ابھی ابھی نکلی ہو، یا محض ٹھوڑی پر معمولی داڑھی ہو اور باقی چہرہ صاف ہو۔ کہتے ہیں کہ کھوسغ کے جد امجد کا نام ''دلیر'' (Daleer) ہوتا تھا۔جس کے معنی ''عقل و فہم'' کے ہیں۔اُس کا چہرہ کم داڑھی رکھتا تھا۔اسی نسبت سے اس کا اور بعد میں اس کی آل اولاد اور قبیلے کا نام کوسغ پڑا''۔

انگریز کے خلاف جنگ آزادی میں کھوسہ کا تذکرہ نہ کرنا بہت بڑی کنجوسی ہوگی۔جیکب آباد کا دلمراد خان کھوسہ، دریا خان جکھرانی سے مل کر گوریلا کاروائیاں کرتا رہا۔دونوں نے جیکب آباد کی ایک کھلی کچہری میں جان جیکب کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جاسوسی ہوئی اور دونوں گرفتار ہوئے۔ دلمراد کو کالا پانی کی سزا ہوئی۔اور اس جلاوطن کی لاش تک نہ ملی۔کھوسہ کی ذیلی شاخوں میں جنگیل، بلیل، جندانڑیں، جروار، مہروانڑیں، عمرانی، جملانی، بابلانڑیں اور عیشانڑیں شامل ہیں۔

بلوچوں میں موسیقی کا بہت بڑا استاد خان صاحب ارباب خان، کھوسو قبیلہ سے تھا۔

بلوچوں کا ایک محسن اور سامراج دشمن راہنما سردار محمد امین کھوسہ، جناب یوسف عزیز مگسی سے لے کر میر غوث بخش بزنجو کے عہد تک بلوچ بہبود کے لیے سرگرم رہا۔

کوراکائی

ماضی کا یہ مشہور قبیلہ اب سلامت نہ رہا۔اور اب یہ مرکز گم کردہ مظفر گڑھ، ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں بکھرے ہوئے انداز میں ملتے ہیں۔

کوردیاکیرد

بولان، مرو، گوئنڈیں دشت اور کوئٹہ کے علاوہ بہت سارے علاقوں میں آباد ہیں۔ بلوچستان کی سیاست میں پچھلی صدی کی تیس کی دہائی سے لے کر آج تک اس قبیلے کے سرکردہ لوگ شامل رہے ہیں۔میر عبدالعزیز کرد کا نام لیے بغیر آپ کو جدید بلوچ سیاست بالکل ادھوری لگے گی۔ یہ بلوچی کے علاوہ بلوچوں کی دوسری اہم قومی زبان، براہوئی بولتے ہیں۔دشت گوئنڈین ان کا صدر مقام ہے۔خانہ بدوش مویشی بانی کے علاوہ زراعت سے وابستہ ہیں ۔ کچھ لوگ کوئلہ کی مائننگ بھی کرتے ہیں۔

کھیترانڑ

یہ قبیلہ ایک طرف تو لیغاریوں اور بزدار سے سرحد بناتا ہے،تو دوسری طرف مری اور بگٹی سے ملتا ہے ۔اُدھر کوہِ سلیمان کے مشرقی دامن میں کھیترانڑ وھووا میں رہتے ہیں جہاں ان کی زمینداری ہے۔اکبر بادشاہ نے ان کے بڑے حصے کو وہاں سے بے دخل کیا۔تب انہوں نے لیغاری پہاڑوں کے علاقہ بارکھان میں پناہ لی۔

کھیترانڑ کھیتی باڑی اور مویشی بانی کرتے ہیں۔ان کی اولین زبان کھیترانڑیں ہے۔ اور دوسری زبان بلوچی ہے۔اصطلاحات، استعارات اور کلچر سب کچھ اپنے پڑوسی قبائل جیسا ہے۔ پڑوسی قبائل کے ساتھ تلخ وشیریں تعلقات بھی اس قبیلے کا خاصہ رہے ہیں۔

میر مصری خان کھیترانڑ انگریز کے خلاف بہت بے جگری سے مزاحمت دیتا رہا۔وہ اپنے ترقی پسند نظریات کی وجہ سے بلوچ سامراج دشمن تحریک کے نمایاں راہنماؤں میں شامل تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھیتر انڑ چھ ذیلی بڑے قبیلوں میں تقسیم ہوتا ہے؛ دھڑے وال، گرینی، ایسانڑیں، لوہارانی، پھلیات اور سیلاچی ۔مزارانڑیں ان کے لیے سردار مہیا کرتے ہیں ۔ یہ قبیلہ بہت ہی متفرق نسل کے طائفوں کے آن ملنے سے بنا۔حسنی گوکہ ابھی تک خود کو کھیتر انڑوں سے الگ بتاتے ہیں مگر اُن کے انضمام وادغام کا پراسیس جاری ہے۔حسنی دراصل 19 ویں صدی کے قریب سارے وسطی اور شمال مشرقی بلوچستان میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں پھیل گئے ۔(10) آج یہ گروپ نہ آپس میں رابطے میں ہیں نہ ہی ان کے خاندانی یا تنظیمی تعلق رشتے ہیں ۔ یہ ایک زمانے میں بڑا طاقتور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔حسنیوں کو مری اور خان سے 1780 میں دھولا ونگا کے مقام پر شکست ہوئی۔(11) ان کا سردار صادق اور اس کا خاندان مارا گیا اور قبیلہ مکمل تاراج ہو گیا۔اس کے چھوٹے ٹکڑے کچ ،تل چوٹیالی (پنی کوٹ)، سبی (گلو شہر) اور کھیتر انڑ قبیلے (حسنی کوٹ) میں بکھر گئے ۔(12)

کھیری

کھیر نامی درخت سے منسوب یہ اچھا خاصا قدیم قبیلہ ہے۔کچھ کچھ کرامتیں اس سے جوڑ دی جاتی ہیں۔ پٹ فیڈر اور سندھ میں بکھرا یہ قبیلہ اب بڑا قبیلہ تصور نہیں ہوتا۔اس کی اہمیت بلوچی قدیم شاعری کی بدولت ہی ہے۔

کیاّزئی

یہ بکھرا قبیلہ ایرانی اور پاکستانی بلوچستان میں واشک کے علاوہ سندھ میں بھی بکھرے انداز میں آباد ہے۔کہیں الگ وآزاد انداز میں،اور کہیں ماما حسنی کی ذیلی شاخ کے بطور۔

کیسرانڑیں

یہ ’’ق‘‘ میں نے بلوچ دانشوروں کے ڈر سے استعمال کیا ہے۔ورنہ نہ تو کمبرانڑیں ’’قمبرانڑیں‘‘ ہے اور نہ کیسرانڑیں ’’قیصرانڑیں‘‘ ہے۔ بلوچی میں ’’ق‘‘ اور ’’ص‘‘ موجود ہی نہیں ہیں۔

کوہِ سلیمان کا یہ قبیلہ شمال میں لزدان گاؤں سے لے کر مشرق میں بروٹ مندوانی اور

جنوب میں درگ نالہ کے ساتھ ساتھ لورالائی اور موسیٰ خیل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحدوں کے آس پاس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔اس طرح اس قبیلے کی سرحدیں بلوچستان،سرحد اور پنجاب کے تینوں صوبوں سے ملتی ہیں۔

یہ قبیلہ بھی پندرھویں سولھویں صدی تک وجود نہیں رکھتا تھا۔ بعد کے اس رند قبیلے کی سات شاخیں ہیں؛ لشکرانڑیں ،خوب دین ،بودانی ،وسوانڑیں ،لیغاری ،جرواراور،رسانڑیں۔ 1853ء میں شیرانی مہمات سے فارغ ہو کر انگریز نے کیسرانڑیوں کا علاقہ تاراج کیا تھا۔سردار کوڑا خان کیسرانڑیں انگیزوں کے لیے سر کا درد رہا۔

گبول

کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ رند و لاشار جنگ (1456 تا1486) میں چاکر کی طرف سے خوب لڑا۔ (وہ سب قبائل جو چاکر کی طرف سے لڑے، رند کہلاتے ہیں)۔چاکر خان کے ساتھ بلوچستان چھوڑ کر پنجاب گیا تھا۔گبول منٹگمری میں سکھوں کے ساتھ لڑائی کے نتیجے میں پنجاب بھر میں بکھر گئے۔علاوہ ازیں یہ سندھ تک پھیل گئے اور کراچی تک آ گئے۔

بلوچستان،(جھٹ پٹ اور لہڑی) سندھ (بالخصوص کراچی کے لیاری) اور ڈیرہ غازی خان میں پایا جانے والا بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔مسٹر لیچ نے 1835 سے 1837 کی اپنی رپورٹ میں بلوچستان اور سندھ کی سرحد پر واقع پہاڑوں میں رہائش پذیر بلوچوں کا ذکر کیا۔اسی رپورٹ میں وہ گبول قبیلے کا ذکر یوں کرتا ہے؛ ’’گبول اپنے رہائشی علاقوں کی نسبت سے سرائیکی،سندھی اور بلوچی (سلیمانی) بولتے ہیں۔اسی پہاڑ میں گبولوں کا ایک سٹیشن ہے جس کا نام ’کچروخ‘ ہے۔‘‘

گچکی

یہ قبیلہ مکران کے علاقہ گچک سے منسوب ہے۔عجیب وغریب تصورات جنم دینے والا یہ قبیلہ بلیدیوں سے حکمرانی پر لڑ لڑ کر طویل عرصے تک مکران کا حاکم بھی رہا۔پنجگور میں واقع وادی گچک نے اس قبیلے کو اپنا نام عطا کر دیا۔یہی کچھ اس قبیلے کے اصل بلوچ ہونے کے لیے کافی شافی ہے۔گچکی قبیلے کے بڑوں نے جام لسبیلہ،خان قلات اور مینگل سرداروں میں رشتے کیے۔دینارزئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(مشہور ملک دینار گچکی کے نام سے منسوب) اور عیسیٰ زئی اس کے دو طائفے ہیں۔عیسیٰ زئی پنجگور اور دینار زئی تربت میں رہتے ہیں۔تیسرا حصہ قاسم زئی ہے۔ یہ قبیلہ اپنی بہادری میں اپنی مثال آپ رہا ہے۔سرحدی علاقے کے حاکم کے بطور انہیں نادر شاہ سے لے کر انگریزوں تک لڑنا پڑا۔

قلم کی جنگ میں نعمت گچکی ،اور امان گچکی اور منیر گچکی ہمارے دور کے سکالر ہیں۔

گشکوری

(گیش کور سے گشکوری)۔مکران میں گِش کور (دریا) سے ان کا نام منسوب ہوا۔ یہ لوگ بیورغ رند کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔

یہ قبیلہ ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، کوٹ ادو، مظفر گڑھ کے علاوہ ملتان میں بھی بکھرا ہوا ہے۔(13) سبی، اور مکران میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بلوچی کا تقریباً ہر لہجہ بولتے ہیں۔اس کے علاوہ سندھی اور سرائیکی بھی مادری زبانوں کے بطور بولتے ہیں۔

گمشاد زئی

گمشادزئی کے قبائلی فرقے یہ ہیں؛ دود خودزئی، مزار زئی ،محمد زئی ،درگشت، کریم زئی، جہانگیر زئی، مراد زئی ، گیدوزئی ، خاکی زئی، تلخ کوہی۔ان کی بڑی تعداد کاشت کاری کرتی ہے۔ یہ سارے ایرانی سرحدی علاقہ میں سکونت رکھتے ہیں۔

گوپانگ

مظفر گڑھ، ملتان، ڈیرہ غازی خان اور ٹھٹھہ میں پایا جانے والا یہ قبیلہ بہت بکھرا قبیلہ ہے۔ کچھ لوگ کچھی میں بھی آباد ہیں۔اسی طرح سندھ میں گوپانگ آباد ہیں۔

گورشانڑیں

گورشانڑیں کوہِ سلیمان کے ماڑی اور دراگل نامی پہاڑوں کے مالک ہیں۔اس کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بکھرے بکھرے انداز میں اس قبیلے کی ٹکڑیاں آباد ہیں۔ان کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے کہ گوریش حیدر آباد کے راجہ ھیم سین کا پوتا تھا جسے بلوچوں نے پالا تھا۔ دوسری، اور زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ یہ قبیلہ میر دودا خان لاشار کے بیٹے گوریش خان کی

اولاد ہے۔اس قبیلے کی گیارہ ذیلی شاخیں ہیں ،جن میں اہم یہ ہیں؛ درکانڑیں ،شیھکانڑیں، شاخلانڑیں، ہوتوانڑیں، قاسمانڑیں، جوگیانڑیں، چانگ ، دُرکانڑیں، گبول ،لاشاری ، پیتافی، جسکانڑیں اور سبزانڑیں ۔مٹھلوانی ،میلوہڑ ،صغروانی، زومیرانی بھی اس قبیلے کی شاخیں ہیں۔تاریخ میں گورشانڑیں اور سکھوں کی کبھی مفاہمت نہ ہوسکی۔اس قبیلے کی مار دھاڑ کو روکنے کے لیے رنجیت سنگھ نے ہڑند کہنہ کے کھنڈرات سے اینٹیں نکلوا کر قلعہ تعمیر کروایا۔

گورشانڑیں قبیلہ کے درمیان میں ایک چھوٹا قبیلہ لــونـڈ کے نام سے آباد ہے۔لونڈ سندھ میں بھی آباد ہیں۔

یہ قبیلہ بہت بعد میں تشکیل پایا۔ ڈیرہ غازی خان میں ہڑند کے قریب لعل گڑھ ان کا دارالخلافہ ہے۔ان میں موجود سیاہ پاذ رند ہیں۔ دوسرے طائفے بھی مختلف درختوں کی شاخیں ہیں جنہوں نے وہاں سے طلاق لی اور اس نئے اتحادیے میں شامل ہوئے۔

گورمانڑیں

ہم بلوچوں سے یہ نام گم ہو چکا ہے۔مگر کوٹ ادو، ملتان اور لیہ کے یہ لوگ خود کو بلوچ کی وسیع تھالی میں شریک گردانتے ہیں۔ان کے نام سے مظفر گڑھ کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔آج کل ان کے پڑھے لکھے لوگ خود کو گُرمانی بولتے ہیں۔

گورگیژ

یہ قبیلہ اصل میں زاہدان کے علاقے میں آباد ہے۔ان کا سردار بھی وہیں رہتا ہے۔اس کے علاوہ یہ قبیلہ چاغی، سبی، سندھ اور پنجاب میں بھی آباد ہے۔اور مویشی بانی کے علاوہ زراعت سے وابستہ ہے۔ بلوچ تاریخ میں گورگیژ قطعاً فراموش کرنے والے لوگ نہیں رہے۔ایک زمانے میں یہ موجودہ مری بگٹی علاقے کا بہت زور آور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ بالخصوص بالاچ کا نام بلوچ روایتوں، شاعری، ضرب الامثال اور روزمرہ کا حوالہ ہے۔ بالاچ کی قبر بگٹی علاقے کے مقام سنگسیلا میں نمایاں طور پر موجود ہے۔

موجودہ مری بگٹی علاقے میں گورگیژوں اور بلیذیوں کے بیچ خونریز لڑائیاں ہوئیں۔

مولائی شیدائی کہتے ہیں کہ مری اور کھیتر انوں نے گورگیژوں کا ساتھ دیا۔(14) مشرقی بلوچستان سے بلیدیوں کے اخراج کی وجہ بھی یہی جنگیں ہیں۔

یہ لوگ سبی میں اب بھی ہیں مگر بہت کم تعداد میں۔

گولہ

یہ بلوچ قبیلہ بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں بکھرے ہوئے انداز میں موجود ہے۔ گولہ جعفر آباد، نصیر آباد، سبی، قمبر، جیکب آباد اور لاڑکانہ میں آباد ہیں۔ صحبت خان گولہ نے بہت سے علاقوں میں سرائے تعمیر کرائے۔ اس پہ بڑی تحقیق کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سرائے جیکب آباد، نصیر آباد، جعفر آباد اور سبی میں بنوائے گئے۔ اِن مسافر خانوں میں رات بسر کرنے والوں کو کھانا اور رہائش مفت فراہم ہوتا تھا۔

زیادہ تر بلوچی زبان بولتے ہیں مگر بہت سے بلوچوں کی طرح گولہ لوگ بھی سندھی اور سرائیکی کو بطور مادری زبان استعمال کرتے ہیں۔

لاشاری

(ایرانی بلوچستان کے علاقہ لاشار سے لاشاری)۔ لاشاری اور رند، دراصل دو ایسے سرچشمے ہیں جن سے سارے بلوچ قبائل خود کو منسوب کرتے ہیں۔ یہ غلط مفروضہ ہے۔ یہ بات بھی کہ بلوچستان کی طرف مہاجرت کرتے ہوئے گوئہرام، لاشاری کی سربراہی کرتا ہوا، اور چاکر رندوں کی سربراہی کرتا ہوا خانہ جنگی لڑتے رہے، درست نہیں ہے۔ بلوچ، رند و لاشار کی بلوچستان میں آمد سے قبل کی بہت قدیم قوم ہے۔ اسی طرح بے شمار قبائل اور ان کے ذیلی طائفے بہت بعد میں تشکیل پائے۔ یہ دونوں سرچشمے ہم بلوچوں کے آباؤ اجداد ہیں۔ اور بے شمار قبائل اپنی شناخت رند یا لاشار کے انہی سرچشموں سے کرتے ہیں۔ مگر یہ خود اپنے نام سے بھی دو چھوٹے قبیلے اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے لاشاری دریائے لاشاری کے تاس اور سرباز کی وادی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ بمپور کے جنوبی میدانوں میں رہتے ہیں اور کاشتکاری کرتے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں لاشاری ملتان، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور مظفر گڑھ میں رہتے ہیں۔ اس

کے علاوہ گوگیرہ اور پاکپتن (منٹگمری) میں بیشتر بلوچ لاشاری ہیں۔(15) سندھ بالخصوص حیدر آباد، بدین، ٹنڈو الہیار، ٹنڈو محمد خان، مٹیاری، نواب شاہ، دادو کشمور، لاڑکانہ اور جیکب آیاد میں بھی بے شمار لاشاری موجود ہیں۔ کچھ لاشاری پٹ فیڈر کے علاقے میں بھی آباد ہیں۔ گاجان ہیڈ کوارٹر ہے۔ بڑے قبیلوں میں سے مگسی، لاشاری ہے۔ اسی طرح جسکانڑیں بھی لاشاری ہیں۔ بھرگور شانڑیں قبیلے میں لاشاریوں کا ایک طاقتور ذیلی تمن ہے۔

لاسی

لس بیلہ میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ کاشتکاری اور مالداری کرتے ہیں۔ ساحلی پٹی میں ماہی گیری سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ جہاں اکٹھے رہتے ہیں مستحکم قبائلی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس کے وہ نسلی گروپ جو پہلے سے مشرقی بلوچستان میں آباد ہوئے، نسلی امتیاز کے اندھے پن کی بدولت اتنا بلند مقام نہیں رکھتے۔ بلوچی کی آمیزش سے بھری ہوئی سندھی بولتے ہیں۔

لانگو

یہ بہت قدیم قبیلہ ہے۔ چاکر و گوئہرام کی آمد سے قبل یہ بلوچستان میں آباد تھا۔ آج کل یہ لوگ کوئٹہ، منگوچر، مستنگ، قلات، نوشکی اور خضدار میں آباد ہیں۔ ان کا شمار ساراوان کے قبائل میں ہوتا ہے۔ ساراوانی قبائل میں شاید سب سے کثیر تعداد والا قبیلہ ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں یہ لوگ ایک اور نام، یعنی لنگاہ کے نام سے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جنہیں انگریز محقق مسٹر او برائن نے ''تجارتی مقاصد کے تحت سیوی اور ڈھاڈر سے یہاں آ کر آباد ہونے والا'' قرار دیا۔ اِن لوگوں نے ملتان کے علاقے پر تقریباً 80 برس حکومت کی جس کے دوران بلوچ سندھ کے ساتھ ساتھ سیت پور سے لے کر کوٹ کروڑ تک آباد ہونے میں کامیاب ہوئے۔(16) ٹھٹھہ کے مقام پر تاریخ کی سب سے بڑی کسان بغاوت شاہ عنایت لنگاہ کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔

کہیں آزاد اور کہیں کسی اور قبیلے کے ماتحت نسل کے بطور زندگی گزارتا ہے۔ حالیہ دور میں بھی بلوچستان میں جمہور اور جمہوری جدوجہد میں اس قبیلے کا بلند مقام ہے۔

لُنڈ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سندھ اور ڈیرہ غازی خان میں بکھرا قبیلہ ہے۔ اس کی ذیلی شاخوں میں لُنڈ، کھوسہ، رند، حیدرانی، احمد انڑیں، گورشانڑیں، خلیلانڑیں اور نوحانی شامل ہیں۔ شادن لُنڈ اُن کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

لوڑی

ایک اہم ترکیبی جز ہے۔ جنگ و امن میں خبر لانے اور لے جانے والا ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر دور دراز تک لوگوں کو دعوت نامے (لوٹ) پہنچاتا تھا۔ بلوچ راج میں فنکار کی حیثیت بھی لوڑی کو حاصل ہے۔ یہ نسل در نسل موسیقی کے مختلف ساز، ڈھول وغیرہ بجانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ بلوچ شہری محنت کش کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ دارتراش (لکڑی کا کام کرنے والا)، آسن کار (لوہار) زرگر (سنار) وغیرہ۔ ان کے اندر جدید دور کا سورج بہت نرم گامی سے داخل ہو رہا ہے۔ تعلیم، نوکری اور سیاسی شعور ان کی نجات کی دُور افتادہ منزل کی طرف اُن کو مدد دے رہے ہیں۔(17)

یہ وہ فنکار لوگ اور گھرانے ہیں جنہیں عزت سے ''لوڑی'' کہا جاتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارے سماج میں ان کی کوئی عزت، کوئی وقار اور کوئی مقام نہیں ہوتا۔ یہ موسیقار پائین ترین درجے کے شہری ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لوڑی کا درجہ غلام سے بھی کمتر ہے۔ یہ مخصوص خاندانوں سے ہوتے ہیں۔ یہ شادیوں میں، جشن میں گانے گاتے ہیں، ساز بجاتے ہیں، رقص کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ ''اصل'' نہیں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہیں ''کم اصل'' کا گھٹیا درجہ نصیب ہے۔ ان کا کوئی خون بہا، کوئی انتقام کوئی سیاہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بلوچ کسی لوڑی یا ڈُومب کی عورت سے شادی کرے تو اس کی اولاد کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ وہ عموماً علاقے کی دائی (نیم حکیم) ہوتی ہے۔

لوڑی سارے بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلوچستان، جو بھیانک انداز میں بے اتفاق ہے، بری طرح توڑ پھوڑ میں ہے اور ہلاکت خیز جنگوں کی سرزمین ہے، وہاں ڈومب اور لوڑی کو قتل کرنا جرم ہے۔ گو کہ ہر قبیلے کا اپنا اپنا لوڑی گھرانہ ہوتا ہے مگر یہ جنگی حالت میں بھی دوسرے قبیلے میں آ جا سکتے ہیں۔ ان کی قبائلی ڈیوٹیاں بے شمار ہیں۔ صرف مکران میں ان کی عیاشی ہے اس لیے کہ وہاں قبائلی نظام ٹوٹ گیا۔ ڈومب، لوڑی بھی ہے، سنار بھی، نغمہ نگار بھی، گلوکار بھی۔ پیغام بر بھی ہے اور رشتے کرانے والا بھی۔ وہ ہر فن مولا ہے۔

بلوچی زبان و ادب اور ثقافت کے امین ان لوگوں کی ترقی اور بہبود کا بہت سارا کام کرنا ہے۔

لھڑی

ان کا اصل ہیڈ کوارٹر زمک رہا ہے۔ اس کے علاوہ بکھری ہوئی صورت میں یہ لوگ کوئٹہ، سبی، ڈھاڈر، مستنگ، قلات اور کچھی میں آباد ہیں۔

کلات کی خانی کے زمانے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر زراعت اور مویشی بانی پہ انحصار کرتے ہیں۔ البتہ شہری درمیانہ طبقے کی تجارتی، اور ٹرانسپورٹ سرگرمیوں، نیز سرکاری ملازمتوں میں بھی بلوچوں کا یہ قبیلہ شامل ہے۔

لیغاری

یہ اصلی رند قبیلہ ہے۔ بلوچستان کا رکھنی اور بارکھان لیغاریوں کے علاقے ہوا کرتے تھے۔ مگر آج یہ قبیلہ بارکھان اور رکھنی کی بجائے کوہِ سلیمان کا بڑا بھاری قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ درہ کوڑا سے لے کر سخی سرور تک پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب بلوچستان شاہراہ اسی قبیلے میں سے گزرتی ہے۔ فورٹ منرو انہی کا تفریحی مقام ہے اور اس سے ملحقہ وادیاں قدرتی حسن کا عظیم عطیہ ہیں۔ اس قبیلے کے چار حصے ہوتے ہیں؛ ہدیانڑیں، آلیانڑیں، بنگلانڑیں اور ہیوتانڑیں۔ آلیانڑیں سردار کا گھرانہ ہے۔

لیغاریوں کے فیوڈل سردار چوٹی نامی جگہ میں رہتے ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد ڈیرہ غازی خان، ملتان، راجن پور اور کوہِ سلیمان پر اور مظفرگڑھ کے علاوہ کوہِ سلیمان کے دوسرے سرے پر ڈیرہ اسمٰعیل خان اور سندھ میں رہتے ہیں۔

سندھ کے **تالپور** بھی اصل میں لیغاری ہیں۔ ایک عرصے تک سندھ پہ حکمرانی کرنے والے اس قبیلے کے دور ہی میں صوفی عنایت شاہ کی المناک شہادت ہوئی تھی۔ خوانینِ قلات کے ساتھ ان کی ناچاقی بھی بہت مشہور ہے۔ مگر بیسویں صدی کے اوائل میں یوسف علی مگسی کا ساتھ دینے والے ان لوگوں کا بلوچ تاریخ میں ہمیشہ نام لیا جاتا رہے گا۔ مجموعی طور پر یہ قبیلہ مویشی بانی اور کاشتکاری سے وابستہ ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پتہ نہیں کس درجے کا احساس کمتری ہے اُن دانشوروں میں جو 'لیغاری'' کو' لغاری'' بنا دینے کے درپے ہیں۔اس ''ی'' نے اُن کا کیا بگاڑا ہے جسے وہ قبیلہ بدر کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ نام کے ساتھ اس قبیلے کی قبیلوی تشکیل کلاسیکل شاعری سے بہت بعد کے زمانے میں ہوئی۔

ماما سنّی

یہ بہت ہی قدیم بلوچ قبیلہ ہے۔شاید آبادی میں بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔یہ لوگ افغانستان ایران اور پاکستان کے بلوچوں کا سنگم بناتے ہیں۔سندھ میں بھی ان کے طائفے ملتے ہیں۔یہ لوگ رخشانی بلوچی بولتے ہیں۔براہوئی اور سندھی بھی ان کی مادری زبانیں ہیں۔اُن کا سردار گھرانہ (کلمی زئی) مشکے میں رہتا ہے۔اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ شیخ حسینی ،مزارزئی، مرداں شئی ،شاہدادزئی ،کوراچی ،سُمائیلی ،مزارزئی ،رنگیانڑیں ،شاہی زئی ،یوسفی ،شیروزئی ،زہرکانی، دُرک زئی ،عیدوزئی ،یاغی زئی ،کیازئی ،منڈازئی ،سیاہی زئی ،خبرائی ،مزارزئی ،بنگلزئی ،شاہوزئی، حسینی ،کلمی زئی۔

مامشّئی

ماسّنی کی طرح ایک قدیم قبیلہ ہے۔زیادہ تر براہوی بولتے ہیں۔یہ قبیلہ مستنگ میں کوہک ،کابو اور کوہِ ماران کے نواح میں آباد ہیں۔نسبتاً امن پسند قبیلہ ہے۔مویشی کے علاوہ بارانی (اور کہیں کہیں کاریز و ٹیوب ویل والی) کاشتکاری کرتے ہیں۔اس کے ذیلی طائفے یوں ہیں: سمائی ،سورو، بنگلا، ہزرانڑیں۔

مری

یہ قبیلہ اس وقت پاکستانی بلوچوں میں سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ان کا سوتیلا اور عاق کردہ علاقہ ،کوہِ سلیمان کے جنوب میں خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش کے طور پر آباد ہے۔ اس کے پہاڑ مشرقی بلوچستان کے دوسرے تمام قبیلوں کی طرح کوہِ سلیمان کی اترتی ہوئی کھردری، بے ترتیب اور دشوار چٹانیں ہیں جن کا جھکاؤ میدانوں کی جانب دکھائی پڑتا ہے۔ندی نالوں سے پھٹے

ہوئے یہ پہاڑ نہ صرف درخت و سبزہ سے عاری ہیں بلکہ بے حسن و بے مہر بھی ہیں۔ان پہاڑوں کے درمیان البتہ کہیں کہیں اچھی چراگاہیں موجود ہیں۔وادیوں میں بکھرے ہوئے زرعی قطعات پہاڑوں کے اندر رنگین پیوند کی مانند لگتے ہیں۔اس قبیلے کا رقبہ بھی بلوچستان کے رقبے کی طرح بہت وسیع ہے اور آبادی کم۔

مری علاقہ مغرب میں سبی، مشرق میں کھیترانڑ، شمال میں دکی لورالائی اور جنوب میں عظمتوں بھرے بگٹی قبائل سے گلے ملتا ہے، کبھی قہر میں کبھی مہر میں۔اپنے اس آبائی علاقہ کے علاوہ مری قبیلہ کے کچھ طائفے مکمل اور کچھ جزوی طور پر جھالاوان ،کوئٹہ، ژوب، مکران، سبی حتیٰ کہ افغانستان اور خلیج میں آباد ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ پورا مری قبیلہ اب کوئی معاشی اتحاد یہ نہ رہا۔روٹی کے حصول کی سرگردانی ،اور حکومت کے ساتھ جنگوں نے اسے باجرے کے بیج کی طرح بے دردی سے پوری قوت کے ساتھ پوری دنیا میں چھڑک ڈالا ہے۔چنانچہ اب مری قبیلہ ہر بلوچ علاقے میں پایا جاتا ہے۔سندھ کا بھی تقریباً ہر ضلع مری سے آشنا ہے۔مری کہیں پہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہ رہے ہیں، کہیں فیوڈل نظام میں اور کہیں سرقبیلوی نظام میں۔مگر خواہ وہ جہاں ہوں، جس پیشے سے بھی منسلک ہوں، اُن کے دل اپنے قبیلے، اپنے علاقے اور اپنے پہاڑوں کی کھونٹیوں کے ساتھ مضبوطی سے بندھے ہوتے ہیں۔

مری1839 میں انگریزوں کے ساتھ واسطہ میں آئے جب انگریز بولان کے راستے افغانستان پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔مگر وہ بھلا سلامت کیوں جاتا؟ دوسروں پر ناجائز قبضہ کرنے مری اُسے کیوں کر چھوڑتے؟ چنانچہ جان کین کی اس فوج پر حملہ کر کے طویل مری وانگریز جنگوں کا آغاز کر دیا۔انگریز حملہ آوروں کے خلاف بے شمار چھوٹے چھوٹے گوریلا حملوں کے علاوہ باقاعدہ پانچ بڑی جنگیں لڑ چکا ہے۔ایسی جنگیں جہاں بہادری، سامراج دشمنی وطن دوستی اور آزادی پسندی اپنی ممکنہ انسانی عروج پر نظر آتی ہیں۔

بجارانی، گزینی اور لوہارانی اس بڑے قبیلے کی بڑی شاخیں ہیں۔مگر مری میں، دوسرے بلوچ قبائل کی بہ نسبت غیر مریوں کو اپنے اندر ضم کرنے کی زبردست صلاحیت اور رجحان موجود

رہاہے۔ یہ سلسلہ کبھی نہیں رکا۔

مری میں بجار خان کی موت کے بعد اس کا بیٹا آزاد خان سردار بنا مگر وہ لا ولد فوت ہوگیا۔ اور سرداری بجار خان کے بھائی درویش خان کو منتقل ہوگئی مگر اس سے سرداری وزیر خان آلیانی نے چھین لی۔ اس عرصے میں گزین خان مری قبیلے میں آیا۔(18)

ماوند کے پہاڑوں میں آباد ہونے اور بعد میں مری کا نام وضع کرنے کے بعد اس قبیلے کے لوگوں نے مشرقی جانب کا علاقہ حسنی سے قبضہ کیا اور شمال میں کوئٹ منڈاہی کا علاقہ پشتونوں سے لے لیا اور یہاں آباد ہوگئے۔

انگریز کی تاریخ کی کتابوں میں مری علاقے کا مطلب تھا: منڈاھی، ماوند، کاہان اور نیساؤ۔ سبی گزٹیئر کے صفحہ نمبر 264 میں یوں بیان یا گیا ہے: ''مری کا علاقہ تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؛

1۔ کاہان (2353 فٹ)۔

2۔ بشمول تدڑی، ڈاھو، بانبور، پیلاوغ کا ایک حصہ، نیساؤ، اور جنتلی (2847 فٹ)۔

3۔ ماوند (2600 فٹ) اور گمبولی''۔

کوہلو وادی کو مری نے کہیں جا کر جولائی 1878ء میں کمزور اور کم تعداد میں رہ جانے والے زرکانڑ قبیلے سے قبضہ کرلیا۔ اور اسے چار حصوں میں تقسیم کرلیا۔ جس کے تحت گزینی مری نے اروا، ونگا، پشت، ماڑ اور باہر لے لیے۔ لوہارانی نے ناڑیال، کالی کڑ، سوار اور میدار۔ اور بجارانی وزرکانڑ نے باغ، بھر، زیارت اور سونڑی لے لیے۔ گلوگوز و سردار مہراللہ خان کو پنجک کے بطور مل گیا۔(19)

مری قبیلہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ تین کو بلوچی میں سئے کہتے ہیں۔ اس طرح تین حصوں میں سے ہر ایک کو ''سئے یک'' کہتے ہیں۔ یہ تینوں سیک ہیں؛ گزینی، لوہارانی، بجارانی۔

لوھارانی: یہ چار ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے؛ لوہارانی، شیرانی، مہمدانڑیں، شاہانڑیں۔ لوہارانی کی ذیلی شاخ ہیں؛ جنڈو، سارنگ، دُرک، ولیداذ (غلام عورت سے بیٹے کا نام سیاہ پاذ تھا)۔ شیرانی (لوہارانی) کے چار فرقے ہیں؛ جنڈوانڑیں، سارنگانڑیں، درکانڑیں، بیلو؟ دھڑ۔ جنڈوانڑ

یں سے ولیدادانڑیں اور جنڈوانی آتے ہیں۔ سارنگانی میں ھمیدانی اور سیاہ پاد۔

شاید میلوھڑ میں گڈ، شکلانڑیں، بنگوار، رندکانڑیں، قویلانی، گندل گوَر آتے ہیں۔

گزینی: کے ذیلی فرقے ہیں؛ نوذبندغانڑیں، بھاولان زئی، لانگھانڑیں، عالیانڑیں، مہکانڑیں، ٹینگانڑیں، مہمدانڑیں، ژنگ، عیسوانڑیں، چلگری، ژنگ، مہندانڑیں، مزارانڑیں، لوڑی کُش، کُوہیچی، بڈّانڑیں، ھلیلانڑیں، چُوری، مُرگیانڑیں، جروار، کیہہ واڑ، کہور خاں زئی، اور ہڈوار۔

جروار شہدادکوٹ، کمبر، لاڑکانہ، سانگڑھ، حیدرآباد، بدین، میرپورخاص، کشمور اور جیکب آباد میں اب کہیں کہیں ایک الگ قبیلے کے بطور بھی موجود ہیں۔ جروار راجھستان ہندوستان میں بھی ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔

بجارانڑیں: بجارانڑیں کی پانچ ذیلی شاخیں ہیں۔ اس لیے کہ بجار کے پانچ بیٹے تھے؛ سالار، سومر، پیڑداذ، قلندر، کُنگر۔ چنانچہ سالارانڑیں، سومرانڑیں، پیردادانی، قلندرانڑیں، اور کنگرانڑیں۔ ان پانچ ذیلی شاخوں کو ''بُنڈ بجارانڑیں'' کہتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں ''پڑ بجار'' بھی کہتے ہیں۔

بجارانی میں باہر سے آنے والے قبائل ہیں؛ رامکانی، شاہیجو (گزینی سے آئے ہیں)۔ پوادی کوہِ سلیمان سے آیا، قیصرانڑیں سب سے بعد میں آئے۔ چانڈھے بھی باہر سے آیا۔ چانڈ ہے اور شیلاچی جہاں ہوں، مکس ہوجاتے ہیں۔

سالارانڑیں: بجارانی میں سالار کا بیٹا تھا سوزل۔ جس کے بھتیجے کا نام کمال تھا جہاں سے کمالہانڑیں اور بڑیانڑیں بنے۔ سالار کے بیٹے سوزل کے چھ بیٹھے تھے؛ لودھاڑ، رحیم خان، روحیل، لودی، یار خان، شیھک۔

سالارانڑیں میں باہر سے آ کر شامل ہونے والے یہ ہیں؛ بابیانڑیں (مزاری سے آئے ہیں)، موسیٰ زئی، شیر خان زئی (علاقہ باڈور سے آئے ہیں)، شیلاچی (حسنی سے آیا ہے)، رندہاں زئی، بڑیانڑیں (ونڑپچی سے آیا ہے جسے سوزل کے بھتیجے کمال نے پالا)۔ کچھ کہتے ہیں کہ لودی زئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی باہر سے آئے ہیں اور سوزل کا چھٹا بیٹا لودھی نہیں بلکہ روحیل ہے۔

سومرانڑیں: سومر کا بیٹا تھا وزیر (اول)۔ اُس کے چار بیٹے تھے: وشہال، پُلو، گلو، شادیہان (اول)۔ پلو کے تین بیٹے تھے: بہار خان، جلالہان اور علی گل۔ جلالہاں کا بیٹا تھا مست توکلی کا گہرا دوست بہار خان جس کے دو بیٹے تھے آدو اور جہاں خان۔ جہاں خان کے دو بیٹے تھے؛ عمر خان اور صاحوان۔ صاحوان کے دو بیٹے کریمو اور جلالہان تھے۔ جبکہ عمر خان کے دو بیٹوں کا نام تھا حمل اور بہار خان۔ بہار خان کا بیٹا عمر خان تھا۔

شادیہان اول کے تین بیٹے ہوئے؛ دلیل (اول)، دولتان اور بلوچاں۔

دلیل اول کا بیٹا ہوا شادیہان (دوئم) جس کا بیٹا ہوا دلیل (دوئم)۔ جس کے دو بیٹے تھے زر خان اور وزیر دوم۔ (میں اسی وزیر کا پوتا ہوں)۔ جس کے بیٹے تھے میاں خان، بختیار خان، سحراب خان، بہرام خان، حاجی محمد مراد۔

سومرانڑیں میں باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں؛ سومرازئی اور گوئہرام زئی۔

کلوانڑیں: پانچ ذیلی فرقوں میں تقسیم ہوتا ہے؛ وڈیرہ زئی، پیری زئی، گرانی، ڈاھی زئی، مہروزئی۔ کلو سے منسوب اس قبیلے کے، شاہو سے منسوب شاہیجو سے نزدیکی ہے، اس لیے کہ یہ دونوں افراد باہم بھائی تھے۔

رامکانڑیں: اس کوہستانی قبیلے میں آج شامل قبائل ہیں؛ بوڑوزئی، للوانی، پروئی، لال خان زئی۔

کنگرانڑیں: کنگر سے کنگرانڑیں بنا جس کے ذیلی فرقے ہیں؛ عالیانڑیں، حسوزئی، وڈیرہ زئی اور شکلانڑیں۔ بزدار اور کھوسہ باہر سے آکر کنگرانی میں شامل ہوئے۔

قلندرانڑیں: قلندر سے منسوب قبیلہ ہے جس کے دو بیٹے تھے؛ باران اور نہالان۔ جبکہ باران سے باران زئی کے چار ذیلی فرقے ہیں؛ رندکانڑیں، نورخاں زئی، وڈیرہ زئی، گلوزئی قلندرانڑیں میں بعد میں شامل ہونے والے فرقے ہیں؛ باراں زئی، ڈانگیانڑیں، گریانی، شیلاچی، محبتانی، مصری زئی، ملگزارزئی اور میاں خاں زئی۔

نہالان کے بیٹے کرم خان کے چار بیٹے تھے؛ شربت، مڑزیہان، بہار خان اور سید ہان۔ شربت کے دو بیٹے ہوئے؛ تورخان، نور محمد۔ جبکہ فتح خان کے پانچ بیٹوں کے نام تھے: ھذاشک، ہذاداذ، بیورغ، نہالان، باہر۔

چانڈ ھے اور سیلاچی نہ صرف مری قبیلے میں بکھرے ہوئے موجود ہیں بلکہ بہت سارے قبائل میں بھی ہیں۔

مریٹہ

یہ طبقہ ابتدا میں غلام ہوا کرتا تھا۔ کچھ محققین کہتے ہیں کہ یہ نسلاً ہندوستان والے مرہٹے ہیں جو جنگ کے نتیجے میں غلام بنا کر لائے گئے ہیں اور بلوچ قوم نے باہم مال غنیمت کے بطور تقسیم کر کے اپنے اشرافیہ کی خدمت گزاری میں استعمال کیے۔ ان کا مقام عام بلوچ سے بہت کم تر جانا جاتا ہے۔ راجی زمین میں مریٹہ حصہ دار نہیں ہوتا۔ سیاہ کاری یا قتل ہونے کی صورت میں اس طبقے کا خون بہا وغیرہ بھی دوسرے بلوچ راج سے کم تر مانا جاتا ہے۔(20)

مریٹہ بالخصوص بگٹی اور مری قبیلہ میں ہیں۔ اور وہاں خانہ بدوشی کے بجائے دیہات و شہر میں رہتے ہیں۔

مزاری

یہ قدیم بلوچ قبیلہ مزار یعنی شیر سے منسوب ہے۔ اس بارے میں عوام کے اندر بہت دلکش روایتیں موجود ہیں۔

مزاری ڈیرہ غازی خان کے جنوبی علاقہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کا علاقہ جیکب آباد تک پھیلا ہوا ہے اور شمال میں یہ عمر کوٹ اور پٹک درہ تک پھیلا ہوا قبیلہ ہے۔ ان کا ہیڈکوارٹر روجھان مزاری کہلاتا ہے۔ بالا چانڑیں ان کا حکمران طائفہ ہے۔ مزاری 1836 سے لے کر 1838 تک حملہ آور سکھوں کے دانت توڑتے رہے ہیں۔ ہر بلوچ قبیلے کی طرح اپنے رسم ورواج پر بنیاد پرستی کی حد تک قائم ہے۔ مزاری قبیلہ پڑوسیوں کے ساتھ خونیں جنگوں میں الجھا رہا ہے۔ اس قبیلے کے لوگ فیوڈل پیداواری رشتوں سے منسلک ہیں۔ کشمور کا قلعہ میر نصیر خان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے مزاریوں کو قابو کرنے کے لیے بنوایا تھا۔(جب میر گلشیر خان 1764 میں اپنے والد کی وفات کے بعد سردار بنا اور میر نصیر خان نے مزاریوں پر حملہ کر کے گلشیر کو قتل کر دیا)۔ بالاچانڑیں، رستمانڑیں 1836 تک حملہ اور سکھوں کے دانت توڑتے رہے، میدانی اور سرگانڑیں اس کے بڑے طائفے ہیں۔

مستوئی

سندھ، ڈیرہ غازی خان، اور پٹ فیڈر میں ہیں۔ یہ ایک مخلوط، چھوٹا اور بہت بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔ یہ لوگ بلوچ کی ایک اور قومی زبان، سرائیکی بولتے ہیں۔ اس کی موجودہ نام سے قبائلی تشکیل بہت حالیہ ہے۔ بلوچی کلاسیک میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

مغربی دامانی

یہ لوگ خود کو مری سمجھتے ہیں۔ بمپور دریا کے تاس میں آباد ہیں۔ وہ اناج اور کپاس و تمباکو کاشت کرتے ہیں۔

مکرانی

اس نام سے ہندوستان کے گجرات میں ایک بکھری بلوچ آبادی رہتی ہے۔ ان کے ساتھ بلوچوں کا ایک اور گروہ بھی رہتا ہے "سلیمانی" کے نام سے۔ گجرات کے ان مکرانی بلوچوں کی ذیلی شاخوں کے نام ہیں؛ آسکانی، بلوچ، عمرزئی، رند، مُلاکاجی اور گڈیازئی۔

مگسی

اس قبیلے کا نام مغربی بلوچستان کی مگس وادی کے نام سے متعلق ہے۔ کھیتی باڑی بالخصوص کھجور، اناج اور صنعتی فصل یعنی کپاس کی کاشتکاری کرتے ہیں۔

مگسی، گنداواہ اور جھل کے علاقے میں بھی رہتے ہیں جہاں ان کے فیوڈل (سردار) رہتے ہیں۔ مگر یہ قبیلہ سندھ میں ایک بڑے قبیلے کے بطور موجود ہے۔ اسی طرح میں نے اندرونِ پنجاب میں بے شمار مگسی آبادیاں دیکھی ہیں۔ جن بلوچوں کو لاشاری کہا جاتا ہے یا گوھرام کی اولاد سمجھا جاتا ہے ان میں مگسی قبیلہ نمایاں ہے۔ ہماری کلاسیکل شاعری میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ مشرقی قبائل میں صرف مگسی

اور ڈومبکی نے خانِ قلات کی اطاعت قبول کر لی۔ اور دوسو سال سے اُن کی تاریخ خوانینِ قلات کی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے۔ خان کے دربار میں مگسی قبیلے کا شمار جھالاوان کے قبائل میں ہوتا ہے۔

اس قبیلے نے بلوچ قومی عوامی تحریک میں شرف و عزت کا مقام اُس وقت حاصل کیا جب اس نے یوسف علی خان نامی بیٹے کو جنا۔ انہیں بلوچوں میں "بابائے قوم" کا مقام حاصل ہے۔ وہ بلوچ کے مستقبل کا قطب نما ہیں۔ کئی نسلوں سے لوگ ان کے نظریات کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

مگسی کے فرقے یوں ہیں؛ بھوتانڑیں، شمبانڑیں، شبرانڑیں، راہیجہ، بجرانڑیں، مرزائی، نندانی، راوتانی، سوبھانی، ساکھانی، روھیجہ، مغیمانی، کھوسہ، بنگلانڑیں، ھسرانی، کاٹیار، خاٹوھل، ہیسبانڑیں، مغیری، احمدانی، مری، بولٹی، لشکانڑیں، لاشاری، فصلانڑیں، چندرامان، عمرانی، جتک، شاہ موزئی، گادھی، گگرانڑیں، گولانڑیں، سیاہ زئی اور جاغیرانڑیں (21)۔ بھوتانڑیں، مگسیوں کو سردار سپلائی کرنے والا طائفہ ہے۔ ان کے پاس بے شمار زرعی زمین ہے۔ مگسی قبیلہ پاکستانی بلوچستان، ایرانی بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی بڑی تعداد میں آباد ہے۔

ڈیمز کی تحقیق ہے کہ یہ قبیلہ لاشار کی اولاد ہے۔ مگسی کے جداجدا فرقے زیادہ تر لاشاری کے نام سے منسوب ہیں۔ انہیں گنداواہ (کندابیل) کی زمین شاہ حسین نامی حکمران نے اس لیے دی کہ مگسی نے فیروز جام کے خلاف جنگوں میں شاہ حسین کا ساتھ دیا تھا۔

ملغانڑین

میر ملّغ خان سے منسوب یہ قبیلہ اصل رند قبیلہ ہے۔ ڈیرہ غازی خان کا علاقہ اِن کا سب سے بڑا مسکن ہے مگر اپنے دیگر بلوچ قبائل کی طرح یہ بھی سندھ کے مختلف اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ یہ قبیلہ سردار اسلم ملغانڑیں کی قیادت میں انگریزوں سے بھڑ گیا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ قبیلہ ہے۔

ٹیھہ

غلام نبی ساجد بزدار کی معلومات کے مطابق یہ زرخرید غلاموں کا طبقہ ہے۔ اب یہ خرید و فروخت باقی نہیں رہی۔(22) لہٰذا بطور قبیلہ یا فرقہ ان کا الگ وجود موجود نہیں ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مید

مید ہمارے پاک ماہی گیر ہیں۔اُن کے محنت کش ہاتھوں میں ان کے اپنے علاوہ ہماری روٹی روزی کا بھی انحصار ہے۔ یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، بلوچ بھوک سے نہیں مرے گا۔اور بحیرہ بلوچ محفوظ ہاتھوں میں رہے گا۔

میرالی

رندی عہد کی بلوچی شاعری ان کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔آج کہاں ہیں،شاید کہیں بھی نہیں۔یعنی منظم قبیلے کی صورت میں یہ لوگ اب وجود نہیں رکھتے۔

میرانڑیں

ایک بکھرا قبیلہ ہے۔اس کا ارتکاز تو سرحد پار والے بلوچستان میں ہے۔ ہمارے اِس والے حصے میں میرانڑیں بہت کم ہیں۔البتہ پنجاب میں یہ لوگ زیادہ ہیں اور دوسرے نمبر پر سندھ میں الگ الگ مقامات میں موجود ہیں۔

میر واڑی

میرواڑی قبیلہ نغاڑ سوراب میں سکونت پذیر ہے اور یہ احمد زئی خاندان کا جدِ امجد قبیلہ ہے اس نے احمد زئی خاندان کی تشکیل سے پہلے نغاڑ میں سرداری کے فرائض انجام دیے اور میر عمر میرواڑی اس میں مشہور تاریخی شخصیت گزری ہے۔

اس کی ذیلی شاخیں کبمرانڑیں، گرگناڑی، احمد زئی اور التازئی ہیں۔

مینگل

مینگل قبیلہ ایک بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔افغانستان، ایران اور پاکستان تینوں ممالک میں آباد ہے۔اسی طرح ضلع چاغی، ضلع خضدار، پٹ فیڈر اور سندھ کے مختلف مقامات پر کہیں گنجان اور کہیں چند گھرانوں کے بطور رہتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ قبیلہ بقیہ بلوچوں کی طرح بھیڑ پالی اور زراعت سے وابستہ ہے۔

اس کے قبائلی فرقے کبھی کبھی تو الگ قبائل لگتے ہیں۔زگر مینگل اور شاہی زئی مینگل تو بڑی شاخیں ہیں مگر اس کی چھوٹی ذیلی شاخیں ہیں: مرحاجی، پہلواں زئی، جمل زئی، گمشاد زئی، ذگر، دینار زئی، باران زئی، سمالانڑیں، قلندرانڑیں، گرگناڑی، میروانڑیں، قمبرانڑیں(23)

نورا مینگل، عطا اللہ خان مینگل، گل خان نصیر لونگ خان، عاقل خان اور گوہر ملک کی بلوچ قومی وعوامی سیاست، اور ادب میں بے مثال قربانیوں کی وجہ سے مینگل دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔

ناروئی

ایرانی بلوچستان میں رہتے ہیں، اور تقریباً 23 قبائلی فرقوں میں منقسم ہیں۔ کاشتکاری میں بھی اچھے خاصے استاد ہیں۔ان کا سردار نصرت آباد میں رہتا ہے۔یہ لوگ مالداری اور شتربانی کرتے ہیں۔''جرجیم'' نامی عمدہ قالین بناتے ہیں۔ یہ سیستان وخراسان میں بھی رہتے ہیں۔حتیٰ کہ کچھ لوگ چاغی، کوئٹہ اور پشین میں بھی آباد ہیں۔

نتکانڑیں

(نوشک، نوشکانڑیں)

تحصیل تونسہ میں آباد ہے جس کا صدر مقام منگڑوٹھا ہے۔ یہ بلوچوں کا نسبتاً ایک خواندہ قبیلہ ہے۔رنجیت سنگھ دور کے ابتدائی ایام میں اس کا قبائلی تشخص تباہ ہو گیا۔ (24) یہ سارا قبیلہ بلوچوں کی ایک قومی زبان سرائیکی بولتا ہے۔ملغانی جیسا مشہور قبیلہ دراصل اسی کی شاخ ہے۔

نظامانڑیں

جناب قادر بخش نظامانڑیں کا قبیلہ ہے جو اب حیدرآباد میں آباد ہے۔ بنیادی طور پر یہ لوگ ڈیرہ غازی خان کے تھے۔میامی کی مشہور جنگ اس قبیلے کے شہدا کی برپا کردہ تھی۔

نوھانڑیں

رند و لاشار عہد کی شاعری میں ان کا ذکر آتا ہے۔ ڈیمز نے مغلوں کے خلاف بلوچ لڑائیوں میں ان کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

هوت

مکران کا قبیلہ ہے ۔ اس کے کچھ گھرانے ڈیرہ اسماعیل خان، جھنگ، ملتان، اور ڈیرہ غازی خان کے علاقوں میں بھی رہتے ہیں۔ہوت،مکران میں تو حاکم بھی رہے ہیں،ابھی بھی وہاں کافی تعداد میں رہتے ہیں ۔یہ لوگ ایران میں بھی موجود ہیں۔شاہ لطیف نے اس قبیلے کو تا قیامت زندگانی بخشی ہے۔اس لیے کہ اس کی شاعری کی اہم ترین کردار، سسی کا محبوب پنوں، ہوت بلوچ تھا۔

یار احمد زئی

یہ لوگ خواش ،ارندگان ،بمپور ،گُشت ،دیزک اور جالک میں آباد ہیں ۔ان قبائل کی اکثریت خانہ بدوش مالداری کرتی ہے۔یاراحمد زئی مندرجہ ذیل گروپوں میں منقسم ہیں؛

سہراب زئی،محمود زئی،شیر زئی اور میر خیل زئی۔

حوالہ جات

1۔نصیر،گل خان ۔کوچ و بلوچ ۔صفحہ 104

2۔نصیر،گل خان ۔کوچ و بلوچ۔صفحہ 117

3- گزٹیر کچھی ۔1986۔صفحہ 51 گوشہ ادب کوئٹہ۔

4۔گزٹیر بلوچستان، سبی ۔دوسرا ایڈیشن۔1986۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 55

5۔ http://en.wikipedia.org/w/indexphp?title=chandio&oldid=478597990

6۔لیغاری عبدالقادر۔تاریخ ڈیرہ غازی خان ۔حصہ دوئم۔صفحہ 51

7۔میکلیگن ،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنٹیر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا، 2004۔بک ہوم۔صفحہ 213

8۔ہتورام/ نگٹی،عزیز۔بلوچ قبائل۔2004۔قلات پبلشرز کوئٹہ۔صفحہ 54

9۔میکلیگن ،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنٹیر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا، 2004۔بک ہوم ۔صفحہ 343

10۔شُلزفریڈ۔نومیڈزم اینڈ کالونیلزم۔2002۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 200

11۔شُلزفریڈ۔نومیڈزم اینڈ کالونیلزم ۔2002۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ 201

12۔شُلزفریڈ۔نومیڈزم اینڈ کالونیلزم ۔2002۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ 202

13۔میکلیگن ،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنٹیر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا‘‘ 2004۔بک ہوم۔ صفحہ 360

14۔شیدائی مولائی۔تاریخ قلات (حصہ اول)۔1983۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 171

15۔میکلیگن ،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنٹیر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا‘‘ 2004۔بک ہوم۔ صفحہ 381

16۔میکلیگن ،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنٹیر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا‘‘ 2004۔بک ہوم۔ صفحہ 390

17۔بزدار، غلام نبی ساجد۔سرقبیلوی نظام۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔دسمبر 2007۔صفحہ 44

18۔ہتو رام۔تاریخ بلوچستان۔صفحہ 80

19۔سبی گزٹیر۔صفحہ 248

20۔بزدار، غلام نبی ساجد۔سرقبیلوی نظام۔۔۔صفحہ 44

21۔گزٹیر۔کچھی۔دوسرا ایڈیشن۔1986۔گوشہ ادب۔صفحہ 36

22۔ گزٹیر۔کچھی۔دوسرا ایڈیشن۔1986۔گوشہ ادب۔صفحہ نمبر 44

23۔شیدائی، مولائی۔تاریخ قلات (حصہ اول)۔1983۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 128

24- میکلیگن ،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنٹیر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا‘‘ 2004۔بک ہوم۔صفحہ 440

www.iqbalkalmati.blogspot.com

2- قبیلے کا تنظیمی ڈھانچہ

بلوچستان تاریخی اور روایتی طور پر ایک کمزور ملک رہا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ بے شمار وادیوں پر مشتمل بہت سے چھوٹے چھوٹے معاشروں کا کنفیڈریشن رہا ہے جہاں (سوائے نصیر خان نوری کے کبھی) کوئی مرکزی اتھارٹی قائم نہ ہوسکی۔ قوم تنوع اور رنگا رنگی میں مرکزیت کی طرف ارتقا کرتی جاتی ہے۔

مختلف علاقوں میں رائج مختلف ناموں اور اصطلاحوں کی یکسانیت تلاش کی جائے تو بلوچ قوم کا ڈھانچہ نچلے سطح پر موجود ''فرد'' سے لے کر ''قوم'' تک تقریباً یوں بنتا ہے:

فرد، لوغ، بولک (ترکی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے ''مردوں کا ایک گروہ'')، زئی، ٹکر، سیک، تمن (قوم)، بلوچ۔(1)

دنیا میں کوئی بھی انسانی سماج ساکن وساکت ومردہ سماج نہیں ہوتا۔ ہمارا قبائلی نظام والا سماج بھی محض افراد کا عام سا مجموعہ نہ تھا۔ یہ ایک زندہ سماجی مجموعہ تھا جس میں بہت سے اجسام (قبائل) تھے۔ انہی اجسام کے اندر کچھ اور اجسام (ذیلی فرقے) تھے اور ان تمام اجسام میں سب سے ابتدائی جسم کا نام خاندان ہے جو کہ فرد کے کاندھوں پر کھڑا ہے۔ اگر آپ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ایک اہرام (Pyramid) بنائیں تو اُس کی چوٹی پر سردار ہوتا ہے جو اکیلا ہوتا ہے اور اختیارات سے بھرا ہوا۔ اس احرام کی چوٹی سے نیچے آتے جائیں تو درجہ بدرجہ نیچے ''بڑی تعداد اور کم ہوتے ہوئے سٹیٹس'' والی سطحیں ملیں گی۔ سب سے نیچے عوام ہوتے ہیں۔(2)

گوکہ قبیلے کا پیریں مڑد (سردار) سب سے بلند ہوتا ہے مگر قبائلی ہیرارکی میں ہر ایک پیریں مڑد کا اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ اس نظام میں قبائلی سٹیٹس برابری پر زور نہیں دیتا بلکہ یہ ایک ہیرارکی میں بڑے اور چھوٹے لیڈروں کے درمیان سرپرستی اور حاشیہ نشینی کے سلسلہ پر مبنی ہے۔

مگر تنظیم کا سیاسی طور پر اہم پہلو یہ ہے کہ ہر گروپ کے ممبر اس گروپ کے لیڈر کے

ساتھ سیاسی حاشیہ نشینی کا رشتہ تسلیم کرتے ہیں۔ یہ لیڈر پھر ''عمودی'' طور پر کام کرتا ہے۔

آیئے نیچے سے اوپر کی طرف بڑھیں:

فرد

ایک مردانہ معاشرے میں بھی فرد سے مطلب محض نرینہ شخص نہیں ہوتا ہے۔ عورت کے مقام سے بالکل غیر مطمئن ہونے کے باوجود ایک اضافی بات یہ ہے کہ عورت باہمی سردار کُش جنگوں میں اہمیت اختیار کرتی ہے۔ گرم جنگ کے میدان میں عورت کا ظہور حتمی طور پر جنگ کو بند کرتا ہے۔ اسی طرح بڑی اور گھمبیر دشمنیوں میں ایک طرف کی عورت کا مخالف فریق کے گھر لے جانے سے پشت ہا پشت چلنے والی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔

عورت نہ صرف گھر اور گھر داری، اور نسل انسان کی تولید و پرورش کے لیے مخصوص ہے، بلکہ وہ آؤٹ ڈور کی محنت بھی کرتی ہے۔

مرد مویشی بانی اور زراعت کے امور سے متعلق اپنے حقوق وفرائض سے وابستہ ہوتا ہے، قبائلی جنگوں میں سپاہی ہوتا ہے۔ کچھ جرائم بالخصوص عورت سے شادی سے باہر والے تعلقات میں اس نے سزا انفرادی طور پر جھیلنی ہوتی ہے۔ بقیہ سارے شر و خیر اور نیک و بد میں اپنے قبیلے کا اٹوٹ حصہ ہوتا ہے۔ بلوچ قبائلی فرد تقریباً تقریباً سماجی ہوتا ہے۔ اس کی انفرادیت قبیلے کے سمندر میں جذب رہتی ہے۔

خاندان

خاندان کے اندر افراد نامی اجسام ہوتے ہیں، جن کے اشتراک سے انسانی سماج کی سب سے بنیادی اکائی یعنی خاندان کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس نظام میں ممبر شپ، پوزیشن، اتھارٹی اور سٹیٹس باپ کی طرف سے اولاد کی طرف چلتی ہے۔ خاندان خیمہ وخانہ بدوشی میں ماں باپ اور نابالغ (جو ''شلوار پاذی'' نہ ہو) بچوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر دیہات اور قصبہ میں وسیع (extended) ہوتا ہے۔ ماں (ماث، آئی) باپ (پِث، ابا) آپس میں ''زال ومڑد'' (میاں بیوی) ہوتے ہیں۔ خاوند ''مڑد'' ہی ہوتا ہے مگر بیوی ''لوغی یا لوغ بانک''۔ مائیں لیکن دو بھی ہوسکتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں، باہم ہفوخ (سوکنیں)۔ایسی صورت میں ایک ماں اصلی ہوتی ہے، دوسری ''ماتن'' ہے۔اسی طرح بہن بھائیوں میں ''ماتنیں'' بچہ ''جُذ ماث'' کہلاتا ہے۔بھائی ''براث، ادا'' ہوتا ہے اور بہن ''گہار یا ادی''۔بہن کی اولاد ''گہاڑ زاتک'' کہلاتی ہے۔ماں کا بھائی ماما اور اس کی بیوی مامی ہوتی ہے۔ماں کی ماں نانی ہوتی ہے نانی کی ماں ''پرنانی'' اور ماں کی بہن ''ماسی یا تروُ'' ہے اور اس کے بچے ''تروزاتک یا ترینزاتک'' ہوتے ہیں۔باپ کا باپ ڈاڈا ہوتا ہے ڈاڈا کی بیوی ڈاڈی اور ڈاڈا کا باپ پرڈاڈا، اور باپ کے بھائی ناکو اور بابا ہوتے ہیں۔تایا اور چچا کے لیے الگ الگ الفاظ نہیں ہوتے۔باپ کی بہن ''ترو یا پُھی'' ہوتی ہے۔چاچا اور اس کی بیوی چاچی کے بچے ناخوزاتک کہلاتے ہیں۔اور ناخوزاتک کے بچے پرناخوزاتک۔

مرد کے بھائی (براث) اُس کی ماں باپ کے نرینہ بچے ہی ہوتے ہیں مگر عورت کا ایک اضافی بھائی بھی ہوتا ہے جو اس کی ماں شادی کے وقت اُس کے لیے اُس کے خاوند کے خاندان میں سے ایک کو منتخب کرتی ہے۔اُسے ''وکیلی براث'' کہتے ہیں۔بھائی کی بیوی ''نشار'' کہلاتی ہے۔خاوند کے بھائی کی بیوی ''اُمجرات'' جبکہ اس کی بہنیں ''دُشکیش''۔بیٹے کی بیوی بھی نشار ہوتی ہے۔بیٹے اور بیٹی دونوں کے بچے ''نواسغ'' ہوتے ہیں اور نواسغوں کے بچے ''کواسغ'' ہوتے ہیں اور کواسغ کے بچے کُراسغ۔سُسر ''وسِرک'' کہلاتا ہے اور وسرک کے بیٹے یعنی خاوند کے بھائی ''وسرک زاتک یا سٹرزاتک'' ہوتے ہیں۔بیٹی یا بہن کا خاوند ''زامات'' ہوتا ہے۔دو بہنوں کے خاوند آپس میں ''ہم زاماث'' ہوتے ہیں۔

نرینہ زمین، مویشی اور دوسری جائیداد و مال میں حصہ دار ہوتا ہے۔باپ کے دو حصے اور بیٹوں کا ایک ایک حصہ۔مادہ کا ملکیت و جائیداد میں حصہ نہیں ہوتا ہے۔حتیٰ کہ خاوند لاولد مرجائے تو بھی بیوہ کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا اور ساری جائیداد خاوند کے بھائیوں (اور اگر اس کے بھائی بھی نہ ہوں تو) چچیروں میں تقسیم ہوتی ہے۔

پیر ین مڑد

خاندان کا ایک سفید ریش، بزرگ یا لیڈر رہتا ہے جسے ''پیریں مڑد'' کہتے ہیں۔

مختلف خاندانوں کے پیریں مڑدوں میں سے پھر ایک ان پیریں مڑدوں کا پیریں مڑد بنتا ہے۔اس طرح ہر سیکشن، ہر ٹکر اور ہر قبیلے کا ''پیریں مڑد'' ہوتا ہے۔

وڈیرہ

وڈیرہ اپنے ٹکر (ذیلی قبائلی فرقہ) کا بڑا ہوتا ہے۔اس کی حیثیت اپنے ذیلی فرقے میں تقریباً وہی ہوتی ہے جو سردار کی پورے تمن یا قبیلے میں ہوتی ہے۔اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے جس میں اس پر دستار بندی (تاج پوشی) کی رسم لازمی ہوتی ہے اور اس کے سر پر دستار کا پہلا بل قبیلے کا سردار خود باندھتا ہے۔وڈیرہ کو سردار کی طرح پگڑی والی زمین و جائیداد ملتی ہے۔یہ زمین دستار کے ساتھ منتقل ہوتی جاتی ہے، اُسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

وڈیرہ جنگی صورت میں افراد مہیا کرتا ہے۔تاوان یا غنیمت کی تقسیم اپنے قبیلے میں کرتا ہے، جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔پوری قوم کے جرگے میں اپنے ذیلی قبیلے کی نمائندگی کرتا ہے۔

سردار

تومان اصل میں چنگیز خان کی فوجوں میں دس ہزار افراد پہ مشتمل جنگی گروپ کو کہا جاتا تھا۔اسی تمن سے تمندار نکلا جو بڑے قبیلے کے سربراہ کو کہا جاتا ہے۔(تمن اور تمن دار کے الفاظ اب تقریباً گم ہو چکے ہیں)۔

قبائلی ہیرارکی کی چوٹی پر سردار بیٹھا ہے۔اس کا ہم سر اور اس کی برابر کرنے والا قبیلے میں کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔وہ قبیلہ پر اپنا اثر اپنے ماتحتوں یعنی وڈیروں کے ذریعے برقرار رکھتا ہے۔

سردار، وڈیروں کے ذریعے نظامِ حکومت چلاتا ہے۔سردار ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے سیاسی، ثقافتی اور معاشی اختیارات کے دریا پھوٹتے ہیں۔وہ اپنی اتھارٹی کو برقرار رکھنا جانتا بھی ہے اور ایسا کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔اس لیے اوپر سے نیچے تک ہر ایک ممبر نظامِ حکومت چلانے میں ماہر ہوتا ہے۔

عمومی طور پر، سردار اپنے فرقے یعنی سردار خیلوں کے علاوہ کسی اور سے رشتہ نہیں کرتے۔لہٰذا سردار اپنی بیٹی دوسرے قبیلے کے سردار کو ہی دے گا۔البتہ وہ عام قبائل حتیٰ کہ غیر بلوچ اور نچلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درجے کی لڑکی بیاہ لانے کوکوئی حرج نہیں گردانتے۔

ابھی حال تک سردار کی اپنی جیل ہوا کرتی تھی۔ جہاں قبائلی دستور توڑنے اور سماج دشمن عناصر کو انتہائی وحشیانہ اور غیر انسانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہاں قیدیوں کو لکڑی کی شہتیر (کاٹ) میں ڈال دیا جاتا تھا۔ قیدی کو اپنے خوراک کا خود بندوبست کرنا ہوتا تھا، یا اسے وہاں کے لوگ خیرات کے بطور کھانا دیتے تھے۔

سردار کا اپنا لیویز کا نظام تھا۔ ان لیویز والوں کو ''سردار کے سوار'' کہا جاتا تھا۔ لیویز والا بہت اختیارات رکھتا تھا۔ اس کے پاس موجود سردار کی مہر لگی چھڑی اُسے ناقابلِ گرفت بنا دیتی تھی۔ وہ صرف احکامات کی تعمیل ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ بہت سے احکامات خود سے بھی جاری کرتا تھا۔ یہی سوار قدیم آریہ زمانوں میں جنگوں کے وقت لڑنے والوں میں ہوتا تھا، اور امن کے زمانے میں پولیس مین۔(3)

بلوچوں کے سرداری نظام کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے سردار کی عزت اور احترام بہت کرتے ہیں، عقیدت کی حد تک۔ یہ مستقل اور بے انداز احترام محض سیاسی و سماجی وجوہات سے نہیں ہوتا اور نہ ہی سردار کے جاہ وجلال واقتدار وکرسی کی وجہ سے اسے نصیب ہوتا ہے بلکہ یہ احترام روحانی ہوتا ہے۔ قبائل کے نزدیک سردار اللہ کا برگزیدہ اور پسندیدہ شخص ہے، تبھی تو اسے اتنی طاقت عطا کر دی گئی ہے۔ بلوچ اپنے سردار کے ولی اور باکرامت ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور قلب کی اتھاہ گہرائی سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ سردار کی حکم عدولی اور دل شکنی، نقصان پہنچاتی ہے۔ سردار کو غائبانہ طور پر بھی کچھ کہا یا محض اس کا برا سوچا بھی ہو تو عزرائیل آ کر مویشی کو کسی بیماری کے بہانے مار جاتا ہے، یا ہوا یا بارش فصل کو تباہ کر سکتی ہیں۔ اولاد کو پولیو دبوچ لیتا ہے، یا مرگی کا مرض بیوی کو چپک سکتا ہے اور بدبختی اولاد کے حصے میں لکھی جاتی ہے۔ قبائل کے پاس سیکڑوں ایسی مثالیں، ایسی حکایتیں ہیں، جن میں سردار کے خلاف سوچنے والے کو قدرت کی طرف سے مندرجہ بالا عبرت ناک سزاؤں میں سے کوئی مل چکی ہے۔ یہی مثالیں، یہی حکایتیں، سرادری نظام کو نظریاتی بقا بخشتی ہیں۔

بلوچ رواج میں سردار یا اس کے خانوادے کے کسی فرد کا خون بہا عام آدمی کے خون بہا سے چار گنا زیادہ ہے۔ وڈیرہ کا عام آدمی سے تین گنا۔ پیپرسن نے پچھلی صدی میں مری قبیلے میں مروج خون بہا کے نرخ کو یوں بیان کیا:

سردار یا کوئی بھاولاں زئی............8000 روپے

وڈیرہ.............................4000 سے لے کر 7000 روپے تک

عام مری...........................2000 روپے (4)

بلوچوں میں سردار کا مقام بہت اونچا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ سردار موروثی نہ تھا بلکہ قبیلے کا سب سے اچھا آدمی ہوتا تھا جس میں بلوچیت کی تمام خوبیاں موجود ہوتیں۔ سردار قبیلے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا۔ ایک بلوچ شاعر نے کہا تھا؛

آں مڑد کہ راجانی سرنت
لوغ کانڑنش آفی بہنت
فیضاں ہزار قوم اش گرنت

ترجمہ:
وہ اشخاص جو قوموں کے سربراہ ہیں
ان کے گھر معدنی خزانے کی طرح ہیں، میٹھے چشمے کی مانند ہیں
ہزاروں لوگ ان سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے تو وہ عوام الناس کی توجہ اور تعریف وتوصیف کا مرکز تھے۔ لفظ ''سردار'' درآمد شدہ لفظ ہے جو کہ نصیر خان اول کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل بلوچ عوام سردار کے بجائے لفظ ''میر'' استعمال کرتے تھے۔(5)

واضح رہے کہ یہ سارا کام نجی ملکیت کے وجود میں آنے کے بہت بعد شروع ہوا۔ پہلے تو لوگوں کا اجتماع ہی سردار کو منتخب کرتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بہادر ہو، مہم جو ہو، پرعزم ہو، سخی اور فیاض ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلوچ قبائل میں رفتہ رفتہ سرداریت ایک موروثی عہدہ بن گئی۔ بالخصوص انگریز کے آنے کے بعد۔یعنی سردار کی موت پر اس کا بڑا بیٹا اس کا وارث بن جاتا ہے، لیکن اگر وہ ماں کی طرف سے بلوچ کے سماجی حیثیت کی برابری والی عورت نہ ہوتو اس کے انتخاب کا سوال اچھا خاصا متنازعہ ہوجاتا ہے۔(6)

جیسا کہ بتایا گیا کہ عوام اپنے سردار کو زبردست عزت وتوصیف بخشتے تھے۔اور اس کے نسب کے بارے میں اعلیٰ ارفع روایتیں بناتے ہیں۔ ہر قبیلے کے سردار کے حسب نسب میں آپ کو کہیں نہ کہیں مافوق الفطرت اور معجزاتی باتیں ضرور ملیں گی۔ مثلاً مری قبیلے کا سردار، گزینی کے ذیلی فرقے سے ہے۔اب یہاں عوام الناس خوبصورت انداز میں گزینی کو پیش کرتے ہیں۔وہ گزینی کے شجرہ کو میر جلال خان کے نواسے ''گزین'' تک لے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گزین بلیدی تھا جس کا باپ آ کر بجار کا ''باہوٹ'' ہوگیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ گورگیژ تھا۔ میں نے جب معمر، محمد خان پیرداداڑیں سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے جو آرٹسٹک روایت بیان کی، اس سے قارئین کو محظوظ کرانا بہت ضروری ہے؛

''گزین کے باپ کا ایک ریوڑ تھا۔ اس نے بجار سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں تک پناہ میں رکھ سکتے ہو؟ بجار نے کہا میں تمہیں ماوند تک سفید، مورانی، گواثانی، بجاروڈ اور کاہان تک پناہ میں رکھ سکتا ہوں۔تم اپنا ریوڑ چراؤ، تمہارے حقوق سلب کرنے نہیں دوں گا۔تب وہ شخص بجار کے ساتھ ہمساخ (پناہ گزیں) کے بطور رہنے لگا۔ کاہان میں درندے بہت ہوا کرتے تھے۔گز کے درختوں کے بڑے بڑے جنگل تھے۔ جن میں گورپٹ نامی درندے ہوتے تھے۔ چیتے اور شیر بھی، جو انسانوں سے لڑتے تھے۔ کاہان میں لوگ جنگل میں مویشی نہیں چراتے تھے بلکہ پہاڑیوں میں لے جاتے تھے۔

''ایک ڈور (جوہڑ) میں پانی تھا۔ اُس شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہمارے کپڑے میلے ہورہے ہیں۔تم جا کر انہیں دھوڈالو، میں وہاں آ کر مویشی چراتا ہوں تمہاری نگہبانی بھی کروں گا۔ ورنہ درندے کھا جائیں گے۔ وہ جب کپڑے دھورہی تھی تو وہاں سے چار عظیم درویش

گزرے۔ایک نے کہا: ''ساتھیو، میرے کپڑے بہت میلے ہوگئے ہیں۔ میں اس عورت سے اپنے کپڑے دھلواؤں گا۔ یہ چار درویش دراصل ''چہار یار'' تھے۔ایک شہباز قلندر تھا۔ ایک غوث بہاء الحق تھا۔ ایک کا نام شیر شاہ سید جلال تھا اور ایک کا نام شیخ فرید تھا۔

''خاتون نے اس کے کپڑے دھودیے۔ درویش نے گڑ کا ایک ٹکڑا عورت کو دیا کہ اپنی بیٹی کو کھلا دے وہ اسے کھا کر الٹی کردے گی۔ قے میں ایک بیٹا بھی ہوگا۔ وہ تم لوگوں کے لیے سات پشت تک بادشاہی لائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی نے قے میں ایک بیٹا اگل دیا۔ عورت نے گز کی ٹہنیاں کاٹ کر بچھادیں اور بچے کو ان پر رکھ دیا اور روتی ہوئی بھاگ کر شوہر کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ ہم تباہ اور بدنام ہوگئے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ شوہر نے کہا ''نہیں، جا کر اسے لائیں گے''۔ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ گز کے درخت کے نیچے بچہ لیٹا ہوا ہے۔ اسکی ٹہنیوں سے دودھ ٹپک ٹپک کر بچے کے منہ میں گر رہا ہے۔ (یوں گز کا درخت اُس بچے کو اپنا دودھ پلا رہا تھا)۔ اسی ''گز'' سے گزینی بنا۔ اور انہی کی سرداری ہے مری قبیلے پر سات پشتوں سے۔ درویش نے کہا تھا کہ جب بیٹا ہو تو ہر سال ایک اونٹ کی قربانی دو۔ اب بھی باولہاں زئی ہر سال ایک اونٹ غوث بہاء الحق کو دیتے ہیں''۔

مزاری سردار حادثاتی طور پر شیر کا پیشاب پینے سے پیدا ہوا۔ کسی کا خاندان آگ، سورج یا چاند سے پیدا ہوا۔ یا وہ سیدھا سیدھا آسمان سے اچانک زمین پر نمودار رہا ہوا۔ بہرحال ظاہر یہ کرنا تھا کہ وہ خدا کا محبوب بندہ ہے اور یہ سرداری یا پیری اسے خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس تصور کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ لوگوں میں اس کی عظمت کا قصہ پھیل جائے، خود وہ اور اس کے خاندان کی حیثیت مضبوط ہوجائے تاکہ سماج کا کوئی فرد ان کے خلاف کسی بھی قسم کی بغاوت کا خیال بھی نہ لاسکے اور نہ کسی دوسرے کو حکمرانی کی خواہش پیدا ہوسکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کی عظمت، دھاک اور کرامت لوگوں کے دلوں میں سختی کے ساتھ جاگزیں ہوتی ہے اور ''ان کے خاندان کے خلاف کسی قسم کی بغاوت ایک گناہِ عظیم تصور ہوتی ہے۔''(7)۔

سردار سے متعلق دوسری رسومات بھی مذہبی یا روحانی تقدس میں لپٹی ہوتی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مثلاً بگٹیوں میں نئے سردار کے سر پر دستار کا پہلا پیچ پیر سہری کے مزار کا مجاور (جسے سردار پیروزانی وڈیرہ کی مشاورت سے مقرر کرتا ہے) باندھتا ہے۔ دوسرا پیچ سخی سرور کے دربار کا مجاور، بشرطیکہ وہ اس موقع پر ڈیرہ بگٹی میں موجود ہو، باندھتا ہے۔ اس کے بعد سردار کے خاندان کے بزرگ شخص کی باری آتی ہے۔ اور پھر راہیجہ کی ذیلی شاخوں کرمانزئی، سوبھازئی، مندوانڑیں، اور قاسمانڑیں وڈیرے دستار بندی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد قبیلے کی شاخوں کے وڈیرے مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ بیعت کے بطور اس کی دستار بندی کرتے ہیں؛ لپر، مسوری، پیروزانی، نوثانڑیں، شمبانڑیں، موندرانڑیں، نوحقانڑیں، کیازئی، سیذ یانڑیں، ہندو، مریٹہ۔(8) آپ اندازہ کریں کہ اگر پیر سہری کے مزار کا مجاور موجود نہ ہو تو دستار بندی ملتوی کی جاتی ہے۔

بلوچوں میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ سردار کا گھرانہ تقریباً ہر قبیلہ میں تعداد اور قوت دونوں اعتبار سے نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔ مری کا باولہاں زئی، مکران کا گچکی، خاران میں نوشیروانی سب پر یہ دلچسپ کلیہ لاگو ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ رئیسانی، زرکزئی، مینگل، رند، بگٹی حتیٰ کہ خود بلوچوں کا مشترکہ خان، تعداد میں چھوٹے سے قبائلی فرقوں سے ہیں۔

المختصر، بلوچستان میں قبیلہ کا مطلب ہے، چیف کے تحت مضبوطی سے گرہ دیا ہوا گروپ۔(9)

حوالہ جات

1۔ایماڈنکن۔صفحہ۔136
2۔عطائی، ابراہیم۔ڈکشنری۔صفحہ 9
3۔پیہرسن۔صفحہ 71
4۔مزاری، شیر باز۔A Journey to disillusionment آکسفورڈ یونیورسٹی پریس xxxi
5۔بزنجو، غوث بخش۔تحریک آزادی کا ایک باب۔طاہر بزنجو کی کتاب ''بابائے بلوچستان'' سیلز اینڈ سروسز

کوئٹہ 1999۔صفحہ 34
6۔مبارک علی۔بازار اور دوسرے مضامین۔1988۔نگارشات لاہور۔صفحہ 64
7۔ارباب، محمد جہانگیر ''میریٹل رول پیٹرنز ان مسلم سوسائٹی۔پاکستان سٹڈیز، ریسرچ جرنل یونیورسٹی آف بلوچستان۔1990۔جلد نمبر 1۔صفحہ 71
8۔بگٹی، عزیز۔بگٹی قبیلہ۔2005۔قلات پبلشرز کوئٹہ۔صفحہ نمبر 101
9۔لیون، اناتول۔Pakistan, A Hard Country 2011۔پنگوئن۔صفحہ 39

www.iqbalkalmati.blogspot.com

3- قبائلی اور علاقائی اتحادیے

قبائل کی ساخت میں شکست وریخت صدیوں سے چلی آرہی ہے۔کوئی بھی بلوچ قبیلہ ایسا نہیں ملے گا جس کا کوئی حصہ نکل کر کسی دوسرے قبیلے میں شامل نہ ہوا ہو۔ یا کسی اور قبیلے کا کوئی ٹکڑا اُس میں آکر نہ ملا ہو۔ ہرٹکر، باہر سے آنے والے ایک یا ایک سے زیادہ امیگرنٹس کے آن شامل ہونے سے تشکیل پاتا رہا ہے۔اوران کا اتحاد یہ مشترکہ دکھ سکھ اور مشترکہ ''شادی غم'' کے فلسفے سے جنم لیتا ہے۔شجرہ والے ''اصلی'' گروہ اور نئے آنے والے گروپ باہم جذب ہوجاتے ہیں اور مشترک دکھوں سے نمٹتے ہوئے، اوراسی طرح مشترک مسرتوں سے مسرور ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک بھائی چارے والی فضا تشکیل کرتے ہیں۔یہ ایک آدھ دن کا پراسیس نہیں ہوتا۔اس میں سالہا سال لگتے رہے ہیں۔گوکہ بلوچوں کے قبیلوں میں ہرفرقہ خود کو اعلیٰ وارفع ،اصلی بلوچ اور بہت ہی مقتدر ماضی کا حامل جتاتا ہے مگر اصل میں کوئی کسی سے، کسی صورت افضل نہیں ہے۔سارے قبائل کی تشکیل اسی ''شادی غم'' کے پراسیس میں ہوئی ہے۔ یہ بات بھی تفصیل کے ساتھ پہلے ہی بیان کی جاچکی ہے کہ ٹکر کے اسی مرکزیہ نے نئے آنے والوں اور ''ہمسایہ'' کو اپنے میں جگہ دی، انہیں چراگاہوں تک رسائی بخشی اور دکھ سکھ میں شریک ہونے والے ان نوآمدہ لوگوں کو علاقے بخش دیے اور وہ رفتہ رفتہ اسی قبیلے کا ایک فرقہ اوراس طرح مکمل اور سند یافتہ ،معزز ومحترم بلوچ بن گئے۔ اللہ ہمیشہ بلوچوں کو معزز ومحترم رکھے۔

سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قبیلوی اتحاد ختم ہوجانے کا پراسیس بھی چلتا رہا، ایک اور بلند واعلیٰ تنظیم کی تشکیل کرنے۔اس قبیلوی اتحاد نے ختم ہوکر جس نئ تنظیم کی تشکیل کی وہ ہے، علاقائی اتحاد۔ دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ سرداروں کے سیاسی اوراقتصادی اقتدار کے مضبوط ہوجانے سے فیوڈل رشتے مضبوط تر ہوتے گئے۔ فیوڈل کی زمینیں، اس کی چراگاہیں اوراس کے مویشی بڑھتے چلے گئے۔ان کی معاشی قوت کے بڑھ جانے سے اچھی زمینوں پر قبضہ کرنے کی اس کی اہلیت بھی بڑھتی گئی۔ پھر موروثی حکمرانی نے تو اس کو مطلق قوت بناڈالا۔

قبائل کی اس دائمی شکست وریخت کے عام انسانی اسباب بھی ہیں۔مگر بلوچ کے ہاں کے اس مظہر کی وضاحت بھوک کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی ہوسکتی ہے؛ وہ ہے قبائلی جنگیں۔ یہاں دائمی جنگ وجنگی حالت یعنی یورش وحملہ نے کسی بھی قبیلے کو سابقہ قبیلے کی حالت میں رہنے نہ دیا تھا۔جنگیں انسانی حیات کا دشمن ہوتی ہیں۔حیات انسانی کے اس دشمن کے سبب قبیلہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا تھا۔یہی سبب ہے کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے افراد کو اپنے اندر بخوشی قبول کرلیا کرتا تھا۔ یہ گنجائش ہی نہ تھی کہ نوآمدہ کی نسل اور رنگ کے بارے میں سوچا جاتا۔اس لیے کہ تفریق کے یہ پیمانے تو پرامن حالات کی بدبخت خصوصیت ہوتی ہیں۔اُس زمانے میں جنگیں ہی جنگیں تھیں۔کوئی یہ منحوس سوال نہیں کرسکتا تھا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ کونسی زبان بولتے ہو؟ اور لباس کس طرح کا پہنتے ہو؟۔ ہروہ شخص اپنا ہوتا تھا جو قبیلے کے سود وزیاں کا شریک بنتا۔ ہرنوآمدہ شخص لشکر میں جاملا، قبیلے کی جنگ میں حصہ لیا، فتح پائی، غنیمت بانٹا، اور پھر دوبارہ تلاشِ معاش کے لیے ایک اورقبائلی جنگ کے لیے روانگی ہوئی۔اب اس سارے عمل میں شناختی کارڈ کی ضرورت کہاں تھی۔اوراس کے لیے فارم ''اے'' اور ''بی'' پرکرنے کی فرصت کہاں تھی؟ انہی جنگی بحرانوں میں مختلف نسلوں، اور زبانوں کے لوگ دوسرے قبائل میں آن ملتے رہے اور قبیلے میں جذب ہوتے رہے۔ یہاں شادی بیاہ اور رشتہ داریاں کرتے رہے اور بلاآخر قبائلی مشترکہ زمین اور چراگاہ کا حصہ دار بن کر ہرطرح کی قبائلی ذمہ داریوں کے شریک اور مالک بن گئے۔(1)

ہم اصل نقل کے چکر میں نہیں پڑیں گے اس لیے کہ یہ عمل ایک اورقسم کے شاؤنزم کو جنم دینے کا موجب بنے گا۔ ہروہ شخص ''اصلی'' اور ''سُچا'' بلوچ ہے جو پیداواری عمل میں حصہ لیتا ہے۔ باقی پیمانے تو بس فکری کج روی کے لیے بنائے گئے ہیں۔مگر اس فکری منافقت کو دور کرنا ہی تو ضروری کام ہے۔جس کے تحت ''صاف خون''، ''صاف نسل'' اور ''صاف قوم'' کی بے بنیاد تھیوری گھڑ لی گئی ہے اور جس کی آڑ میں نسلی منافرت اور فرقہ واریت کے جھگڑوں میں الجھا کر لوگوں کو ان کی طبقاتی قومی جدوجہد سے دور کرلیا جاتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرد ایک مقتدر قبیلہ ہے مگر مزاری بلوچوں میں بھی ایک ذیلی شاخ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی نام سے موجود ہے۔(2) اسی طرح بلیدی قبیلہ کی ایک شاخ ''کوش'' ہوا کرتی تھی۔ رند و لاشار لڑائی میں اس شاخ نے بہادری کے اعلیٰ مظاہرے کیے تھے اور بے جگری سے لڑنے کے جوہر دکھائے۔ چاکر نے ان ''گوشوں'' کو اس کے صلہ میں کچھ اراضیات اور دریائے ناڑی کے کالے پانی کا تیسرا حصہ بطور انعام بخش دیا جو آج تک ان کے تصرف میں ہے۔ ''گوش'' اب بلیدی کی بجائے نحِک قبیلے کا حصہ ہیں۔(3)

مری جو دراصل بجارانی تھا۔ گزینی اور لوہارانی کے آن ملنے سے عظیم الشان قبیلہ بنا۔ خود بجارانی میں باہر سے آنے والے اور چنانچہ اسے مضبوط بنانے والے عظیم قبیلوں میں سے رامکانی، کلوانی، اور شاہیجہ آئے۔ عظیم پوادی قبیلہ کوہِ سلیمان سے نعمت بن کر آیا۔ اور حالیہ زمانوں میں قیصرانی بھی کوہِ سلیمان کی وسعتیں سمیٹ کر مری میں آن بسے۔ چانڈھے بعد میں آ کر اس اتحادیہ میں شامل ہو گئے۔ جادا خان اور ولیل سالارانی نے اپنے قبیلے میں نو آمدہ لوگوں کے بارے میں مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے ''سالارانی میں مزاری بلوچوں سے بابیانی آن کر شامل ہو گئے۔ موسیٰ زئی بھی نو آمدہ ہیں۔ شیر خان زئی علاقہ باڈور سے سالارانی کا حصہ بنے ہیں۔ سیلاچی حسنی بلوچوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ رندھاں زئی بھی بعد میں سالارانی کا حصہ بنے، بڑیانی لوگ ونڑیچی پٹھانوں میں سے آ کر سالارانی، مری اور بلوچ بن گئے''۔ کنگرانی مری میں دو ذیلی فرقے ہیں۔ جن کے نام بزدار اور کھوسہ ہیں، جبکہ انہی دو ناموں سے بلوچوں کے الگ الگ بڑے بڑے تمن بھی موجود ہیں۔ سومرانی مری میں گوائبہرام زئی اور سومرازئی باہر سے آ کر شامل ہوئے۔ قلندرانی مری میں ڈانگیانی، گریانی، شیلاچی، محبتانی، مصری زئی، ملگزارزئی اور میاں خان زئی بعد میں آ کر شامل ہوئے۔ شیرانی، ژوب کے پشتون بھی ہیں اور مری کا ایک معزز قبیلہ بھی ہے۔ خراسان کے بلوچ آ کر مری میں بڑانی بن گئے ہیں۔ یہی بڑانی ڈیرہ غازی خان میں ایک الگ قبیلہ بھی تشکیل کرتے ہیں۔ مری کے مزارانی میں بہت سارے کھیتران عناصر شامل ہیں۔(4) ژنگ بھی بعد میں مری میں شامل ہوئے۔ پیکولین بتاتا ہے کہ میھکانی مری دراصل زرکون ہیں۔ اسی طرح حسنی نے مری قبیلے کو بے شمار لوگ عطا کیے۔ حسنی بلوچ کوہ سلیمان کے جنوبی دامن میں آباد تھے۔ یہ قبیلہ خود بھی

بہت سے بلوچ اور ہندی آریائی عناصر سے مل کر بنا ہے۔

یہ سب مخلوط اور مختلف القبائلی گروہ مری نامی بلوچ اتحادیہ میں شامل ہوتے گئے اور آج ''مری'' کے مشترکہ ٹائٹل تلے زندگانی گزار رہے ہیں۔(5) مری قبیلے کے ایک بزرگ اور تاریخ دان جناب محمد خان پیر دادانی کا بیان ہے کہ اس کے قبیلے پیر دادانی میں ایک قبیلہ ہے مکرانی، جو کیچ سے آیا ہے۔ جروار مری دراصل لیغاری تھے۔ کچ کا درکانی دراصل گورشانی ہے جو کوہِ سلیمان سے مری میں در آیا اور اب بجارانی میں شامل ہیں اور قلندرانی کے ساتھ ان کا سود و زیاں مشترک ہے۔ مری کا لانگھانی فرقہ ہندی نژاد ہے اور ملتان سے آیا ہے جو ایک زمانے میں سبی کے حاکم تھے۔ مری قبیلے کا شاھیجہ اور ہندی قبیلہ شاھوجہ کئی علما کی نظر میں ایک ہی ہیں۔(6) 19 ویں صدی کی ساتویں دَہائی میں مری کے صرف 22 ٹکر (ذیلی فرقے) تھے۔ وہی مری 20 ویں صدی کے شروع میں 35 ٹکر تک بڑھ گیا۔(7)

حسنی بلوچوں نے شاذیھان مری سے شکست کھا کر کھیتران کے ہاں پناہ لی اور اب اس کے اتحادیہ کا حصہ ہیں۔(8) کھیتر انوں کا ایک حصہ ناھڑ ہے جو شکل وصورت اور تاریخی لحاظ سے باہر سے آئے ہیں۔

بگٹی قبیلہ بھی بعد میں بتدریج دوسرے بلوچ حتیٰ کہ غیر بلوچ قبیلوں کے مہاجروں یا پورے کے پورے گروہوں (مثلاً ڈومبکی قبیلہ کے چاکرانی گروہ) کے جذب ہو جانے سے وسعت پا گیا۔ ممتاز محقق اکبر ایس احمد کے مطابق مسوری خالص ہندی نسل سے متعلق ہیں۔(9) اس کی اِس بات سے مکمل طور پر تو اتفاق نہیں کیا جاسکتا مگر یہ بات صحیح ہے کہ ان کا ایک حصہ ہندی نسل کا ضرور ہے۔ پیروزانی قبیلہ کو بگٹی کے دیگر فرقے یعنی شلوانی، راھیجہ اور نوثانی سے علیحدہ شدہ چھوٹے گروہ تشکیل کرتے ہیں۔ شمبانی بگٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل مگسی قبیلے سے آئے ہیں۔

ڈومبکی کے اندر ہندی مہاجروں کی بڑی تعداد شامل ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ اس قبیلے کے زیادہ فرقوں کے نام ہندی ہیں۔ مثلاً بھانڈ، براھمانی وغیرہ۔ ڈومبکی نے کھیری کو سندھ میں دھکیل کر اور اس کے باقی ماندہ لوگوں کو اپنے اندر جذب کر کے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جلکھرانی جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آ ج ایک خودمختار، نامور بلوچ قبیلہ ہے۔خودابھی 1845 میں ڈومبکی قبیلہ سے جدا ہوگیا۔(10)

اب ذرا مگسی قبیلہ کو دیکھئے ۔اس قبیلے میں چھوٹے فرقوں کی تعداد انیسویں صدی کے شروع میں پٹنگر نے پندرہ بتائی تھی جو اُسی صدی کے آخر میں بڑھ کر 55 بن گئی۔معلوم نہیں کتنے کتنے لوگ آن کراس میں شامل ہوتے گئے۔

لیغاری خود ایک بہت بڑا قبیلہ ہے۔مگر تالپور کا نام لیغاری سے زیادہ مشہور اور معروف ہے۔حالانکہ یہی تالپور،لیغاری قبیلے کی محض ایک شاخ ہے۔یہی تالپور انگریز سے قبل پچاس برس تک سندھ پر حکومت کرتے رہے۔(11) اسی طرح آلیانی بھی لیغاریوں کا ایک ذیلی قبیلہ ہے اور اسی نام سے مری قبیلے کا ایک فرقہ بھی موجود ہے۔جروار مری میں بھی ایک فرقہ ہے اور کھوسہ کی ایک شاخ بھی۔عیشانی کھیتران بھی ہیں اور کھوسے بھی۔جسکانی ایک الگ قبیلہ بھی ہے اور گورشانی کا ذیلی فرقہ بھی۔لاشاری ایک الگ تمن بھی ہے۔اور گورشانی کی ذیلی شاخ بھی۔

بزنجو قبیلہ جو مقامی طور پر ''بیـــنـــجـــو'' کہلاتا ہے دراصل چار قبیلوں کا وفاق ہے؛ حملاڑی،تمراڑی،عومراڑی (عومراڑی ایک الگ قبیلہ بھی ہے پٹ فیڈر میں) اور سیاہ پاد (سیاہ پاد خاران میں ایک الگ قبیلہ ہے)۔(12)

ان سارے دلائل سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی قبیلہ،کوئی شاخ ''اصلی تے وڈا'' اور ''خالص وسچا'' نہیں ہے اور نہ ہی ہم بلوچ، یا بلوچوں کے قبیلے، یا قبیلوں کے فرقے محض ایک فرد واحد کی اولاد ہیں۔بلکہ ہم دیگر زندہ انسانی سماجوں کی طرح بہت سے عناصر اپنے اندر جذب کرتے رہے ہیں اور دوسروں کی ساخت میں بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔

چنانچہ تمام بلوچ اور غیر بلوچ قبیلے دوسرے افراد کو شامل کرتے رہنے کی آسان شرائط کی بدولت پچھلے سوڈیڑھ سو برسوں میں اپنی تعداد بہت بڑھا چکے۔

حوالہ جات

1۔گورڈن،ٹی باؤلز۔دی پیپل آف ایشیاء۔1977۔ویڈن فیلڈ اینڈ نکلسن،لندن۔صفحہ 154

2۔لاشاری۔مظہر علی خان۔بلوچ تاریخ کے آئینے میں۔2001۔
علم وعرفان پبلشرز لاہور۔صفحہ 30

3۔ایضاً صفحہ نمبر 69

4۔پیکولین۔صفحہ 186

5۔گنکوفسکی۔پاکستانی قومیتیں۔صفحہ 156

6۔اکبر ایس احمد۔در کتاب Marginality And Modernity۔صفحہ 56

7۔پیکولین۔صفحہ 188

8۔لیغاری،عبدالقادر۔تاریخ ڈیرہ غازیخان۔جلد دوئم۔صفحہ 11

9۔اکبر ایس احمد۔....Trail by صفحہ 56

10۔پیکولین۔صفحہ 72

11۔پیکولین۔صفحہ 74

12۔بزنجو،غوث بخش۔تحریک آزادی کا ایک باب۔طاہر بزنجو کی کتاب ''بابائے بلوچستان''سیلز اینڈ
سروسز کوئٹہ 1999۔صفحہ 35

www.iqbalkalmati.blogspot.com

4۔ بلوچ قبائلی جنگی معیشت

جنگ بلوچوں کا من پسند مشغلہ بالکل نہیں رہا، یہ مجبوری تھی۔ یہ بدبخت فعل دوسری قوموں کی طرح بلوچوں کی بھی معیشت کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ سرقبیلوی نظام میں شکار کے جانور، اور گھروں میں سدھائے ہوئے جانوروں پہ جنگیں ایک معمول ہوا کرتی تھیں۔ بقول ڈائر'' قبائل درحقیقت لوٹ مار پر گزارہ کرتے ہیں'' (1)۔ اس لیے اُس دور میں سارا توقیر، سارا احترام جنگ کو حاصل تھا۔ اولیور لکھتے ہیں کہ ''حتیٰ کہ (جنگ کے مقابلے میں) زراعت بھی نیچ ہے اور آرٹ وفن کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لکھنے کا فن تو حقارت سے بھی نیچے کا درجہ رکھتا ہے''۔(2) ویسے بھی انسانی تاریخ میں معیشت کا جو بھی وسیلہ ہوتا ہے، اور روزی دینے والا جو بھی پیشہ ہوتا ہے، وہی ہمیشہ انسان کے لیے احترام کا باعث رہا ہے۔

بلوچ جب مالِ غنیمت والی جنگوں پر جاتے تھے تو حاصل شدہ سارے مال ومتاع کی قیمت لگا کر لڑائی میں شامل افراد میں تقسیم کرتے تھے۔ سارے مال کا پانچواں حصہ یعنی ''پنچک'' جنگ کے کمانڈر (یا پھر سردار) کو دیا جاتا تھا اور بقیہ میں سے جنگ میں شامل ہر فرد کا ایک حصہ، اس جنگ میں شامل لوگوں میں کوئی اگر گھوڑے پر ہوتا تو اس کے گھوڑے کا ایک حصہ اور اگر کسی کے پاس بندوق ہوتی تو نصف حصہ مزید دیا جاتا تھا۔ قبیلہ کی طرف سے جاسوسی کرنے والے (چاری) کو دو حصے دیے جاتے تھے، اس لیے کہ اس کے کام میں رسک بہت تھا۔(3) اگر وہ جنگ میں مارا جاتا تو اس کا نصف حصہ اس کے رشتے داروں کے حوالے کیا جاتا تھا۔

لوٹ مار کے سارے مال کی قیمت بیل کی اکائی پر مقرر کی جاتی تھی۔ ایک گھوڑی چار گائیوں کے برابر تصور کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ گھوڑی جنگ میں بہت کارآمد ہوتی تھی جبکہ جنگی ماحول میں گائے تو بہت بے کار اور حقیر جانور ہوتی ہے۔(4)

چپاؤ (جنگ) میں حصہ نہ لینے والے کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ اُس کے لیے ایک حقیر سا لفظ استعمال کرتے تھے جسے اردو جیسی میدانی زبان میں لکھنا نا مناسب لگتا ہے۔ بلوچ اپنے کوڈیا

رواج کو استحکام ودوام بخشنے کے لیے بہت ساری مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ایک دفعہ مری کا لشکر مال لوٹنے کی خاطر جنگ میں گیا تو ان کا مشہور جنگجو کمانڈر دلیل ساتھ نہ تھا۔ وہ دلیل جو صرف اپنی بہادری اور جنگی مہارت کی بدولت غنیمت کا پنچک لیتا رہتا تھا۔

اِدھر جب قبیلے کے بہادر جنگ میں گئے ہوئے تھے تو دلیل اپنے ساتھیوں سمیت علاقے میں گھوم پھر رہا تھا جہاں اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت کسی قبر کے پاس بیٹھی آہ فریاد کررہی ہے۔ قبر کافی پرانی تھی اور دلیل کو شک پڑا کہ غالباً یہ قبر نہیں ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس بڑھیا کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ اور پھر جب قبر کھدی تو اس میں خزانہ چھپا ہوا تھا۔ دلیل نے خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اُدھر جب مری لشکر چپاؤ سے واپس لوٹا تو انہوں نے دلیل کو رواج کے مطابق حصہ دینے سے انکار کردیا۔

دلیل نے کہا ''اچھا، تمہارا حصہ تمہارا، اور میرا حصہ میرا''۔

مری جنگجوؤں کو شک گزارا کہ یقیناً دلیل کے پاس ''آوار'' (غنیمت) ہوگا۔ اس لیے انہوں نے کہا: ''نہیں، ہمارے مال میں آپ کا حصہ ہے اور آپ والی دولت میں ہمارا''۔ چنانچہ دلیل کو اپنا سونا چاندی اس لیے بانٹنا پڑا تاکہ جنگ میں حاصل کردہ فضول اشیا میں حصہ دار بن سکے۔ بات مال کے قدر کی نہ تھی، بات جنگ میں غنیمت والے مال میں حصہ کے اعزاز کی تھی۔ اس طرح پہلی بار ایک بہادر بلوچ نے جنگ میں شامل نہ ہو کر بھی، اپنا حصہ لے لیا۔ جنگی قوانین میں یہ ایک غیر معمولی ترمیم تھی۔

بلوچوں کے تقریباً ہر قبیلے میں، مری قبیلے کے میہکانڑیں فرقے کی طرح، ایک کرامت والا گھرانا ہوتا ہے جو اپنی روحانی طاقت کے بل پر دشمن کا مقابلہ کرتا تھا اور دشمن کے جادو کو بے اثر کرنے کے علاوہ خود اُن پر اپنی کرامت کے ذریعے حاوی ہوتا تھا۔ وہ اپنی کرامت کے ذریعے دشمن کی بندوقیں جام کرتا تھا یا ان کی تلواروں کے ساتھ تیغ بندی کرتا تھا۔ اس لیے اسے بھی حصہ ملتا تھا۔ اس کو جنگ کے میدان سے ہمیشہ دور، ایک تیر کش کے فاصلے پر رکھا جاتا تھا تاکہ وہ خود دشمن کے ہتھیاروں سے بچا رہے۔ اس لیے کہ قبیلے کے روحانی کمانڈر کے زخمی ہونے یا مرنے کی صورت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں جادو ٹوٹنے اور قبیلے کو شکست ہونے کا خطرہ ہوتا۔

قبیلے کے سردار کو بھی جنگ سے دور رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح دستار بند وڈیرہ اور قبیلے کا قومی شاعر بھی جنگ کی حد سے باہر رکھے جاتے تھے۔ سردار اور وڈیرے جنگی کونسل کا کام دیتے تھے۔ وڈیرہ اپنے سیکشن کا بڑا ہوتا ہے اور اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے۔ اس کا سیکشن اس پہ دستار بندی اسی طرح کرتا ہے جس طرح کہ پورا قبیلہ اکٹھا ہو کر سردار پر دستار بندی کرتا ہے۔ اس لیے وہ ''قبائلی ہیرارکی'' میں اہم عہدیدار ہوتا ہے۔ وڈیرہ کے ساتھ کبھی کبھی ''مقدم'' بھی ہوتا ہے۔ جو اس کے ایگزیکٹو افسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ وڈیرہ کے احکامات ذیلی شاخوں کے معتبروں تک پہنچائے۔ مقدم کا عہدہ موروثی نہیں ہوتا۔(5)

جنگ کے زمانے میں وڈیرہ کی ڈیوٹی تھی کہ مقرر کردہ فارمولے کے تحت اپنے لوگوں میں سے جنگجو جمع کر کے روانہ کر دے۔ وہی اپنی مہیا کردہ نفری کے لیے پلٹون کمانڈر مقرر کرتا تھا۔ اس طرح قبیلوں کا مکمل طور پر ایک ورکنگ سسٹم اور نیٹ ورک موجود ہوتا تھا۔ فرد سے سفید ریش تک اور سفید ریش سے معتبر اور مقدم تک، مقدم سے وڈیرہ اور پھر سردار تک۔ یہ سارا نیٹ ورک جنگی ماحول اور اس کے تقاضوں کے مطابق بنا ہوا ہے۔ یہی جنگی قبائلی تشکیل آج کے فیوڈل بلوچستان میں اب تک جاری ہے۔ یہ اس قدر مضبوط اور گہری جڑوں والا ہے کہ زرعی اتحاد یہ آج تک اس کا مکمل متبادل نہ بن سکا۔

جنگی قواعد و ضوابط

جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جنگ اور اس کی کوئی کارروائی کبھی اصول و ضوابط سے باہر نہیں ہو سکتی تھی۔ چونکہ بلوچ جنگ کا اسپیشلسٹ ہے اس لیے اس کے جنگی قوانین بہت باریک اور مفصل ہوتے ہیں۔ ہر جنگجو کے لیے لازمی ہے کہ ہمیشہ لڑائی کے اصول و قائدہ کی پابندی کرے، بصورت دیگر وہ بزدل، اور سطحی شخص تصور ہوتا تھا۔ (جو جنگی سیٹ اپ میں خودکشی یا جلاوطنی پر منتج ہوتا تھا)۔

بلوچوں کے جنگی اصول دراصل بہت قدیم عہد سے چلے آ رہے ہیں۔ معقول و روایتی

بلوچ آج بھی بڑی سختی سے ان پر عمل درآمد کرتا ہے۔ مثلاً انفرادی لڑائی میں حملہ آور کے لیے لازمی ہے کہ بہت دور سے دشمن کو للکار کر خبردار کر دے تا کہ اسے اپنے دفاع کا وقت مل سکے۔ (مگر، آج کے کلاشنکوف، بارودی سرنگ، راکٹ لانچر اور میزائل نے اس اصول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے)۔ اسی طرح لڑائی میں کوئی بھی ناجائز طریقہ اختیار کرنا برا فعل تصور ہوتا ہے۔ لڑائی میں آخر تک راست بازی سے کام لینا لازمی ہوتا ہے۔ زہر آلود تیر اور چھپائے ہوئے اسلحہ کا استعمال منع تھا۔ اسی طرح مہمان کو، سوئے ہوئے آدمی کو، قیدی کو، اور پناہ میں آئے ہوئے شخص کو قتل کرنا سخت معیوب کام تصور ہوتا تھا۔ خون کا بدلہ خون ہوتا تھا۔ پناہ میں آئے ہوئے شخص کے تحفظ کے لیے لڑنا حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دینا لازمی ہوتا تھا۔ مہمان کے جان و مال کو ہر خطرے سے بچانا اور امانت کی حفاظت حتمی ہوتی تھی۔ سوائے سیاہ کاری کے عورت کو قتل کرنا عظیم جرم تصور ہوتا تھا۔ ہندو (مذہبی اقلیت) کو مارنا گویا گناہِ کبیرہ تھا۔ شلوار پہننے کی عمر سے کم سن لڑکے کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ پیر کے دربار یا مسجد میں گھس جانے والے شخص کو قتل سے امان ملتی تھی۔ جس نے جوتے ہار بنا کر پہنے ہوں یا جوتا دانتوں میں پکڑا ہو، اسے بھی قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھا بلوچی کوڈ۔ جس کی پاس داری ہر قیمت پر کرنا لازمی تھی۔

بلوچی میں دو الگ الگ اصطلاحیں، جن کی ادائیگی سے مطلب کچھ سے کچھ بنتے ہیں۔ ''پلو بندغ'' طرفداری یا جانبداری کو کہتے ہیں۔ لیکن ''پلوہ بند غ'' بلوچوں میں ایک عمومی جنگی رواج ہوا کرتا تھا۔ زوراور کی تلوار کے سامنے ایک دوسرے کی قمیصوں کے دامنوں کو گرہ دے کر گویا سیسہ پلائی دایوار بنائی جاتی تھی۔ یہ گویا بہادری، اتحاد کی انتہا ہوتی تھی۔ مرنا جینا ایک ساتھ۔

بگٹی قبیلے میں ''چیف'' اور مری قبیلے میں ''راہ زن'' انگریزوں کے ہاں ''نائٹ'' کی طرز کے دو ایسے عہدے تھے جو صرف اور صرف جنگی امور میں اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ جنگی حالت میں سردار کے بعد دوسرا نمبر اسی کا ہوتا تھا۔ سردار کی طرح اس کا ٹائٹل بھی خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ انگریز نے آ کر اس کی اہمیت ختم کر دی۔ اس لیے کہ ایک تو ذرا سا امن بحال ہوا۔ پھر ویسے بھی بارود نے آ کر کئی ادارے تہس نہس کر کے رکھ دیے۔ چونکہ بندوق اور توپ بہت دور سے نشانہ بناتی ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس لیے اب جنگ اُس طرح عزت و وقار کا ذریعہ نہیں رہی جیسے کہ پہلے تھی۔ اس ایجاد نے شخصی بہادری وشجاعت پر گہری ضرب لگائی۔(6)

راہزن اور چیف کا عہدہ بہت عرصے تک سردار ہی کی طرح موروثی نہ تھا مگر یہ بھی بہت بعد میں جائیداد کی طرح یہ بھی وارثت میں منتقل ہونے لگا۔ یہ جنگ کے تمام امور کی نگرانی میں سردار کا چہیتا شخص ہوتا تھا۔ وہ ایک راہنما کی حیثیت سے گروہ کی راہنمائی کرتا تھا اور یہ حق بھی رکھتا تھا کہ اگر لڑائی میں شامل افراد میں سے کوئی میدان جنگ سے بھاگ جاتا تو وہ اسے قتل کر دے۔

اگر کسی سردار، رہزن یا وڈیرہ کا بیٹا اپنے باپ کی موت کے وقت کم سن ہوتو اس کی مدد کے لیے قبیلہ کا کوئی معمر یا تجربہ کار شخص مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ شخص اصل سردار یا وڈیرہ کے بالغ ہونے تک اس کے سارے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسطی زمانے میں خان قلات نے ''قومی عدل'' کا اصول نامہ وضع کیا اور بلوچستان کے سارے قبیلوں کے رسم ورواج کو قانونی شکل دے دی۔(7)

حوالہ جات

1۔ڈائر، جنرل/ گل خان نصیر۔ بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔1979۔نساء ٹریڈرز کوئٹہ۔صفحہ 60

2۔اولیور Across the Border.....Pathan and Baloch ۔1890۔ چیپ مین اینڈ ہال لمیٹڈ۔لندن۔صفحہ 27

3۔سبی گزٹیئر۔صفحہ 310

4۔اولیور......صفحہ 62

5۔سبی گزٹیئر۔صفحہ 308

6۔مبارک علی۔ جاگیرداری۔1996۔فکشن ہاؤس لاہور۔صفحہ 36

7۔پیکولین۔صفحہ 156

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرا باب

بلوچ مویشی بانی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے میں بلوچ سماج کے فیبرک کا اہم ترین سیل (Cell) بہرحال چرواہا ہی رہا ہے۔اور یہ دورانیہ ابھی بھی ختم نہ ہوا۔نوے فیصد اگر زیادہ لگے تو اَسی بنائیے، ستر بنائیے مگر فیصدی کے حساب سے بلاشبہ ساٹھ سے زیادہ تعداد میں بلوچ آج بھی مویشی بانی کرتا ہے۔صنعتی لسبیلہ ہی میں آپ کو اکثریتی آبادی لائیوسٹاک سے وابستہ ملے گی۔ فیوڈل نصیر آباد و سبی و کچھی میں بھی بعینۂ یہی حال ہے۔اور بقیہ بلوچ معاشرہ تو ویسے ہی سرقبیلوی سماج میں رہتا ہے جہاں مویشی بانی واحد ذریعہ معاش ہوتی ہے۔

مویشی بانی میں اصل شخص تو چرواہا ہوتا ہے۔وہ نہ صرف محنت کرتا ہے، نہ صرف واضح اکثریت میں ہے بلکہ وہ بلوچ ثقافت، سیاست اور معیشت میں بنیادی تبدیلیوں کے عنصر سے بھرپور طبقہ ہے۔آیئے ذرا اس چرواہے کی زندگی کو تفصیل سے دیکھیں۔

زمانوں سے بلوچستان میں پانی کی نایابی کے سبب زمینداری کو ترقی نہ ملی۔پٹ فیڈر تو نسبتاً حالیہ مظہر ہے۔اُس سے قبل محدود پیمانے پر مقامی گوربند باندھ کر ایک آدھ ٹیوب ویل جتنے

پانی سے مقامی زراعت ہوتی تھی۔اُس کے علاوہ پورے خطے میں بڑی بڑی نہریں نہیں تھیں۔تقریباً ساری کاشتکاری بارش پر ہوتی تھی۔اسی لیے بلوچ عوام صرف کھیتی باڑی پر اکتفا نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں بہرحال مویشی بانی کے عرصے کو وسعت دینی پڑی۔اپنے وسیع رقبے کی بنا پر آج بھی پاکستان کی 50 فیصد بھیڑیں اور 28 فیصد بکریاں بلوچستان میں پالی جاتی ہیں۔مویشی بانی چونکہ ایک جگہ پر آباد ہوکر نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے موسموں کے مطابق اور بارشوں کے مختلف جگہوں پر ہونے کے باعث خانہ بدوشی کرتے رہنا بلوچوں پر مسلط ہوگیا۔(1) جنوب مغربی سطح مرتفع کے تقریباً ایک تہائی مویشی سردیوں کی سہ ماہی میں سبی اور کچھی کے میدانوں میں ہجرت کرتے ہیں۔

مویشی بانی ایسا کام ہے جسے بلوچ آٹومیٹک انداز میں کیے جاتے ہیں۔قدیم زمانوں سے ہمارے آباؤاجداد یہ کام کرتے چلے آرہے ہیں۔اور جیسی مویشی بانی وہ کرتے تھے، ہم آج بھی بالکل اسی طرح کی مویشی بانی کرتے ہیں۔اس بارے میں کسی نئی تخلیق کاری اور تبدیلی کی نہ تو ضرورت محسوس کی گئی اور نہ اس کی گنجائش رکھی گئی۔اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت کی بدولت بلوچستان میں مویشی کی نسل وہی ہے جو آباؤاجداد کے زمانوں میں ہوا کرتی تھی۔

بلوچ عموماً بھیڑوں کی مالداری کرتے ہیں۔دوسرے نمبر پر بکریاں آتی ہیں۔تیسرے نمبر پر ان کے پاس اونٹ ہیں۔چوتھے نمبر پر گدھے آتے ہیں جنہیں یہ گھر کی نقل مکانی اور لکڑی پانی کی باربرداری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اور اس کے بعد گائیں آتی ہیں۔گھوڑے رکھنے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔بھینسیں تو بالکل کم پالی جاتی ہیں۔(3 اگست 1996 کے روزنامہ ''ڈان'' کے مطابق اتنے بڑے بلوچستان میں صرف ایک لاکھ بھینسیں تھیں)۔

بھیڑوں میں مشہور نسلیں ہیں؛ ہرنائی، بیورغ، رخشانی اور بلوچی۔

بیلوں میں مشہور نسل بھاگ ناڑی ہے۔

صوبے میں بھیڑ بکریاں اندرونی صوبائی ضرورت سے زائد ہیں اور ہم ہر سال دو ملین صوبے سے باہر فروخت کرتے ہیں۔1986ء کے سینسس کے مطابق مری کے ضلع میں بڑے جانوروں کی کل تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔بھیڑوں کی سرکاری تعداد چودہ لاکھ دو ہزار تھی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بکریاں چھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار تھیں۔(2) 1996 میں چاغی میں چار لاکھ بھیڑیں، دو لاکھ بکریاں، ساڑھے سترہ ہزار بیل گائے، اور ساڑھے تیئیس ہزار اونٹ تھے۔(3) ضلع پشین میں 1996 میں تین لاکھ بھیڑیں، ڈیڑھ لاکھ بکریاں، بیس ہزار بڑی سنگیوں والے جانور، ڈیڑھ ہزار بھینسیں اور تین سو اونٹ تھے۔(4) پورے بلوچستان میں روزنامہ ''ڈان'' کے اس اعداد و شمار کے تحت 18 ملین بھیڑ بکریاں ہیں۔

1- بھیڑ............ بلوچ کی روزی روٹی

بھیڑ چونکہ بلوچ کی روزی کا وسیلہ ہوتی ہے، روٹی اور کپڑا مہیا کرتی ہے، دکھ درد کی محافظ ہوتی ہے، جرمانہ اور تاوان کا درمان ہوتی ہے، چادر اور چار دیواری کا نگہبان ہوتی ہے اور شادی، لب اور غم کے وقت کی کرنسی ہوتی ہے، اس لیے بھیڑ کو بلوچ معاشرے میں کرامت اور برکت والا سمجھا جاتا ہے اور بختاور بھی۔ سردار کے سر کی قسم کے بعد ہماری بڑی قسم ہے؛

''میشانی سریں'' (قسم ہے بھیڑوں کی)۔

یہ عجب ہے کہ انگریز بھیڑ کو احتجاج نہ کرنے والی، غلام اور بے ہمت مخلوق سمجھتے ہیں۔ اسے جتنا مارو پیٹو، گھسیٹو یا ذبح کرو، یہ کچھ نہیں کہتی، کوئی فریاد نہیں کرتی۔ بغیر احتجاج اور بے نوائی میں دکھ جھیلتی رہے گی۔ اسی لیے انگریز بھیڑ کو بزدلی کی علامت سمجھتے ہیں اور بزدل آدمی کو بھیڑ کی طرح ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ جبکہ بلوچ بھیڑ کو ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ بلوچ شاید چیخنا چلانا فریاد کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ اسی لیے وہ بکری کی بالکل بھی عزت نہیں کرتے۔

بھیڑ پال لوگ اپنے مویشی کو ٹولی یا یونٹ کی صورت میں ترتیب دیتے ہیں۔ ہر یونٹ کو ''مُہر'' (ریوڑ) کہتے ہیں۔ ایک مہر میں عموم ساٹھ مویشی ہوتے ہیں۔ بھیڑوں کے مہر کو ''میگڑ'' کہا جاتا ہے اور بکریوں کے مہر کو ''رمغ''۔ ایک مہر کو ایک شخص سنبھالتا ہے، چراگاہوں تک چرانے لے جاتا ہے، اس کی سلامتی اور بہبود کا خیال رکھتا ہے۔ اس شخص کو ''پھوال'' کہتے ہیں۔

2- بھیڑ پال معیشت میں طبقاتی درجہ بندی

بلوچستان کی بھیڑ پال معیشت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک جگہ ٹک کر آباد ہونے نہیں دیتی۔ انسان ہر وقت بال بچوں سمیت چارہ، اور پانی کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ ایک مسلسل خانہ بدوشی کی حالت۔ اس سفرِ خانہ بدوشی کو بلوچی میں ''لڈ و بوژ'' کہتے ہیں۔

زیادہ بھیڑیں رکھنے والے شخص کو ''بھاگیا'' کہتے ہیں۔ پیہرسن کے مطابق یہ ہندی لفظ ''بھاگ'' سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے؛ ''اِدھر اُدھر بھاگنا''، جہاں بارش ہوئی بھاگیا دوڑ کر وہاں پہنچا''۔(5) مگر بھاگ سے مراد قسمت اور مقدر بھی ہے۔ یعنی بھاگیا خوش قسمت کو کہتے ہیں۔ سرپلس پیداوار پہ پلنے والے لوگ بھاگوان یعنی قسمت والے کہلائے۔ بھاگوان سے بھگوان کا لفظ بنا جس کا مطلب ہے سب سے بڑا قسمت والا اور دوسروں کی قسمتیں بنانے والا۔

اندازہ ہے کہ بلوچستان میں بڑے بڑے بھاگیاؤں کے پاس مویشیوں کی تعداد کی آخری حد پانچ ہزار ہے۔ لوگ خود بھی مالداری کرتے ہیں اور چرواہے بھی رکھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں گھر کے سارے افراد بھیڑوں کی خدمت میں جتے رہتے ہیں۔

پھوال (چرواہے) کی حالت بہت گری ہوئی ہوتی ہے اس لیے کہ اسے معاوضہ بہت ہی کم ملتا ہے مگر کام (اوقات اور شرائط دونوں اعتبار سے) بہت دشوار و مشقت آمیز۔ دوسروں کے مویشی چرانے والے کو ''پھوال'' کہتے ہیں جبکہ اجرت پر دوسروں کی گائیں چرانے والے کو ''گوآل'' کہتے ہیں، اونٹ چرانے والا ''جت'' یا بگجت کہلاتا ہے۔ ''گلپان'' البتہ گھوڑے چرانے والے کو نہیں بلکہ سردار اور وڈیرہ کے گھوڑے کو زین پہنانے، گھوڑے کو بنانے سنوارنے اور سردار کے خدمتگار کے بطور اصطبل کے علاوہ دیگر سارے کام کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ مویشی، گائے اونٹ اور گھوڑوں کا مالک ''بھوتار'' ہوتا ہے۔

پھوال

پھوال تعداد کے لحاظ سے بلوچستان کا سب سے بڑا طبقہ ہے۔ یہ نچلا طبقہ ہے، دکھوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں لپٹا، بے دولت و بے زر، لٹا ہوا، استحصال شدہ طبقہ۔ دُہائی دینا مطلوب نہیں ہے صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ اس طبقے کے ساتھ جو سب سے بڑی زیادتی کی گئی وہ یہ ہے کہ آج تک اس کا طبقاتی وجود تسلیم نہیں کیا گیا۔ ابھی حال ہی تک ہوٹلوں، ہاسٹلوں اور سیکریٹریٹ میں براجمان ہمارے کچھ دانشور، سیاسی لیڈر اور کچھ نظریہ دان یہ واہمہ پھیلاتے رہے ہیں کہ بلوچستان ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہے۔ اگر یہ فقرہ سامع میں مزاحمت کا باعث بنتا تو فوراً ''کو چرائی'' چھپانے کو اسے اس طرح ترمیم کرتے: ''بلوچستان میں طبقات واضح نہیں ہیں''۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ اُن کے ''آقا'' کے دامن کو تھام لیا جائے اور جس بے درکھڈے میں وہ پھینکنا چاہے ہم واری صدقے جاتے۔ (ہم کن کن میکاولیوں، سائیسر وؤں اور چانڑکاؤں کی شیطانی چالوں بھری شاہراہ پہ چلتے رہے ہیں !!)۔

ہمارے بھیڑ پال اور فیوڈل معاشرہ میں نہ صرف یہ کہ طبقات موجود ہیں بلکہ پھوال اس طبقاتی سماج میں یہاں کا نچلہ طبقہ ہے۔ یہ طبقہ پورے نچلے طبقے کا سب سے بڑا حصہ تشکیل کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پھوال ایک دوسرے سے بہت دور دور رہتے ہیں، انہیں کسی نے کوئی شعور نہیں دیا ہوتا، کسی نے ان کی سادگی کو علم کی روشنی عطا نہ کی۔ یہ ہمیشہ نقل مکانی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ سیاسی و تنظیمی طور پر سب سے غیر منظّم طبقہ ہے۔ اس کے اکٹھ کی اب تک کوئی صورت نہ بن سکی۔ اسے توہمات میں رکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طبقہ میں کسی قسم کا منظّم طبقاتی شعور نہیں پہنچا۔

آیئے دیکھیں کہ پھوال کا طرزِ معاش، طریق و شرائطِ کار اور اس کی قسمیں کیا ہیں۔

(i). چیار کوئی پھوال

چیارک بلوچی میں چوتھائی کو کہتے ہیں۔ یہاں بھوتار (مالک) اپنا مال چار سال کے لیے پھوال کو دیتا ہے۔ پھوال چار سال تک یہ مال چراتا ہے اور جب یہ مدت پوری ہوتی ہے تو وہ بھوتار کے ساتھ مویشی بانٹ لیتا ہے۔ یہاں پھوال کا حصہ مادہ بھیڑ بکریوں پر چوتھائی ہے۔ مال کی تعداد خواہ جتنی بڑھے۔ نر البتہ (دنبہ یا بکرا) ہر سال تقسیم کیا جاتا ہے۔ بھیڑ کے نر بچوں میں پھوال کا حصہ ایک تہائی ہوتا ہے۔ جبکہ بکری کے نر بچوں میں اس کا حصہ نصف ہوتا ہے اور مادہ بھیڑ بکریاں جب چار سال بعد تقسیم ہوتی ہیں تو پھوال کو ایک چوتھائی حصہ مل جاتا ہے۔

چیار کوئی والی پھوالی میں مویشی، مالک کی بجائے پھوال کے گھر میں ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اکیلا کام نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اس کا سارا گھرانہ چار سال تک کل وقتی طور پر مشقت کرتا ہے۔

بڑے جانوروں یعنی گائے بیلوں میں ''چیار کوئی'' کی صورت میں ''گوآل'' کو چار کے بجائے آٹھ سال تک بیل چرانے پڑتے ہیں۔ تب وہ چوتھائی کا حقدار بن سکتا ہے۔ گائے کے نر بچے کو گوآل ایک سال تک اپنے ہل میں جوت سکتا ہے جس کے بعد بھوتار اسے چیارک پہ تقسیم کرتا ہے۔ چونکہ بڑے جانوروں کے مقابلے میں چھوٹے مویشی زیادہ رکھے جاتے ہیں اس لیے بڑے جانوروں کا ''چیار کوئی'' بھی زیادہ نہیں ہے۔

(ii). سیٹکوئی پھوال

پھوال اور بھوتار کے مابین معاہدہ کی یہ شکل چھوٹے قسم کے مویشی میں بھی موجود ہوتی ہے، اور گائیں اور اونٹنیوں میں بھی۔ یہاں بھوتار اپنے حیوان بہت مہنگے داموں پھوال کو فروخت کرتا ہے۔ مال خریدنے والا اگر اس تقریباً دگنی قیمت کا نصف ادا کرے تو وہ مویشی کے آدھے حصے کا حقدار بن جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی جیب سے یعنی خود مویشی سے (پشم یا نر بچے کے فروخت کرنے سے) قیمت کی رقم بھوتار کو دے دیتا ہے تو جس وقت وہ ساری رقم کی ادائیگی مکمل کر پائے اس وقت وہ نصف حصہ کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ یعنی پشم اور نر بچے پھوال کے ہیں۔ وہ انہیں بیچتا جاتا ہے اور پیسہ بھوتار کو دیتا جاتا ہے۔

(iii). نیمغوئی پھوال

گھوڑے، گائیں اور مرغیاں نیمغوئی (نصف نصف۔ نیم نیم) پر دی جاتی ہیں۔ مرغیوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے مگر گھوڑے اور گائیں جب نیمغوئی پر دی جاتی ہیں تو اس میں گوآل قسطوں پر آدھی قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ پہلے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک مقررہ تعداد میں بچے دینے تک وہ مال تقسیم نہیں کریں گے۔ جس وقت آدھی قیمت کی ادائیگی مکمل ہو جائیگی، مال کو نر اور مادہ دونوں صورتوں میں آدھو آدھ کیا جاتا ہے۔

مرغی کا قانون یہ ہے کہ اصل مرغی مالک کی ہوتی ہے اور مرغی کی آل اولاد نصف نصف

بانٹ دی جاتی ہے۔

(iv)۔کریھہ واری پھوال

(کرائے والا چرواہا)

الف۔سالانہ کریہہ واری پھوال: یہاں پھوال کو سال تک مال چرانا ہوتا ہے اور معاہدہ کے مطابق اسے ادائیگی مقررہ تعداد میں مویشی کے بچوں کی صورت میں کی جاتی ہے۔

ب۔ماہانہ کریہہ واری پھوال: یہاں ہر ماہ نقدی کی صورت میں معاوضہ پہ مال چرانا پڑتا ہے۔ یہ معاوضہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ضروریاتِ زندگی کی مہنگائی اور چرواہوں کی بہتایا کمی کے تناسب سے عموماً بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ڈیمانڈ اینڈ سپلائی!!

ج۔دروڑ کا پھوال: یہاں پھوال کو پورے سال تک مال چرانا پڑتا ہے۔اسے معاوضہ میں معمولی رقم بھی ملتی ہے، نیز سال کے بعد مویشی کے نر بچوں کا تیسرا حصہ بھی۔اسی طرح وہ مادہ بچوں کا ستارہواں حصہ، پشم میں چھٹا حصہ، کپڑے کا ایک جوڑا، چپلی کا ایک جوڑا، سر پر لگانے کے لیے سرسوں کے تیل کی ایک بوتل، دووقت کی روٹی (زیادہ تر روکھی، اور وہ بھی عموماً سستے ترین اناج کی) پاتا ہے۔اسے ماہانہ تین دن کی چھٹی ملتی ہے۔

ایک بات ٹوٹ کرنے کی ہے کہ مویشی کے چھوٹے بچوں کو انسان کا بچہ ہی چرانے لے جاتا (یالے جاتی) ہے۔اگر دو یا تین ''مُہر'' (ریوڑ) ہوں تو عورت بھی مال چراتی ہے۔دوسرے لفظوں میں ہمارے ہاں پھوال مرد بھی ہوتے ہیں، عورت بھی اور نوعمر بچے بھی۔ مڈل کلاس کا ''متبرک'' اور ''پاک'' پردہ موجود نہیں ہے۔برقع، ابا یہ جسمانی کام نہ کرنے والے ''بابوؤں'' کی بیگمات کے تواہمات ہیں، محنت کش انسانوں سے اس کا کیا تعلق ہے کہ وہاں تو عصمت، کام کرنے کو سمجھا جاتا ہے۔

****

پھوال ہمارے علاقے کا نچلا طبقہ ہے۔خواہ خود انہیں اپنے طبقے کے وجود اور اس کے مسائل کا شعور ہو یا نہیں، یا خواہ سیاست کار اور ان کے ہم زبان دانشور انہیں نچلا، اور خود کو بالائی

طبقہ تسلیم کرتے ہوں یا نہیں، اور خواہ وہ بطور نچلا طبقہ متحد و منظّم ہوں نہ ہوں اُن کی زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔حتیٰ کہ فارمنگ کا نظام بنا کر اُن کے طبقے کو بلند کیا جاسکتا ہے۔گذشتہ کچھ سالوں میں زراعت میں معمولی سی ترقی ہوئی ہے، مگر پھر بھی مجموعی طور پر مویشی بانی معیشت میں بنیادی وسیلہ ہے۔اور پھوال اس کا سب سے نچلا حصہ ہے۔

اِدھر اُدھر وانڈھ میں بکھیر دیے گئے پھوالوں کے پاس جانا، اور دور دور بسیرا کرنے والے پہلوالوں کو منظّم کرنا بہت مشکل کام ہے۔(وانڈھ اس تنہا گھر کا نام ہے جہاں مویشی چرانے کی خاطر پھوال اپنے گھروں سے بہت دور بیابان میں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ دن کو مویشی چرائی اور شام مویشیوں سمیت اس عارضی گھر میں گزار لی)۔

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ پھوال صرف چھ گھنٹے ہی کام نہیں کرتا بلکہ وہ رات دن مشقت کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ سوتا بھی ریوڑ کے اندر ہے۔اسے کسی قسم کے انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔اسے نہ تو ہل الاؤنس ملتا ہے اور نہ یونیفارم کے لیے رقم۔ وہ نہ تو ہڑتال کرسکتا ہے نہ اسے روزگار کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہے۔وہ مالکن کے لیے ہر شام لکڑی کا گٹھا بھی جمع کر کے سر پر اٹھا کر لاتا ہے۔درندوں سے چوروں سے اپنے ریوڑ کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔گم شدہ مویشی کو ڈھونڈنے بھی وہی جاتا ہے اور درندوں کے خلاف ''جبڑابندی'' کا دم بھی وہی کرتا ہے۔مگر بھوکے یا پھر بدعادت انسان (چور) کے جبڑے کو کون بند کرسکتا ہے؟ پھوال کو اپنے بھوتار کے مہمان کی خدمت بھی کرنا ہوتی ہے۔ اسے کوئی گزیٹڈ چھٹی نہیں ملتی۔اس کا کوئی اجلاس اپنے دوسرے پھوال ساتھیوں سے نہیں ہوسکتا۔نہ عید نہ بڑا دن۔ بارش نہ ہوئی تو اُس علاقے کی طرف نقل مکانی کرنا پڑے گی، جہاں گھاس موجود ہو۔اس صورت میں کھانا پکانا بھی خود کرنا پڑے گا، اوطاق بھی سنبھالنا ہوگا، مسافروں کو روٹی دینی پڑے گی، مال چرانا تو ویسے ہی بھاگ میں لکھا ہے۔اس عمل کو ''کاشر'' کہتے ہیں۔

پھوال کے یارِ غار دو ہوتے ہیں: اس کا مددگار کتا اور ریوڑ میں سے اس کی سب سے پیاری بھیڑ جسے وہ ''سربر'' کہتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

3-اون اور منڈی کا پھندا

بھیڑ بکریوں کا پشم سال میں دو بار اتارا جاتا ہے۔اس حجامت کو''چین'' کہتے ہیں۔ یہ چونکہ فصل کاٹنے کے مترادف ہوتا ہے اس لیے یہ قرض خواہوں، شادی بیاہ کے اخراجات کرنے اور دیگر لین دین کا موسم ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ کسان اپنی ضروریاتِ زندگی فصل اٹھاتے وقت پوری کرتا ہے۔

چین سے قبل مویشی کو دھو کر صاف کرنا ضروری ہوتا ہے تا کہ جب پشم اتارا جائے تو یہ صاف اور اجلا ہو۔مویشی کے دھونے کو''دھوپ'' کہتے ہیں۔ بھوتار کے نزدیکی عزیز اور اقارب اور کام کرنے والے توانا جوان اکٹھے ہو جاتے ہیں اور نزدیک ترین جوہڑ یا جھیل پر چلے جاتے ہیں۔ مویشی دھونے یعنی''دھوپ'' کا دن پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے اور دھوپی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں دن فلاں کے مویشیوں کے ریوڑ کا دھوپ فلاں جگہ پر ہوگا۔ دھوپ کے دن خیرات بھی کی جاتی ہے۔(ایک یا دو بھیڑیں، حسب توفیق یا مال یا دھوپی لوگوں کی تعداد کے مطابق)۔آدمی دھوتی پہنتے ہیں اور بھیڑ کو بازوؤں میں اٹھاتے ہیں اور پانی میں ڈبکی لگواتے ہیں۔ بھیڑ کو بہت زیادہ دھونا نہیں پڑتا۔ محض ہاتھ پھیرنے سے پشم جھاگ ہو جاتا ہے اور خود بخود فوراً اجلا ہو جاتا ہے۔ایک دو آدمی کھانے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ رواج یہ ہے کہ کوئی مسافر راہگیر راستے سے گزرتے ہوئے اگر گوشت خوری کرنا چاہے تو وہ یہ حق رکھتا ہے کہ ایک بھیڑ کو اٹھائے اور جھیل میں ڈبکی دے کر دھو ڈالے۔اس طرح وہ کھانے کی برابر مقدار کا شریک تصور ہوگا۔اگر کوئی راہگیر کھانے کا خواہشمند نہ ہو، یا تکلف سے کام لے مگر بھوتار قسم کھا کر اسے کھانے پر مجبور کرے تب بھی اسے رواجاً ایک بھیڑ پکڑ کر دھونا ہوگا (خواہ یہ بھیڑ ابھی ابھی دھوئی گئی کیوں نہ ہو) تبھی وہ خوبصورتی سے کھا سکے گا۔

''چین'' کا دن بھی پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے۔اس لیے کہ علاقے میں بھیڑوں کے پشم اتارنے والے''لاوا'' تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں جبکہ موسم کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔اس لیے لاوا سے پہلے ہی ٹائم لینا پڑتا ہے۔ لاوا عموماً دو یا تین آدمی ہوتے ہیں جن کے پاس قینچی کی طرح کے تیز بہت لمبے ہتھیار رہتے ہیں۔اس قینچی نما اوزار کو''ہرل'' کہتے ہیں۔ چٹائی پر بھیڑ کے چاروں

پاؤں باندھ کر اسے لٹایا جاتا ہے اور کام شروع۔ ماہر اور اچھا''لاوا'' کام تیز بھی کرتا ہے اور پشم بھی بڑی خوبصورتی سے اتارتا ہے۔ خاص کر پھوال کی محبوب بھیڑ کی پشت پر تو بہت خوبصورت چوٹی بناتے ہیں۔

لاوا کی خدمت زبردست طور پر کرنا پڑتی ہے وگرنہ ایک تو وہ سارے علاقے میں مالک کی کنجوسی کی شکایت کرتے پھریں گے اور دوسرا اس لیے کہ وہ بلڈوزر کے ڈرائیور کی طرح مرغی کھلانے کا ایک الگ گیئر چلاتا ہے اور آلو کھلانے پر اس کا گیئر دوسرا ہوتا ہے۔

بھیڑ بے چاری جب ہرل کے نیچے آتی ہے تو وہ مسکین اتنا confuse ہو جاتی ہے جیسے چھوٹے بچے کو سکول لے جایا جائے۔ پشم اتر جانے کے بعد جب اس کے پاؤں کھول دیے جاتے ہیں تو وہ بھاگ کر اس خوارستانی سے خود کو دور کرتی ہے، ننگی ننگی، بدصورت بدصورت، بدلی بدلی سی۔ وہ بہت دیر تک اپنے پشم کی غیر حاضری اور اس تبدیلی کے بارے میں پریشان گھومتی ہے۔

''لاوا'' کے قریب ایک دو شخص بیٹھ کر اتارے گئے پشم کو گول گول دائرہ نما شکل میں باندھتے جاتے ہیں جسے''گوڑی'' کہتے ہیں۔اتارے گئے پشم کو لمبائی میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر پیش کے ایک دو پتے لمبائی میں بچھاتے ہیں، بھیڑ کے فضلے کی ایک دو مٹھی بھر کر اس پر چھڑک دیتے ہیں۔ پھر اس لمبائی میں رکھے گئے پشم کو تہہ کرتے ہیں اور بڑی مہارت سے اس طرح بل دیتے ہیں کہ نہ تو فضلہ گرتا ہے اور نہ ہی پیش کے پتے نظر آتے ہیں۔انہیں پھر پگڑی کی طرح لپیٹ کر اس کا سرا اسی میں اڑس دیتے ہیں۔اس طرح گوڑی بن جاتی ہے۔ایماندار شخص ایک دنبی کے پشم سے ایک گوڑی بناتا ہے مگر کھوٹ والا شخص گھپلا بازی کرتے ہوئے اپنی گوڑیوں کی تعداد میں برکت دیتا ہے۔ پیش کا پتہ پشم کو اکٹھا رکھنے اور مضبوطی سے گوڑی کی تشکیل دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن بھیڑ کا فضلہ ڈالنا اور اس پر پانی چھڑکنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ گوڑی کا وزن بڑھ جائے اور بیوپاری سے پیسہ زیادہ ملے۔

بہر حال دھوپ اور چین لوازمات اور روایات سے بھرے ہوئے ہیں جنہیں بہت عرصے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک پورا کرتے رہنا بہرصورت ضروری ہے۔سرکار ہمت کرے یا پھر کوئی سرمایہ دار اپنے سینے پر ہاتھ مار کر چین کے لیے ایک کارخانہ لگادے تو نہ ضرورت پڑے لاوا کی' نہ گوڑی بنانے کی اور نہ گوبر ڈالنے کی۔

پشم کا سودا عموماً لوگ پہلے سے طے کر بیٹھتے ہیں۔جس طرح فروٹ کے باغات کے فصل کا سودا ٹھیکیدار پہلے جا کر لگا آتے ہیں،اسی طرح مویشی کے پشم کا سودا بھی بہت پہلے سے لگایا جاتا ہے۔سوداگر یا تو مقامی ہوتے ہیں یا پھر ڈیرہ غازی خان اور ملتان کے لانگو (دھوتی پوش)۔مقامی سوداگر ''گوڑی'' کے حساب سے پشم خریدتے ہیں نہ کہ تول کے حساب سے۔قیمت عموماً نقد نہیں ملتی بلکہ دکان کے سامان کی صورت میں دی جاتی ہے جس میں دکاندار کی عیاشی ہوتی ہے۔وہ پشم لیتا سستا ہے اور اپنا سودا سلف مہنگا بیچتا ہے۔بلوچ شہری مخلوق تو ہے نہیں،وہ شہر جانے اور وہاں اپنے پشم کو اچھے نرخ پر بیچنے سے ہچکچاتا ہے۔لہٰذا وہیں مقامی لوگوں کے ہاتھ بیچ کر اپنی جان چھڑاتا ہے۔دکاندار فضول چیزوں سے اسے لاد کر روانہ کردیتا ہے۔دکاندار بعد میں بہت بڑی بوریوں میں پشم ڈال کر ٹریکٹر یا ٹرک میں ڈال کر بڑے شہر لے جاتا ہے۔جہاں کیپٹل ازم والی منڈی دانت تیز کیے پہلے ہی سے اس کے انتظار میں ہوتی ہے۔وہاں من کے حساب سے پشم فروخت ہوتا ہے۔وہ سوداگر دیگر حیلہ اور تدابیر کے علاوہ ایک حرکت یہ کرتے ہیں کہ چار چھ دن تک اسے کوئی لفٹ نہیں کراتے۔روز بہ روز بلوچ آدمی اپنے علاقے کی یاد میں مرجھاتا جاتا ہے اور بالآخر دعائیں مانگنے لگتا ہے کہ کسی صورت اس کی جان چھوٹ جائے۔سوداگر اس کی دعا بہرحال قبول کرتے ہیں۔

پہوال سے لے کر بھوتار تک اور پھر مقامی سوداگر تک کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ پشم بالآخر جاتا کہاں ہے۔مارکیٹ میں اس کے ریٹ مقرر کون سی قوتیں کرتی ہیں۔بڑے سوداگر کو کتنا منافع ہوتا ہے اور اس کے پشم کا آخری استعمال کیا ہے؟انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس ارزاں فروخت کردہ پشم سے بے شمار چیزیں کارخانوں میں بنتی ہیں اور پھر دوبارہ خود انہی پر (یا ان کی طرح کے لوگوں پر) مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔

4-جلواورسات

Julav & Saath

نقد پیسہ،روکڑ یا کرنسی بہت ساری مصیبتوں کو دور کرنے والا جادوگر ہے۔اس کا وزن تو اتنا نہیں ہوتا مگر اس کا اختیار بہت زیادہ ہے۔نظر آتے ہی لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں احترام میں، چلے تو لوگ کام دھندا چھوڑ کر ارمان سے اسے تکتے ہیں،اگر کم ہو تو زیادہ کرنے کی تگ و دو میں ہوتے ہیں۔پیسہ............جب بولتا ہے تو لوگ سنتے ہیں۔

کرنسی یا پیسہ سے پہلے لوگ اپنی اضافی چیزیں دے کر اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیتے تھے۔مثلاً ایک بھیڑ دے کر ایک بوری گندم،ایک لیلا کے بدلے کپڑے کا جوڑا یا ایک مزدور سارا سال کام کر کے آٹھ بھیڑیں لے لیتا تھا۔پیسہ ایجاد ہونے کے بعد چیزوں کے تبادلے کی بجائے ان کی قیمت مقرر ہونے لگی اور پیسہ پہ اپنی چیزیں فروخت کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کا رواج ہوا۔اس طرح پیسہ اور سرمایہ اکٹھا کرنے،زیادہ کرنے اور مزید زیادہ کرنے کی طرف ساری توجہ مبذول ہوگئی۔اس نے دنیا کے اندر ایک نیا تماشا پیدا کردیا،جسے سرمایہ داری کہتے ہیں۔لیکن ہم ابھی تک مکمل طور پر اپنے پرانے معاش سے نکل نہ سکے اور مکمل طور پر اس نئی پیچیدگی میں داخل نہ ہوسکے۔ہم سرمایہ داری کی عمومی عالمی فضا میں سانس بھی لیتے ہیں اور فیوڈل باقیات کو بھی گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔شہر جو سرمایہ داری کے ارتقا کا ممتاز مظہر،نتیجہ اور سبب ہوتے ہیں،ہم نے اپنے لیے ممنوعہ علاقے قرار دے رکھے ہیں۔ہم شہروں،سرمایہ اور سرمایہ داری سے بہت دور پہاڑوں میں مویشی بانی کرتے ہیں۔جب ہمارا راشن آٹا ختم ہوجاتا ہے اور تن کا لباس بہت خستہ ہوجاتا ہے تو ایک آدھ بکری سینگوں سے پکڑ کر منڈی میں جا کر بیچتے ہیں اور اس نقدی سے کپڑا لتا اور دیگر ضرورت کی چیزیں خرید کر تیزی سے واپس اپنے سماج میں جاتے ہیں۔

مویشی کو منڈی (پڑی) لے جانے کے لیے آس پاس کے پڑوسیوں کو اطلاع کی جاتی ہے اور گروہ کی صورت میں ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق ایک ایک،دو دو بھیڑ بکری ساتھ لیتا ہے۔اور یہ گروپ پڑی کی طرف رواں ہوجاتا ہے۔منڈی قریبی شہر میں ہوتا ہے جو کم از کم چالیس

پچاس میل دور ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے موٹے تازے مال کے ساتھ پیدل تین چار دن لگا کر بالآخر اپنی منزل تک پہنچتے ہیں۔ اس کارواں کو ''جلو'' کہا جاتا ہے اور کارواں میں شامل لوگوں کو ''جلوی''۔ کاک پکاتے ہوئے مشکیزے ساتھ لیے، مویشی کو ہانکتے ہوئے جب پڑی پہنچ جاتے ہیں تو ہٹی رب دے حوالے۔

سوداگر نہ تو مانتا ہے پیر فقیر کو، نہ دم درود کو، نہ ہی قسم قرآن کو۔ وہ تو بیٹا ہوتا ہے ڈیمانڈ کا، سپلائی کا۔ اگر مویشی منڈی میں زیادہ ہے تو قیمت کم ہے اور اگر مال کم ہے تو قیمت میں کچھ اضافہ ملتا ہے۔ مصنوعی کمی بیشی تو بہرحال سرمایہ داری نظام کا امرت دھارا ہوتی ہے۔

مال فروخت ہونے کے بعد شاپنگ شروع ہو جاتی ہے۔ کھانے کے لیے غلہ خریدنا ہے جسے گھر والی نے ادھ راتوں کو اپنی نیند تلخ کر کے صبحوں تک پیسنا ہوگا۔ آٹا اس لیے نہیں خریدا جاتا کہ اونٹ پر دو دن دورات کے سفر میں آٹا تو سارا تھیلوں سے نکل نکل کر بے برکت اور کم ہو جاتا ہے۔ غلہ ایک زمانے میں جوار اور باجرہ ہوتا تھا مگر اب کچھ برسوں سے لوگ عموماً گندم کھاتے ہیں۔ اور گندم کی روٹی تو خود سالن ہوتی ہے، اللہ کی رحمت ہوتی ہے، نور ہوتی ہے۔ لہٰذا سالن وغیرہ کا رواج کچھ زیادہ نہیں ہے۔ دودھ دہی ہے تو ٹھیک ورنہ روکھی روٹی خود نعمت خداوندی ہے۔

کاک

لکڑیاں جلا کر دھکتے کوئلہ کے گرد پکاتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے گول پتھر، مُشت پُری (جو مٹھی میں آجائے) کو آگ میں ڈال کر خوب گرم کیا جاتا ہے۔ گوندھے ہوئے آٹے کو روٹی کی طرح چپٹا کیا جاتا ہے۔ اُس گرم پتھر کو اُس آٹے پر رکھا جاتا ہے اور وہ آٹا اس کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔ یوں کہ سوراخ تک نہ رہے۔ اب گول چیز کو دھکتے کوئلوں کے پاس رکھا جاتا ہے۔ اندر سے گرم پتھر اور باہر سے کوئلوں کی تپش اسے پکا دیتی ہے۔ کاک موجودہ رسم نہیں ہے۔ یہ گیارہ ہزار قبل مہر گڑھ میں بھی دریافت ہوا ہے۔

چائے

چینی، پتی خریدنا البتہ ضروری ہے۔ مہمان، مسافر، بیماری، بارش، سردی...... پھر عادی

''چائے نوش'' کی تسکین کے لیے چائے پکانا ہر خیمہ، ہر گھر کا عمومی خاصہ بن کر رہ گیا ہے۔ تھکاوٹ دور کرنے یا پُرکیف پسینہ بخش نشہ کرنے کے لیے گڑ منہ میں ڈال کر چائے کی چسکیاں لی جاتی ہیں جسے ''ترخ'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ فضول خرچی یا شوشا اور مہمان نوازی کے لیے چینی والی چائے پیش کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ کھانے سے زیادہ خرچ آج کل چائے پر اٹھتا ہے۔

سگریٹ نوشی بھی بڑھتی جا رہی ہے حالانکہ؛

حقہ و چلم پوڑانی
درمانہ ءَ نواں دورانی
هشکیں شوشغ ایں جوڑانی

ترجمہ:

حقہ اور چلم
درد کا درمان نہیں ہیں
یہ تو محض ہونٹ جلانے کا سامان ہیں

مگر یہ سٹیٹس سمبل جیسی بات بھی ہے۔ تقریباً جو بھی شخص علاقے سے باہر گیا اور کوئی شہر دیکھ آیا، وہ سگریٹ سے ضرور آشنا ہو گیا۔ سولائزیشن کی پہلی نشانی کس قدر بدصورت ہوتی ہے!! اب چلم، پوڑ، تمباکو کی تھیلی، اور، لوہے اور پتھر کی رگڑ سے چنگاری پیدا کرنے والا سامان ''پڑز اور آژگیژ'' غائب ہوتے جا رہے ہیں۔

گھر کے افراد کے لیے جوتے خریدے جاتے ہیں۔ کپڑا، پوشاک تو ایسی چیز ہے جو عریانی کے دفاع کے لیے لازم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مرد اور عورت دونوں کے لیے خریدے جاتے ہیں۔ ہاں شونک (شوق) کی بات البتہ اور ہے۔ کبھی کبھی نوجوان بہت احتیاط اور قرینے سے دل کے حُب میں ایک انگوٹھی یا مصری کا ٹکڑا ایک منتظر دل کے لیے خرید لیتا ہے، اسے کئی پوشوں میں ڈال کر جیب میں ڈال دیتا ہے۔ ارزاں قیمت پر اگر کوئی نڑ مل جائے تو اپنے یا اپنے ناڑی ساتھی کے لیے خرید لیتا ہے۔ بندوق کے لیے کمر بند خریدنا تو ایسا جرمانہ ہے جو بہرحال بھرنا پڑتا ہے۔ یوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دو دن غلیظ شہر کی سالن خوری والے فضول کھانے سے پیٹ کا جہنم بھرنا پڑتا ہے۔ پھر اپنے گراں بہا، گراں مایہ، تعیش اور ضرورت کی ساری چیزوں کے ساتھ فلک بوس پہاڑوں اور دشوار گزار دروں کی طرف حرکت۔

خریدے ہوئے اناج کے قافلے کو ''سات'' کہتے ہیں اور قافلے میں شامل لوگوں کو ''ساتی''۔ اور ان ساتیوں کے اندر بہر حال ایک جوان تو ضرور ہوگا جس کی جیب میں ''کسی'' کو ساتی (زیور پوش) بنانے کیلیے ایک انگوٹھی ہوگی۔

جی بلوچ ءِ کارواں۔

5- جانوروں کا قتلِ عام

بلوچ کے مویشی ہمیشہ چھری کے نیچے ہوتے ہیں۔ بھیڑ بکری کو ذبح کرنے اور انسان کو قتل کرنے کی عادت کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ معلوم نہیں اس بارے میں نفسیات کے ماہرین کی ریسرچ کیا کہے گی۔ چھری اور مویشی کی یاری شاید مالداری کے اولین دن سے شروع ہوئی ہوگی جو شاید ابد تک چلے گی۔ خود مرنے والی بھیڑ پر چھری پھیرنا تو خیر مجبوری ہے کہ دوسری راہ نہیں ہے مگر دوسرے مواقع پر بھی چھری عموماً رواج و رسم اور عقیدہ و ایمان کے حکم سے بلند ہوتی ہی رہتی ہے۔ قبیلہ میں انسان واقعی مجبور محض ہے کوئی اختیار، کوئی فرار نہیں۔ نرینہ اولاد اللہ نے دی ہو تو اس خوشی یعنی ''بیشن'' کے مواقع پر مال ذبح کرنا پڑتا ہے، اس پر نام رکھنے (شغان) کے وقت کا جشن تو مویشی کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ پھر اسی بچے کا ختنہ کرنا ہو تو جرمانہ پھر بھیڑ بکری کو بھرنا پڑتا ہے۔ پھر منگنی، شادی، بالآخر موت اور برسی اور بھیڑ کی گردن۔ نرینہ انسان کی پیدائش سے لے کر بعد از مرگ کی ہر رسم اور بھیڑ بکریوں کا قتل عام چولی دامن کے ساتھی ہیں۔

مہمان اور مہمانداری قبائلی زندگی کی ضرورت بھی ہے اور خوبی بھی۔ بیابان میں کسی آدم زاد سے ملنا تو ویسے ہی ایک خوش بختی ہوتی ہے۔ مگر بلوچ کے علاقے میں مہمان سیاسی، سماجی، معاشی، تجارتی، نشانہ بازی، اور گھر دوڑ کی خبریں تفصیل سے لاتا ہے اور میزبان کی پوری برادری کو

باخبر کر دیتا ہے۔ حال شریکی کے علاوہ کبھی کبھی ناڑی سُری مل جاتے ہیں تو سارے گھرانے کے نرینہ افراد کی روح کو غذا میسر ہو جاتی ہے۔ تاریخ دان مہمان، رند و لاشار کی جنگ، مست وسمو کی محبت اور صحابیوں کے قصے بیان کرتے ہیں۔ یوں واقعتاً مہمان خدا کی ایک نعمت ہوتا ہے۔

میزبان، مہمان کی سماجی حیثیت اور ان کی تعداد کے حساب سے مویشی لاتا ہے۔ جاندار میزبان، مویشی لاتے ہی طلاق کہہ دیتا ہے اور مہمان سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی درخواست کرتا ہے۔ اگر وہ طلاق نہ کہے تو مویشی ذبح کرنے یا نہ کرنے کے لیے گویا مذاکرات کی گنجائش چھوڑ دیتا ہے۔ مہمان یا تو طلاق کہہ کر مویشی ذبح کرنے سے منع کرتا ہے، یا طلاق کہہ کر ذبح ہونے والے مویشی کی تعداد کو کم کرتا ہے وگرنہ مویشی ذبح کرنے کا خرچہ ''نہ'' کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ کچھ گوشت خور مہمان فوری طور پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال مہمانداری کی مد میں مویشی کی ایک اچھی خاصی تعداد قربان ہوتی ہے۔ مہمان کو البتہ ایک تکلیف کرنا پڑتی ہے کہ اس نے دنبہ خود ذبح کرنا ہوتا ہے اور گوشت خود ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوتا ہے۔ لکڑی خود چُن کر لانا پڑتی ہے اور رواج کے مطابق یخنی خود پکانا پڑتی ہے۔ تاکہ میزبان کے کام کو شیئر کیا جا سکے۔ مہمان میزبان کو کھانے میں شریک کرتا ہے۔ دوسرے نرینہ افراد بھی کچھ کھا لیتے ہیں۔

سماج میں بڑے دن آتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ زردہ پلاؤ نہیں ہے۔ تب بسم اللہ کرو اور چھری کو تیز کرنے والے پتھر پہ رگڑو اور کھینچ لاؤ ایک دنبہ۔ دعا مانگو، اس کی ٹانگیں پکڑ ڈالو۔ بسم اللہ، اللہ اکبر، بسم اللہ، اللہ اکبر کہتے ہوئے دنبے کی گردن پر چھری چلاؤ۔ بڑے دن دونوں عیدوں والے دن ہیں، سال میں دو پیشیندغ ہیں، دھاگ کا دن ہے، ہزاری اور خدائی ہیں، اسی طرح رسول کی پندرھویں ہے، جہاں کہ مال خیرات کیا جاتا ہے۔

مَنت اور نذرانہ مال کُشی کا ایک اور موقع ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگ اپنے سر کے بالوں یا داڑھیوں کے استرا کرنے کو نذرانہ کے بطور عہد کرتے تھے مگر آج کل اپنے کسی خاص کام کو پورا کرنے کے لیے بھیڑ بکریوں کی گردنیں حاضر ہیں۔ ''پیر صاحب! میرے ریوڑ کا فلاں مویشی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہارے نام پہ خیرات ہے اگر میرا فلاں کام ہو جائے..........''

مویشی بلا دُور کرنے والا میزائل ہوتا ہے۔ اگر کوئی برا خواب دیکھا تو سویرے ڈھیر کردو ایک بکری، اللہ خیر کرے گا۔ کوئی بیمار ہو تو ایک دنبہ قتل کردو، اللہ دکھ آسان کرے گا۔ گھانچ نامی پرندہ بائیں جانب بیٹھا بول رہا ہو تو ایک بکری ذبح کرو، یہ برا شگون نیوٹرل ہو جائے گا۔ کوئی جن وغیرہ تنگ کرے تو مویشی کا خون بہا دو، جن بھاگ جائے گا۔ کافر اسپرین اور ٹیٹرا سائیکلین اگر کام خراب نہ کرتے تو جسم کے درد اور نمونیا جیسی بیماریوں کا علاج مویشی کا چمڑا چڑھانے سے ہو جایا کرتا تھا۔ مویشی ذبح کرو اور اس کی کھال مریض کو پہنا دو، شفا کا دیوتا بجانے آن پہنچے گا۔ ایک کھال سے گزارہ نہ ہو تو دوسرا، ورنہ اگلے دن پھر ایک۔ میں نے بیس بیس کھال چڑھانے کا بھی سنا ہے۔ ایک مویشی اگر کم از کم ہزار روپے قیمت کا ہو تو بیس کھالیں پہنانے پر بیس ہزار روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت گراں بہا علاج ہے۔ اب بلوچ دس پندرہ روپے کی انٹی بائیوٹکس پر جانے کا سوچ رہا ہے۔

کھال استعمال کیے جانے والے مویشی کا گوشت بے ذائقہ اور بے مزہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ یہ گوشت کھاتے ہی نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر بے خبری سے کھانا پڑے بھی تو وہ پہلے ہی نوالے میں بتا دیتے ہیں کہ اس مویشی کی کھال مریض کو چڑھائی گئی ہے۔ ایسے لوگ اگر یہ گوشت کھا بھی لیں تو بیمار ہو جائیں گے۔ الٹی کرکے اسے نکال دیتے ہیں۔ اس کا سائنسی سبب معلوم نہیں کیا ہوگا، بہر حال یہ مظہر موجود ہے۔

بیمار مویشی کو ذبح کرنا ویسے ہی ضروری ہوتا ہے۔ درندے کی زخمی کردہ بھیڑ کو کون حرام موت مرنے دیتا ہے؟ اس کے علاوہ مویشیوں کی بیماریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہماری چھری کو کند ہونے دیتی ہی نہیں ہیں۔ مثلاً مویشیوں کا چیچک، اسہال، بینزارو، چرواہے کا پتھر لگ جانا، مویشی کا پہاڑ سے پھسل کر گرنا وغیرہ۔

بلوچ گوشت خور قوم ہے مگر پہاڑ اور درّوں کے اندر پکوان بنانے کی بڑی سہولتیں چنداں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہم گوشت کو زیادہ تر آگ پر پکاتے ہیں۔ جسے سجی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی

گوشت کو ابالا جاتا ہے، مٹی کے دیگ (دیز) میں۔

ہر کام قاعدے قانون کے مطابق

مویشی کو ذبح کرنا، اس کے گوشت کے ٹکڑے بنانا اور پکانا، سب کچھ قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ مال ذبح کرنے کا طور طریقہ مقررہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے یار کے پاس اگر چاقو نہ ہو تو نوکدار پتھر ہی تکبیر کی چھری ہوتا ہے۔ تکبیر (سچی بات ہے اور سچی بات اللہ کو اچھی لگتی ہے) ہماری اکثریت کو نہیں آتی۔ بس مویشی لٹایا، چھری پھیر دی اور گردن میں ریڑھ کی ہڈی کے اندر والے سفید مغز کو کاٹ دیا اور مویشی چھوڑ دیا تڑپنے کے لیے۔ ہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ غیر ہنگامی حالت میں ذبح ہونے والا مویشی پیاسا نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ باقی مویشی اس وقت آس پاس موجود نہ ہوں تاکہ اپنے نسل اور جنس کو تڑپتے نہ دیکھ پائیں۔ وگرنہ وہ واقعتاً بہت تکلیف میں ہوتے ہیں۔ دکھی ہو کر دھاڑیں مارنے لگتے ہیں، پیر زمین پر مارنے لگتے ہیں (یہ محض انسان ہے جو ضیاء کے کوڑے لگتے اپنے انسان بھائی کا تماشا دیکھنے ہزاروں کی تعداد میں سٹیڈیم جاتے رہے ہیں۔ اللہ جانے کون انسان ہے، بکری یا انسان؟)۔

مال ذبح کرتے وقت ایک بلوچی اور شارٹ کٹ دعا مانگی جاتی ہے اور چھری پھیر دی جاتی ہے۔ جب مویشی تڑپ کر ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس کی کھال اتار دی جاتی ہے۔ یہ کھال بہت احتیاط، استادی اور اٹکل سے نکالی جاتی ہے۔ مگر اب تک ان کھالوں سے مشکیزے، لسی بنانے والے ہیز، آٹا رکھنے والا اپان، روٹی رکھنے کے لیے بڑگی اور دیسی گھی رکھنے کا زنک بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے نہ تو ان میں سوراخ اور چھید برداشت کیا جاتا ہے اور نہ ہی باید ہے کہ گوشت چمڑے کے ساتھ جانے دیا جائے۔

مویشی بانی چونکہ ہماری روزی بھی ہے اور پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ بھی، اس لیے اس کے بارے میں ہماری ہر حرکت، ہر قدم رواج بن گیا ہے۔ اس رواج سے ذرا اِدھر اُدھر ہوئے تو فوراً فتویٰ لگ جاتا ہے؛

گندیں مڑد ءِ ماذغا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھیڈی   بڑتئ   گوں   پاذغا

ترجمہ:

دیکھو نامرد آدمی کو

اس سے پائے کے ساتھ بھیڈی چلی گئی

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو بھیڈی خواہ پائے میں جائے یا ران کے ساتھ، یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں کہ آدمی کسی اچھے، گھبرو اور چست و چوبند نوجوان کو نامرد قرار دے۔ مگر بلوچ کی زندگی اس طرح کے کئی رواجوں کے ساتھ اتنی سختی سے جکڑی ہوتی ہے کہ اس کا توڑنا ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔

اُبالے جانے والے گوشت کو ''بند بند'' کرنا پڑتا ہے۔ اسے مجموعی طور پر بارہ بند میں کاٹ دیا جاتا ہے جو نمایاں اور معین دستور کے مطابق کاٹ دیے جاتے ہیں۔ سجی کے لیے البتہ چاروں پیر، پیٹھ اور گردن، سینہ پسلیوں سمیت، جگر بمع چکی دوطرفہ آگ کے درمیان پکائی جاتی ہیں (چکی اور اس کا تیل پہاڑوں، چٹانوں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے انرجی کا زبردست منبع ہوتا ہے)۔

مری کی بجارانی شاخ کے لوگ گردہ نہیں کھاتے، خاص کر کثیر القومی اجتماعات میں گردہ کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ گردہ کیوں نہیں کھاتے، کسی کو خبر نہیں۔ نہ عقلمند و دانا لوگوں کو معلوم ہے اور نہ سفید ریش اور جہاندیدہ لوگ کچھ بتا سکتے ہیں۔ یہ پابندی اس قدر زیادہ ہے کہ کسی جگہ لوہارانی، گزینی یا کوئی دوسرا پڑوسی قبیلہ میزبانی میں اجتماع کے اندر اگر جان کر، بجارانی کی تھال میں گردہ ڈال دے تو جان جائیے کہ اس نے قتل جتنی دشمنی مول لی۔

سجّی

سجی لگانے یا گوشت ابالنے کے لیے آگ جلانے کی بھی خاص علامتیں ہیں۔ اگر آپ سفر میں راستہ گزر کر جا رہے ہیں اور آپ نے حالیہ سجی کی راکھ دیکھی تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خیر والی سجی تھی یا غم اور سوگ والی۔ اگر تو اس راکھ کی سمت مغرب مشرق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اور شادی کا مجمع تھا، یا پھر کوئی خیرات، مہمان یا جرگہ کی گوشت خوری تھی۔ اگر یہ راکھ شمال

جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی فوتیدگی ہوئی ہے اور یہ اس کی خیرات (آسروخ) کی نشانیاں ہیں۔ (سمتوں کا برقرار رکھنا سخت ضروری ہے)۔

اسی طرح سجی خود ایک ترتیب کے ساتھی پکانی پڑتی ہے۔ اس کے پاؤں Limbs اس طرح لگانے پڑتے ہیں کہ قطار مغرب سے مشرق کی طرف رہے، پہلے پہلے گردن، پھر دونوں اگلی ٹانگیں، پھر دونوں پچھلی رانیں، پھر پٹھ اور پھر پسلیاں اور آخر آخر میں کلیجہ سیخ میں پرو کر لگا دیں گے جس کے اوپر چکی رکھ دی جاتی ہے تاکہ کلیجہ چربی سے پک جائے۔ قدیم قبائلی دشمنی کا ایک کم بخت تصور یہ ہے کہ مری اپنی سجی کی Medial Sides کا رخ بگٹی علاقے کی جانب کر دیتے ہیں اور بگٹی ہر فنکشن میں ان سمتوں کو مری کی طرف موڑ دیتے ہیں اور دشمنی کے عہد اور یادداشت کو تازہ کر دیتے ہیں۔ یا اللہ اس توضیح کو بدل ڈال، بھائیوں کو بھائی بنا دے، قبائلی جنگوں کے شعلے بجھا دے اور ہمیں اکیسویں صدی کے تقاضوں کے تکمیل کی توفیق دے دے!

سجی کی بات ہو رہی ہے تو ایک عظیم انسان کی بڑائی کی یادگیری بہت ضروری ہے۔ وہ عظیم المرتبت پہاڑ جیسی شخصیت مست توکلی کی ہے۔ مست جب تک زندہ رہے، ایک فضول اور غیر انسانی رواج کو ختم کیے رکھا۔ مست نے مری کے علاقے میں بہت آہستہ اور مستقل مزاج لڑائی کے بعد یہ کام کر دیا تھا کہ کھانے میں، خیرات میں، مہمانی، شادی بیاہ یا کسی دوسرے جشن میں پہلے پہلے سوراج (عورتوں) کا حصہ نکالا جائے اور نرینہ افراد بعد میں اپنے حصے کا گوشت کھالیں۔ جو شخص ظاہر یا خفیہ طور پر یہ بات نہ مانتا مست اس سے ناراض ہو جاتے اور اس گھرانے کا کھانا نہ کھاتے۔ تب انہیں مجبوراً نیا دنبہ ذبح کرنا پڑتا۔ مست اس گھرانے کی عورتوں کا حصہ پہلے الگ کرا دیتے اور انہیں بھجوا دیتے، پھر خود کھانا کھاتے۔ لوگوں میں بہت سی روایتیں اور بہت سے قصے اس طرح کے موجود ہیں کہ مست نے عورتوں کے اس حق کے لیے کیسی کیسی لڑائی لڑی۔ ایک قیصرانی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ قصہ سلطان قیصرانی نے مجھے سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ مست ایک بار قیصرانی قبیلہ کے علاقے گئے۔ مہمانی، مویشی کشی اور خیرات کی گئی۔ مست نے گوشت میں سے عورتوں کا حصہ (سموراج کا حصہ) الگ کر کے کسی کو دے دیا کہ لے جا کر عورتوں کو پہنچا دے۔ تگیا نامی اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیصرانی نے وہ گوشت پہنچایا نہیں بلکہ راستے میں خود کھالیا۔مست کو کسی طرح خبر ہوئی۔ پھر بھی تنگیا سے انہوں نے پوچھا گوشت پہنچا دیا ہے؟ اس نے کہاہاں۔تب مست نے کہا ''بروگڑہ تہ دہ سموراجا گوں کفاشئے'' (جاؤ شالاتم بھی سمو کے قبیلے میں شامل ہوجاؤ)۔کام ہیں رب کے تنگیا نامرد ہوگیا۔اس قصہ کو آپ مانیں یا نہ مانیں، میں اور سلطان اسے مانتے ہیں۔کاش کہ مست زندہ رہتے۔تب یا تو بلوچ، عورتوں کے حقوق دے دیتے یا پھر خدا کے حکم سے بہت سے بڑے لوگ سرخی پاؤڈر لگا لیتے، زنانہ کپڑے پہن لیتے اور گلیوں بازاروں میں ''ہائے اللہ'' کہہ کر زنخہ تالیاں بجاتے پھرتے۔

6- شیروروغن

بلوچ کہتے ہیں کہ اللہ کسی انسان کو بہ یک وقت چار نعمتیں نہیں دیتا؛ نرینہ اولاد، گندم کی روٹی، دودھ، اور ایمان۔ بیٹے تو آپ جتنے زیادہ پیدا کریں قبائلی نظام میں وہ کبھی کافی نہ ہوں گے جہاں کہ نرینہ افراد کی بہتات بذات خود ایک سٹیٹس سمبل ہے۔ گندم کی روٹی ایک زبردست چیز ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو جب بھی ہمیں گندم کی روٹی دی جاتی تو ہم یہ روٹی بغیر کسی سالن لسی کے، روکھی کھا جاتے۔ اس لیے کہ مائیں کہتی تھیں، ''ابا، گندم کی روٹی تو خود سالن ہوتی ہے''۔ گندم کی روٹی کو اللہ نے نیست کردیا تھا۔ سیاسی حالتوں نے امن وامان کا سنہرا پرندہ لے جا کر پردیس کر دیا۔ اور زمینداری تو ہوتی ہے امن اور قرار کے ماحول میں۔ ویسے بھی زراعت ہم سے یاری نہ کر سکی ہے۔ البتہ ایمان...... زندہ باد.......... ہمارے پاس یہ چیز بہتات میں ہے۔ آپس میں لڑنے مارنے قتل کرنے، بے عزت کرنے اور اپنی جڑیں کاٹنے کے لیے ہمارا ایمان ہمہ وقت چھلک رہا ہوتا ہے۔ علم کے خلاف، محنت اور شعور کے خلاف، عورتوں کی آزادی کے خلاف اور برے رواجوں سے لڑائی کے خلاف ہمارا ایمان ہر دم تازہ ہے۔

دودھ انسان کے لیے بلاشک ایک نعمت ہے۔ ہمارے علاقے میں جب لوگ دعا مانگتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ، ہٹ وشیر (اللہ صحت ودودھ)۔ مگر نہ تو ملتی ہے اچھی صحت اور نہ ہوتا ہے پرنور دودھ۔ جتنی مویشی بانی ہم کرتے ہیں، وہ شاید ہی کوئی دوسری قوم کرتی ہو۔ مگر پھر بھی دودھ کی نایابی

کم نہیں ہوتی۔ شاید بلوچ مویشی سٹور کرنے کے لیے پالتے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت بیچ کر کیش کیے جا سکیں۔ بس خدا ہمارا جہاز چلا رہا ہے۔ بلوچ کا مویشی صحت مند بھی نہیں ہے۔ 79 فیصد بھیڑوں کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ پھیپھڑوں اور دوسری بیماریاں تو ایک طرف رکھیں، سرکار کا خانہ بھی خراب ہے، انسانوں کی دوا نہیں کر سکتی۔ مویشی تو گنگ حیوان ہے۔ سرکار ایک اچھی دودھ دینے والی نسل بھی مروج نہیں کر سکتی۔ بس سوکھے پروپیگنڈے ہیں کہ یہ کیا ہے، یہ کریں گے۔ کرتی راکھ بھی نہیں۔ قہر خدا کا، صرف مری بگٹی قبیلوں میں چودہ لاکھ بھیڑیں ہوں اور لوگ دودھ کو ترسیں۔ ان کے بچے بے خوراکی سے افریقن بچوں جیسے لاغر ونحیف ہو کر بالآخر مر جاتے ہوں۔ بوڑھے اسی دودھ کی کمی کے سبب وقت سے پہلے بہشت کے دودھ کی نہروں میں تیراکی کرنے چلے جاتے ہوں۔ مائیں بہنیں اپنے ناتواں جسم اور کمزور خون سے بچوں کو دودھ پلاتی ہوں اور پلاتے پلاتے خود لکڑی کی طرح سوکھ جاتی ہوں، چہرے ہلدی کی طرح زرد اور انسانی صورت بگڑ جاتی ہو۔ کوئی کیوں چمٹا رہے ایسی سرکار سے!!۔

بھیڑوں کی زچگی کا موسم سردیوں میں ہوتا ہے۔ سرما کی یخ بستہ ہوا اور علاقے میں گھاس کی نایابی بھیڑ کی پستانوں کو دودھ کی نعمت سے خالی کرتی جاتی ہیں۔ ننھے لیلوں کا پیٹ پالنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے دودھ بہت ہی کم بچ جاتا ہے۔ پھر منحوس چائے کا رواج بھی بہت ہو گیا ہے۔ ''چاہ جوش'' نامی کالی بلا چولہے سے اترتی ہی نہیں۔ زندہ رہیں گھر کی سگھڑ مالکنیں، ہمت کر کے پھر بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتی ہیں۔

دنبی جب بچہ جنتی ہے تو اس کا دودھ بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ اسے پہلے دن ابالتے ہیں اور ''بوہلی'' اور بعد ازاں دو تین دن تک ابال کر ''کٹ'' بناتے ہیں۔ کنبہ شوق سے ان ڈشوں کو کھاتا ہے، یہ بہت لذیز چیزیں ہوتی ہیں۔

بعد میں تو پھر دودھ خود ایک سالن ہوتا ہے۔ چسکیاں لگا کر نوالے کے ساتھ کھائیں یا لقمہ اس میں بھگو کر کھائیں، ورنہ روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس میں ڈال دیں تو پھر تو یہ بادشاہی خوراک بن جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہوال (چرواہا) جب کٹورا ساتھ لے کر مال چرانے روانہ ہوتا ہے تو اسے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ بغو (گلے سے ایک دھن) بجاتا ہوا کوہی پنیر کے دوتین دانے توڑ کر کٹورے میں نچوڑتا ہے اور اس میں دودھ دوھتا ہے۔ دھوپ پر اسے گھنٹہ دو گھنٹہ رکھ دیتا ہے اور ایک زبردست ڈش نوش کرتا ہے۔ جسے ''پنیر'' کہتے ہیں۔

پنیر بلوچستان کے خوش خوراک قبائل کی پسندیدہ غذا ہے۔ یہاں کے قبائل جو پنیر تیار کرتے ہیں وہ نہ صرف دوران سفر چلتے چلتے بہ آسانی تیار کی جاسکتی ہے۔ بلکہ بلوچستان کے قبائل کی بنائی ہوئی پنیر یورپ اور امریکہ کی جدید سائنسی تکنیک سے تیار شدہ پنیر سے ہزار درجہ بہتر اور لذیذ ہوتی ہے۔

پنیر بنانے کے ہمارے ہاں دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یوں ہے کہ پنیر باد (کوہی پنیر) نامی پودے کے پھول دودھ میں ملا کر کچھ دیر رکھ دیا جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دودھ جم جاتا ہے۔ اسے کپڑے کی تھیلی میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ اس میں زائد پانی نکل جائے۔

اسی طرح دودھ میں تھوڑی سے لسی (سہانڑ) شامل کر دیں، ایک گڈوی کے اندر رات بھر رکھ دیں تو صبح قرار سے بیٹھ کر دہی کی چسکیاں لے لیں۔ اگر آپ نے سہانڑ کم مقدار میں ڈالا یا ٹائم کم کر دیا تو پھر دہی کی توقع نہ رکھیں، ''آماکو'' کھانا پڑے گا۔ جو بذاتِ خود ایک ڈش ہوتی ہے۔ دہی کو اگر مخصوص کھال ہینز میں ڈال دیں اور زور سے ہلا دیں تو لسی مہیا ہو جائے گی۔ لسی مکھن ہمارے ہاں سکھی ہونے کی علامت ہے، بڑے پن کی نشانی ہے۔ اللہ جس گھر پر زیادہ مہربان ہوتا ہے تو اس گھر کی خاتون باتوں باتوں میں اپنے گھر میں لسی کا تذکرہ ضرور کرے گی۔ ویسے تو لسی خود ہی ایک نعمت ہوتی ہے مگر اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ گندم کی روٹی اگر نصیب نہ ہو اور قسمت میں خنزیر جوار لکھی ہوئی ہو تو یہ کمبخت روکھی تو گلے میں سے آگے گزرتی نہیں، بھُر بھُرا ہوتی جاتی ہے۔ اس کے لیے بس ایک گھونٹ لسی کافی ہوتا ہے۔ جس سے وہ نوالہ نظروں سے دور ہو جاتا ہے اور پیٹ کی جھیل میں جا مرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ سردیوں میں دودھ کم ہوتا ہے۔ مشرقی بلوچستان میں

بھیڑیں بیورغ نسل کی ہوتی ہیں جو روزانہ 200 گرام دودھ دیتی ہیں۔ اس دودھ سے مکھن کیا خاک نکلے گا؟ پھر بھی بوڑھیوں کی کفایت شعار ہاتھوں کو سلام ہو، وہ بڑی مصیبت اور محنت سے بالآخر مکھن نکال لیتی ہیں۔ یہ مکھن بہت سارے کام دیتا ہے۔ آٹے کے ساتھ ملا دیں نومولود بچے کا ناک خوبصورت، ستواں اور سیدھا کرنے کی خاطر دن میں چار پانچ دفعہ معمولی سے پریشر کے ساتھ لگاتے جائیں۔ اگر ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ ہو تو بچے کو مکھن کھلاؤ۔ یہ الگ بات ہے کہ مکھن اس کا باپ بھی ہضم نہیں کر سکتا۔ یہ بچہ جلد یا بدیر یا تو اللہ کا مال بن جاتا ہے یا پھر ساری زندگی صحت کی حسرت میں جیتا ہے۔ مکھن ڈاکٹری کا کام دیتا ہے۔ یہ بہت سی دوائیوں میں ملائی جاتی ہے خاص کر بچوں کے ''تُک ءِ کفغ'' نامی بیماری میں اک کے پتوں اور مکھن کا استعمال جسے ناس کہتے ہیں، گویا امرت دھارا ہے۔ ای این ٹی کے ڈاکٹروں کے روزگار کا ضامن۔ سرکار تو ویسے ہی نہیں بنتی۔

مکھن روٹی کے ساتھ بھی زبردست مزہ کرتا ہے، اگر چینی کی چٹکی بھی اس پر ڈال دیں تو پھر تو صاحبوں والی خوراک بن جائے گی۔ اگر سگھڑ گھر والی نے کچھ بچایا تو اصلی گھی بن جائے گا۔ یہ گھی کولیسٹرول سے بھرا ہوا ہے۔ شہری لوگ بایدہے کہ اسے استعمال نہ کریں اس لیے کہ وہ کام کاج کرتے نہیں ہیں۔ سارا دن بیٹھے رہتے ہیں کرسیوں پر، اس لیے یہ صرف پہاڑ کی دکھی اور جفاکش زندگی کے لیے اچھا ہوتا ہے، جہاں سب چلتا ہے۔ آہا! دیسی گھی اگر شہد کی موجودگی میں گندم کی روٹی کے ساتھ مل جائے تو سندھ وہند اس پر قربان۔

دیسی روغن

معیاری اور اچھی غذا کی ایک بنیادی صفت اس کی ظاہری شکل وصورت ہے۔ اچھی اور دیدہ زیب رنگوں والی غذا نہ صرف آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے بلکہ ذائقے اور غذائیت کے لحاظ سے بھی عموماً بہترین ہوتی ہے۔ بلوچستان کے لوگ مکھن کو گھی میں تبدیل کرنے کے لیے اس میں ہلدی، گندم کے دانے، قدرے آٹا، سونف، زیرہ اور الائچی ملا کر خوب اچھی طرح جوش دے کر اصلی دیسی گھی تیار کرتے ہیں جس میں توت (زکی) ملا کر سالوں مشکیزہ (زک) میں رکھنے سے اس میں مہک اور رنگت نکھرتا جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مذر

مکھن کو مخصوص طریقے سے پکانے میں گندم کے جو دانے پکائے جاتے ہیں، انہیں بھی مذر کہا جاتا ہے لیکن مکران کے علاقے میں کھجوروں سے شیرہ نکالا جاتا ہے اور اس شیرہ سے نہ صرف حلوہ تیار کیا جاتا ہے بلکہ اس شیرہ سے میٹھی روٹیاں بھی پکائی جاتی ہیں، جنہیں مذر کہا جاتا ہے۔

کروت

کو باید ہے نہ بھلایا جائے۔ کروت ایک ایسی خوراک ہے جیسے کہ شہری امیر لوگوں کے فرج کے اندر ذخیرہ کیا ہوا کھانا ہو۔ جب ضرورت ہو نکالو، کھالو۔

بلوچستان کے وہ قبائل جن کی معیشت کا زیادہ تر انحصار مال مویشیوں کے پالنے پر ہے، ان کی غذا عموماً دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیا پر ہے۔ وہ دودھ سے لسّی (قروت، کرت، خرود) اور پنیر، مکھن اور گھی جسے خریش بھی کہتے ہیں، تیار کرتے ہیں۔ کرت یا خرود ایک قسم کی خشک کی ہوئی لسی ہے۔ یعنی لسی کپڑے کے تھیلے میں لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ اس کا سارا پانی نکل جائے، تب تھیلے کو نچوڑ کر لسی کا بقایا پانی بھی نکال دیا جاتا ہے اور پھر لسی کے ڈھیلے بنا کر خشک کیے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت اس سے لسی بنا لیتے ہیں یا پھر اس لسی میں پیاز اور مرچ مسالا ملا کر ترکاری بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لسی چٹنی میں بھی ملا دی جاتی ہے جس سے چٹنی کی لذت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

یہ ساری نعمتیں بلوچ کو چاہئیں .... یہ ساری نعمتیں انہیں نصیب ہوں .... ان ساری نعمتوں سے محروم رکھنے والے طبقات مردہ باد ہوں۔

دیہی بلوچستان میں دودھ، مکھن یا دیسی گھی کی خرید و فروخت کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نورانی نعمتوں کے بیچنے سے خیر اور برکت نکل جاتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ منڈی اپنی نیک اور بدٗ ٹانگیں پھیلائے گی۔ اپنے رواج مروج کر کے بہت سی بے برکت چیزوں کو برکت دیتی جائے گی۔

مالداری کا ارتقا، دودھ دہی کی فراوانی اور صحت و سلامتی ابھی تک سب کی سب بارشوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ ہم ابھی تک بارشوں کے محتاج ہیں جو تین تین سال تک اِدھر اُدھر بھیک مانگنے

گم ہو جاتی ہیں اور پھر بہت دیر بعد ان کی واپسی ہوتی ہے۔ بارشوں کی واپسی بھی ہمارے علاقے میں بدبخت ہوتی ہے۔ بارشیں جب اپنی طویل آوارہ گردی سے واپس لوٹتی بھی ہیں تو اُن کا چہرہ سوجا ہوا، فرعون نما ہوتا ہے۔ غصے سے بپھری ہوئی بارشیں آتی ہیں سیلابوں تباہ کاریوں کے ساتھ، طویل ندی نالوں میں آیا ہوا سیلاب مویشیوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ان بادلوں کو کیا خبر کہ ان کی غیر موجودگی میں خوبصورت چرواہے اور محنت کش کسان سندھ میں سندھی فیوڈلوں کی جھڑکیاں کھاتے ہیں۔ وہ محنت کرتے ہیں، رات دن محنت کرنی ہوتی ہے۔ ''پر وطنی'' برداشت کرنی ہوتی ہے، بال بچے دوسروں کی جھڑکیوں دھکّوں کے زد میں آتے ہیں۔ بادل پھر بھی ناراض ہیں، آتے ہیں تو گالی گلوچ کرتے ہوئے، دھمکیاں دیتے ہوئے۔ وہ دن ضرور آئیں گے جب فارمنگ کا سائنسی نظام وضع ہوگا اور پھول جیسے بلوچ بارشوں کے محتاج نہ رہیں گے اور انسان دوست حکومت ٹیوب ویل، ڈیم اور دیگر طریقوں سے چراگاہوں کی بہتات کر دے گی۔ مالداری کو کوآپریٹو بنیادوں پر چلائے گی۔ اچھی نسل کے جانور لائے گی، قد آور یا دودھ دینے والی یا پھر پشم والی نسلیں بڑھائے گی۔ مویشی کی بیماریاں دور کرنے کے لیے ہسپتالوں کا جال پھیلائے گی اور ان میں وطن دوست ڈاکٹر بٹھا دے گی............

چمڑی

بلوچستان پھلوں کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیب، انگور، انار، بادام، زردالو، آڑو، ناشپاتی وغیرہ کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔ زردالو کی پندرہ اقسام میں ایک کو ''شغالی'' کہتے ہیں جسے تازہ کھانے کے بجائے خشک کر کے بطور ترکاری استعمال کیا جاتا ہے۔

سردیوں کے موسم میں ایسے خشک زردالو کو بھگو کر نرم کرنے کے بعد پانی میں رگڑ کر ایک گھاٹا شیرہ تیار کیا جاتا ہے جس میں جسب ذائقہ مختلف مسالہ جات ڈال کر دھیمی آگ پر پکایا جاتا ہے اور یوں چمڑی کے نام سے ایک نہایت لذیذ میٹھا پکوان تیار ہو جاتا ہے۔

7۔ شتربانی (جت)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مگر پھوال کی ایک حیثیت دیکھیں تو وہ ایک طرح سے بہت سکھی اور خوش ہے۔اس لیے کہ اسے کم از کم دوسرے درجے کا انسان کوئی نہیں سمجھتا۔ دن دھاڑے، ظاہر ظاہر کوئی شخص مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اس کی ماں بہن کی طرف برے ارادوں کے ساتھ نہیں جاتا۔ وہ بگ جت سے بہت، بہت بہتر ہے۔ جت کی جتنی تو ہر قسم کے ظلم، زبردستی اور ناروائی میں زندگی گزار رہی ہے۔ چونکہ انہیں بلوچ میں برابری کی حیثیت نصیب نہیں ہوئی ہے لہٰذا اُس کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک ہوتا ہے۔ جت کا جھوک ہر وقت بد عادت عورت باز مردوں سے بھرا رہتا ہے۔کسی کی چادر کے پلو میں چینی باندھی ہوئی ہے، کوئی چائے کی پڑی لیے انتظار میں بیٹھا ہے۔ان تحفوں سے جتنی کے دل کو رام کرنے اور اسے یار بنانے کے حیلے ہوتے ہیں۔ بوڑھے کھوسٹ بھی اپنی سفید داڑھی کو چرب بنا کر لاٹھی ٹیکتے ہوئے جتنی کی یاری کی نیت کیے اس صنم خانے کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ یہاں منہ کالا کرنے سے نہ تو بلوچی رسم اور غیرت کسی کو روکتی ہے نہ عقیدہ کسی کو کچھ کہہ سکتا ہے۔اور نہ ہی بگ جت کی اپنی سماجی معاشی حیثیت اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ دوسرے بلوچوں کی طرح پہاڑی پر چڑھے اور اپنی ماں بہن کی حفاظت کرے۔ گوہر سے لے کر آج تک کی ''جتنی''، ظلم و جور کے اتنے شعلوں میں جلتی رہی ہے کہ ان کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جت ابھی تک بلوچ نہیں بنائے گئے۔ یہ شتربان لوگ عام بلوچ سے زیادہ فطرت کے قریب ہیں۔ بلوچوں کے ساتھ ان کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ جت کے ہر گھرانے کا اپنا سردار ہوتا ہے۔ یہ سردی گرمی اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ کے پیچھے گھومتے رہتے ہیں۔ان کے ساتھ چٹائی والی کڑی (خیمہ) ہوتی ہے، چکی ہوتی ہے، ایک آدھ برتن، اور ایک آدھ ڈانگ۔اونٹوں کی گلہ بانی کرنے والے ''جت'' کی اپنی زندگی بھی تلخ زہر ہے۔ اونٹ جیسے بے دماغ جانور کو چرانا اور اسے سنبھالنا خود بہت مشکل کام ہے۔اونٹ جو بدنیت ہے، بے آرام اور بدعادت جانور ہے، بھلا کہاں جھوک میں آرام سے رہتا ہے۔ نرم اور سارس جیسی اس کی ٹانگیں ٹوٹتی بھی جلد ہیں، پہاڑ سے پھسل کر گرنا بھی اس کی دائمی بدبختی ہے، چور بھی اسے آرام سے لے اڑاتے ہیں، خود بھی آوارہ گردی اور

سیر سپاٹے کا اسے بہت شوق ہوتا ہے کہ گچتو نامی جھاڑی کی جگالی اسے دور دراز کے علاقوں کی زیارت کے لیے اکساتی رہتی ہے۔

اونٹ صدیوں سے بلوچوں کا دست و بازو رہا ہے۔ تاریخ میں لانگو بلوچ ساحل مکران سے لے کر ڈیرہ غازی خان اور ساحل مکران سے لے کر قندھار تک ساری تجارت اسی اونٹ سے کرتے رہے ہیں۔ یہ ہماری ٹرانسپورٹ کی گاڑی ہے، تبادلہ کا میڈیم ہے، خانہ بدوش کا روزی رساں ہے۔ یہ دلہن کا لب ہے، خون بہا ہے۔ یہ ہمارا مستقل ساتھی ہے، ہمارا ہمزاد ہے۔ ہمارا پالن ہار۔ اس کا دودھ بیماریوں کا علاج ہے۔ دودھ کی جھاگ پکنک کی خوراک ہے، اس کا گوشت میلے اور جشن کی ڈش ہے، اس کا پشم ہمارا خیمہ اور چٹائی ہے۔(6)

بگ کا جھوک دو مواقع پر بالخصوص میلہ کا سماں پیش کرتا ہے۔

ایک تو اونٹوں کو مخصوص نشان لگانے (دانگ) کے وقت (جب لوگ جمع ہوتے ہیں، ایک دو دنبہ ذبح کرتے ہیں اور اونٹوں کے مالک کے نام کا پہلا انگریزی حرف والا لوہا گرم کر کے اونٹ کی گردن، جبڑا، پیٹھ یا ران پر رکھ لیا جاتا ہے تا کہ یہ گرم لوہا جلد کو جلا ڈالے اور ساری عمر یہ نشان موجود رہے۔(دانگ کب سے مروج ہوا......آیا یہ چاکر کے زمانے میں تھا یا نہیں؟۔ یہ سوال ابھی محققین کے لیے جواب طلب ہے)۔

دوسرا وقت ڈاچی (اونٹنیوں) کے بچے دینے کا ہوتا ہے۔ جب اونٹنی کے دوہے گئے دودھ پر بہت سا جھاگ چاٹنے کے لیے قرب و جوار سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ڈاچی کا دودھ کچھ کچھ نمکین ہوتا ہے۔ یہ جھاگ دو انگلیوں کی مدد سے چاٹا جاتا ہے۔ ڈاچی کے دودھ، دودھ پہ بنے جھاگ اور جنتڑ یں پہ زبردست شاعری موجود ہے۔

اونٹ کا گوشت بہت فضول اور بدذائقہ ہوتا ہے۔اونٹ سات جگہ سے ذبح کیا جاتا ہے اور عید کی قربانی کے لیے لوگ مل کر اسے خریدتے ہیں اور کاٹتے ہیں۔

اونٹ بار برداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ملکیت والے اونٹ بار برداری کے لیے بہت کم استعمال کیے جاتے ہیں۔ کچھ کچھ ''مہری'' البتہ ہیں۔ اونٹوں کے ریوڑ کو ''بگ'' کہتے ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور انہیں چَرانے والے کو'' بگ جت'' یا'' جت''۔تقریباً ہر قبیلے میں سب سے بڑا بگ سردار کا ہے۔اس کے بعد وڈیرہ اور معتبروں کے بگ بھی ہیں۔

مشرقی بلوچستان کے اونٹ ویساکھی کے میلہ میں سخی سرور میں بکتے ہیں۔اونٹ کے پشم سے بہت مظبوط رسے، بوریاں اور اس طرح کی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔اس پشم کو بلوچی میں ''مِلس'' کہتے ہیں۔

8۔اشیائے ضرورت کی مقامی صنعتیں

مویشی کے پشم کو''ملخ'' کہتے ہیں۔وہ پشم جو فروخت ہونے سے بچ جاتی ہے۔وہ گھر کی ہمدرد مالکن کے ہاتھوں عزیز و مقتدر ہو جاتی ہے۔ایک بھیڑ سے 1.45 کلوگرام پشم دستیاب ہو جاتی ہے۔یہ پشم تقریباً 100 فیصد سفید ہوتی ہے۔پشم میں چربی (Grease) 0.60 فیصد ہوتی ہے۔اس پشم کے دھاگے کا ڈایا میٹر 43.5 مائیکران اور اس کی لمبائی 5.1 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔گھر میں بچی ہوئی پشم تو بہت صاف ستھری ہوتی ہے مگر منڈی میں فروخت کرنے کے لیے پشم کے اندر صاف حصہ 63 فیصد، راکھ وغیرہ 3.3 فیصد، سبز مواد (Green Matter) 1.4 فیصد، اور دیگر اَن دھلی، گندی اور ملی جلی پشم 16 فیصد ہوتی ہے۔

گھر کی ستھری پشم کو مالکن دو لمبی، پتلی لاٹھیاں (لٹک) لے کر چٹائی پر بچھا کر پیٹتی رہتی ہے جس سے وہ خوب اچھی طرح تار تار ہو کر الگ ہو جاتی ہے۔

جس پشم سے نمدہ یا گھوڑے کے لیے''گندل'' بنایا جاتا ہے اسے بل دینے کی بجائے پشم بچھا دیتے ہیں اور بار بار اسے اپنے گرد لپیٹتے رہتے ہیں اور دوبارہ بچھاتے رہتے ہیں۔سر کے سائیں کی مرضی ہوئی تو اس گندل کو گھوڑی پر ڈال دیتے ہیں تاکہ اسے سردیوں کی یخ بستہ ہواؤں سے بچایا جا سکے، وگرنہ سرتاج کے بیٹھنے کے لیے گدیلا یا پھر قالین کا کام لیا جا سکتا ہے۔

پشم سے دھاگہ بنانے کے عمل کو''بریسغ'' کہتے ہیں۔اور اس کام کے لیے استعمال ہونے والے آلے کو''دیخ'' کہتے ہیں۔یہ ایک فٹ لمبی پتلی لکڑی ہوتی ہے، جس کے اوپر کے

سرے پر بل کھاتا ہوا (Spiral) گڑھا بنا ہوا ہوتا ہے۔اس کا نچلا سرا نوکدار بنایا جاتا ہے۔اوپر سے لمبائی کے چوتھائی حصے پر ایک چپٹی لکڑی ڈال دی جاتی ہے۔یوں یہ ایک طرح کا صلیب بن جاتا ہے!!۔یہ سادہ بھی ہو سکتا ہے اور نقش و نگار والا بھی۔سگھڑ، جوان اور زندہ دل یا پھر امیر عورتیں اپنے دیخ پر نقش و نگار بنواتی ہیں۔نقش و نگار والا کام مرد کرتے ہیں۔وہ چاقو کی نوک سے لکیریں بنا بنا کر مختلف قسم کے ڈیزائن، پھول، ہرن، پرندے اور دیگر جانوروں کے نقش و نگار بناتے ہیں۔دیخ اور لٹک کو خوبصورت بنانا ایک طرف تو مردوں کے جمالیاتی ذوق کی اعلیٰ سطح اور آرٹ کی استادی کی علامت ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود عورت کے ذہنی اور سماجی سٹیٹس کا خوبصورت اظہار اور نمائش ہے۔دیخ اور لٹک کے یہ نقش و نگار کبھی کبھی مست دوستوں کی نشانی یا پھر بے یاری کے عمیق غم اور بے کیف زندگی کی چغلی بھی کھاتے ہیں۔

دیخ سے گزارنے کے بعد پشم کے اس دھاگے سے رسی (تیل، یا، ریز) بنائی جاتی ہے۔سفید و سیاہ والے دو رنگوں سے بنی ہوئی رسی''کمبریں'' کہلاتی ہے۔بکری سے عموماً کالے رنگ کی رسی بُنی جاتی ہے۔سبز و سرخ دھاگوں کے گچھے بنا کر ان پر سمندر سے حاصل کردہ سیپیاں''گُشک اور گُر'' پرو کر انہیں مزین کیا جاتا ہے۔یہ گھوڑے کا''ریز'' کہلاتا ہے۔بیل کی باگ بھی اسی طرح بنائی جاتی ہے۔اسی چیز کو تیز رفتار اونٹ''مہری'' کی باگ کے بطور استعمال کیا جاتا ہے۔تَیل جانوروں کی بار برداری کے لیے مضبوط رسی کا کام دیتا ہے۔ریز اور تیل دس دس بارہ بارہ سال تک چلتے ہیں۔

دیخ سے تیار کردہ دھاگے''کارگاہ'' میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔رنگدار دھاگہ دراصل سفید پشم کا دھاگہ ہوتا ہے۔جسے دیخ میں دھاگے کی شکل دینے کے بعد اس دھاگے کو فٹبال جیسی گولائی میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔جسے''ڈیرو'' کہتے ہیں۔ان سفید ڈیروؤں کو رنگ دینے کے لیے بڑے شہروں کو بھیج دیا جاتا ہے۔''رنگو'' انہیں مطلوبہ رنگ میں ڈال کر ابالتا ہے تاکہ رنگ پکا چڑھ جائے اور وقت کا گزران کی شوخی کو مدھم نہ بنا سکے۔ہم بنیادی طور پر رنگین مزاج لوگ ہیں۔اس لیے عموماً شوخ رنگ پسند کرتے ہیں۔جس زمانے میں سرکاری رنگ نہیں ہوا کرتے تھے تو موسم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خزاں میں گرے ہوئے خشک پتوں کو جمع کر کے ان کے رنگ سے کام لیا جاتا تھا۔

جہاں بہت سے گھرانے اکٹھے خیمہ زن ہوں وہاں ایک آدھ گھر میں کارگاہ موجود ہوتا ہے اور اس کی کاریگر بھی ایک آدھ بوڑھی ہوتی ہے۔ یہ بوڑھیاں کارگاہ نصب کرتی ہیں، ڈپی ہاتھ میں لیتی ہیں اور ڈپ ڈپ کی آواز کے ساتھ اس چہار شاخہ ڈپی کو چلا چلا کر دری بافی کرتی رہتی ہیں۔ جو چیزیں یہ ماہر ہاتھ بنا ڈالتے ہیں ان میں ''شیخن'' ہے جس پر روٹی تھاپ کر توا (تافغ) پر پکائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ''چو، لوغ دفی، ہُرجین اور تیرغ'' بھی بنائے جاتے ہیں۔ اُن تمام چیزوں کا مشترکہ نام ''کنّی'' ہے جو کارگاہ سے بُنی جاتی ہیں۔ غلہ رکھنے والی بوری (گوالغ)، پشم رکھنے کے لیے (جھول)' بھوسہ لادنے کی بڑی بوری (گنج) یہ سب چیزیں پشم اور بکری کے بالوں سے بنتی ہیں۔

مویشی کی کھال سے مشک، نیم مشک، کلّی، ہیز، بڈگی، اپان اور زنک بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کھال ویسے بھی مارکیٹ میں بکتی ہے۔ مویشی کی کھال کو بلوچوں کی اکثریت مختلف بیماریوں کے علاج کے طور مریض پر چڑھا دیتی ہے۔ جگر کی بیماریاں، کھانسی، نمونیا، ٹائیفائیڈ اور دیگر کئی سمجھ میں نہ آنے والی بیماریوں میں مختلف کھال چڑھائے جاتے ہیں۔ طبیب صاحب ہی اتھارٹی ہیں۔ چاہیں تو نیلے رنگ کی بکری کی کھال کا نسخہ تجویز کریں، چاہیں تو بھورے رنگ کی بھیڑ کی کھال چڑھوا دیں۔ وہ چاہیں تو چار کھال بتا دیں یا بارہ کھالیں چڑھا دینے کا طویل Doze بتا دیں۔

بیل گائے

ایک ہی مالک کی بہت سی گائیں (گورم) رکھنے کا رواج بہت کم ہے۔ گاؤں یا دیہات میں البتہ ہر گھر کے دودھ والی گائے کو شامل کر کے گورم بنتا ہے جسے گوآل چرانے لے جاتا ہے، کرائے پر۔ نصف حصے پر بھی لوگ اپنی گائے دوسروں کو چرانے کے لیے دے دیتے ہیں۔ بلوچ کی گائے بھی بس اللہ لوک ہوتی ہے۔ نہ دودھ کے لیے مشہور، اور نہ قد وقامت۔ نئی نسل، بڑے ہسپتال اور کوئی بڑے ڈیری فارم نہیں ہیں اس لیے کہ سرکار خود اپنے گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسے کیا

فکر کہ عوام کو دودھ اور گوشت وافر مقدار میں ملے۔ اور وہ ایسا کرے بھی کیوں، اسے پتہ ہے کہ پیٹ بھر جائے تو دماغ زرخیز ہو جاتا ہے اور جس وقت دماغ جاگ اٹھے تو بہت سے آقاؤں کے بھاگ سو جائیں گے۔ اس لیے چرواہے کو سلا دو۔ سویا رہنے دو۔

بلوچستان کے اندر بیلوں میں بھاگ ناڑی نسل بہت مقبول ہے۔ اس نسل کو بڑھاوا دینے کے لیے جعفر آباد ضلع میں ملک کا ایک بہترین کیٹل فارم ہے۔ بیل ہل چلانے ہی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور کوئی بڑا کام بیل سے نہیں لیا جاتا۔ ایک آدھ بیل گاڑی ہے۔ سرسوں کا تیل نکالنے کہیں کہیں بیل کولھو کے گرد گردش کے کرتے رہتے ہیں۔

ٹریکٹر اور بلڈوزرز نے بیل کی آبادی کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ جس طرح موٹر سائیکل اور پک اپ نے گھڑ سواری اڑا دی، اسی طرح بیل کو ہل چلانے، باربرداری کرانے، فصل تیار کرانے کے لیے استعمال کرنے کی بجائے انجن سے چلنے والے بیل یعنی ٹریکٹر کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ (ٹریکٹر انقلاب ہے!)۔

گھوڑے

گھوڑے بلوچستان بھر میں پالے اور رکھے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں جب جنگیں تلواروں سے لڑی جاتی تھیں، تو ہندوستان بھر میں قلات اور خضدار کے گھوڑے مشہور ہوا کرتے تھے۔ ہارس ٹریڈنگ شاید انگریز نے یہیں سے شروع کی تھی۔ بلوچ بہت اچھا گھڑ سوار ہوتا تھا۔

سانڈ کے گھوڑے ڈومب اور مراثی رکھتے ہیں۔ شادیوں، میلوں میں گھڑ دوڑ محبوب کھیل ہوا کرتا تھا۔ چاکر و گوئہرام کی تباہی سے لے کر ٹریکٹر و موٹر سائیکل کے آنے تک کا درمیانی عہد گھوڑے اور گھوڑو (جنگی دستہ) کا عہد تھا۔

مویشی بانی سے وابستہ مقامی صنعتیں

بلوچستان بھر میں، بالعموم اور مشرقی بلوچستان میں بالخصوص کال بنانے کا رواج عام تھا۔ کال جو در اصل سوڈا کاربونیٹ ہے جو کہ Salsola Griffithii نامی جھاڑی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس جھاڑی کو دسمبر اور جنوری میں کاٹتے ہیں، خشک کرتے ہیں پھر اسے زمین میں سوراخ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ راکھ کو آٹھ دن تک زمین میں دبائے رکھتے ہیں جس کے بعد اسے ٹھوس صورت میں نکال لیتے ہیں۔ یہ مارکیٹ میں بکتا تھا۔ لانڑیں یعنی Suoeda Fruticose سے نکالا ہوا کال، گھٹیا کوالٹی کا ہوتا ہے۔ انگریز کے وقت ہزاروں من کال بنتا تھا اور ریل کے ذریعے دوسری جگہوں میں بکتا تھا۔(7)

کشیدہ کاری کرنے والوں کی شہری مراکزِ تجارت تک چونکہ رسائی نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تیار کی ہوئی چیزوں کو دلال اکثر اونے پونے داموں خریدتے تھے۔ یا شہروں کے درزی اور پیرہن دوز انہیں حاصل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں دستکاریوں کا مرکزِ صنعت وزراعت اقتصادیات، خرید وفروخت کی تبدیلی اور نرخوں کی پستی بلندی کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

کشیدہ کاری کے علاوہ بلوچوں میں سکہ دوزی کی آرائش بھی مروج ہے۔ اس کے ذریعے گھر کی آرائش کے لیے اور اونٹوں کے منقش جھول بنائے جاتے ہیں۔ اور اس غرض کے لیے پہلے مناسب کپڑے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر اس پر زرکاری، صدف ٹانکنے اور مصنوعی موتی، منکے اور شیشے سی لیے جاتے ہیں۔ ایسے کپڑوں کے کناروں اور حاشیوں میں ان کے گچھے آویزاں کیے جاتے ہیں جس سے سکہ دوزی کی قدر ومنزلت بڑھ جاتی ہے۔

بلوچ خواتین اون کات کر اپنے گھروں میں بچھانے کے لیے فرش وگلیم تیار کرتی ہیں۔

چٹائی نہ صرف بچھانے کے لیے بلکہ کھجور کی فصل کو محفوظ کرنے اور اس سلسلے کے دیگر کام بھی چٹائی سے لیے جاتے ہیں۔ سیستان اور مکران والے بلوچستان میں، چٹائی بنانے کے لیے کھجور کے پتوں کو سکھا کر تیار کرتے ہیں۔ مگر بقیہ بلوچستان میں پیش (مزری) سے چٹائی بنی جاتی ہے۔ نازک ریشوں سے گلدان، کھجور رکھنے کی ٹوکریاں، روٹیاں رکھنے کی چنگیر اور دستی پنکھے بناتے ہیں۔ یہ چھپر کے طور پر سایہ کے لیے، کچے مکانوں کے چھت میں بھی استعمال ہوتا ہے۔(8)

مٹی کے برتن بنانے کی صنعت کے ظہور کی قدیم تاریخ، قبل مسیح کی ہے۔ مہرگڑھ تو گویا مٹی کے برتنوں کا بڑا کارخانہ تھا۔ ایرانی بلوچستان میں چھ ہزار سال قبل مسیح میں مٹی کے برتن پکانے کی بھٹیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حال مہرگڑھ کا تھا۔

9- ٹیکس اور امداد باہمی

سرقبلوی نظام ہر استحصالی معاشی نظام کی طرح اپنے اندر چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں پیدا کر کے اپنے لوٹ کو دوام بخشنے میں ایک مہارت والا نظام ہے۔ ٹیکس تو بڑی لوٹ کا محض ایک حصہ ہیں۔ اس لیے یہ کبھی شرح میں کم ہوتے رہے ہیں، کبھی زیادہ.......... اور پوری انسانی تاریخ میں، متبادل پیدا کیے بنا کبھی بھی کوئی ٹیکس یکسر ختم نہیں کیا گیا۔

گھال

قبیلہ کی ساری مال چرائی کے حقوق سردار کے پاس تھے اور ہر قبائلی ٹیکس یعنی گھال دے کر اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس ٹیکس کی شرح یہ تھی؛ ہر چالیس مویشیوں پر مشتمل ریوڑ پر چار کلدار (چاندی والے روپے) سال میں دینے پڑتے تھے جو کہ اندازاً دو دنبے بنتے تھے۔ نہ دینے کی صورت میں جیل بھیج دیا جاتا تھا جہاں پر رسوائے زمانہ سزا یعنی ''کاٹ'' کی سزا دی جاتی تھی۔ دروغ گوئی کرنے والے یعنی مویشی کی تعداد کم ظاہر کرنے والوں کو مارا پیٹا جاتا تھا۔

گھال وصول کرنے والے کارندے سردار کے اپنے گھرانے کے افراد ہوا کرتے تھے۔ وہ اس ڈیوٹی کی تنخواہ وصول کرتے تھے۔ ان کا اثر ورسوخ بہت ہوتا تھا۔ وہ قبائلی معاملات میں سردار کے مفاد میں مداخلت کرتے تھے۔ اور اس طرح سردار کے ریاستی ڈھانچے میں اہم مقام رکھتے تھے۔ وہ اپنی ماتحتی میں اور لوگ بھی تنخواہ پر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ رضا کاروں کا ایک گروپ بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہوتا تھا اور اس طرح کوئی شخص گھال دینے سے بچ نہیں پاتا تھا۔ یہ لوگ گروہ کی صورت میں جا کر گھال وصول کرتے تھے۔ ان سب کو بجی کھلانا، ان کی گھوڑیوں کو غلہ کھلانا بھی گھال دینے والے (ٹیکس گزار) کے ذمے ہوتا تھا۔

تِنڑیں

یہ چنگی کا محصول ہوا کرتا تھا۔ ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جائیں تو اس صورت میں تنڑیں دینا پڑتا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سُنگ

''پیش'' ایسا پودا ہے جو چٹائی بنانے کے کام آتا ہے۔''میٹ'' (گاچی) صابن کے بطور استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں قبیلے کی ضروریات سے زائد پیدا ہوتی تھیں۔ جت انہیں اونٹوں کے ذریعے مارکیٹ تک لے جاتے تھے اور وہاں بیچتے تھے۔ ایک اونٹ کے لوڈ پر سردار کے چار آنے ہوتے تھے۔ بگٹی میں ایک اونٹ لوڈ اناج درآمد یا برآمد کرنے پر ایک کاسہ (13 سیر) (نوشکی میں پانچ سیر)، نمک کے اونٹ پر ایک کاسہ، پشم، چینی اور تیل وغیرہ پر ایک اونٹ پر ایک روپیہ۔ ایک بھیڑ یا بکری کی درآمد برآمد پر، یا بگٹی علاقہ میں سے گزرنے پر ایک آنہ ٹیکس تھا۔ آٹھ آنے فی بیل پر اور ایک روپیہ فی اونٹ پر۔ قافلوں کی بحفاظت گزر پر ٹیکس اناج کے ایک اونٹ پر ایک چار آنہ اور پشم کے اونٹ پر آٹھ آنے (اس میں پچیس فیصد سردار کا ہوتا تھا اور باقی ان قبائل کا تھا جو محافظ تھے۔(9)

مری علاقے میں سبی اور تل کے درمیان تجارت پر مری سردار ٹول ٹیکس لیتا تھا، گمبو لی کے مقام پر ریٹ یہ تھے؛ اونٹ ایک روپیہ آٹھ آنے، گھوڑا ایک روپیہ، بیل بارہ آنے، گدھا چھ آنہ۔

دھڑ

یہ ٹیکس وڈیرہ لیتا تھا دکانداروں سے۔ غلے کا چالیسواں حصہ۔ اونٹ کے بار پر ڈیڑھ روپیہ آنے، اور ڈیڑھ روپیہ جانے کا لیا جاتا تھا۔

مالیہ

1947 سے قبل بلوچستان میں زرعی زمین دو طرح کی ہوتی تھی؛ مالیہ دِہ اور غیر مالیہ دِہ۔ مالیہ دِہ اراضیات وہ تھیں جو سرکارِ قلات کی ملکیت ہوتی تھیں۔ حکومت قلات کاریزوں پر کلنگ وصول کرتی تھی۔

زرِ سر، زرِ شاہ اور زرِ ترنی

یہ خوانینِ قلات کے ٹیکس تھے جو مکران میں مروج تھے۔ 1938 میں قلات نیشنل پارٹی کی تحریک پر یہ ٹیکس منسوخ کر دیے گئے۔

ڈھک

کسی کے کھیت میں اگر کسی کا مویشی گھس جاتا تو اسے سردار کے مقرر کردہ ایک احاطے میں بند کر دیا جاتا تھا جسے ڈھک (کانجی ہاؤس) کہتے تھے۔ مالک پیسے دے کر اپنا مویشی وہاں سے چھڑاتا تھا یہ پیسے سردار کے ہوتے تھے۔

نال پروش

ایک اور ٹیکس ہوا کرتا تھا۔

پنچك

بہادر شخص کو جو کہ کمانڈر کے عہدے تک پہنچ جاتا اسے جنگی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ دیا جاتا تھا۔ مری میں بجارانی کا وڈیرہ نوحق اور دلیل سومرانی پنچک لیتے رہے۔

مرگ ٹیکس

محترم عزیز بگٹی نے لکھا کہ جب بیورغ بگٹی قبیلے کا سردار بنا تو اس نے ایک موت ٹیکس لگا دیا۔ یعنی کسی بھی مرنے والے شخص کو دفن کرنے سے پہلے ایک چونی بطور ٹیکس سردار کو دینا پڑتا تھا۔ کم از کم اس ٹیکس کی چوری ممکن نہ تھی اس لیے کہ کم آبادی والے قبیلے میں فوتید گی بڑی بات ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بے کس اور غریب عورت کا اکلوتا بیٹا مر گیا اور اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی، بیٹا کیسے دفنا سکتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نوحہ ان الفاظ میں کیا جو بیورغ کے دورِ سرداری کی دھائی بھی تھی؛

کس مہ مرا بیورغہ بذیں باری آ

(خدا کرے بیورغ کے برے دور و باری میں کسی کی موت واقع نہ ہو)

عزیز بگٹی لکھتا ہے کہ آج تک بیورغ ''بذیں بیورغ'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دراصل بیورغ اول تھا۔ بیورغ دوم کو ''بیورغ زونگ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(10)

ریز

جنگ میں دشمن کے ہتھیار غیر موثر کرنے کی کرامت والے شخص کو اس کی کرامت کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عوض آوار یعنی مال غنیمت سے ایک جانور (بیل، گائے، اونٹ) دیا جاتا تھا۔ قبائلی سماج کی بھی اپنی اور دلچسپ مائتھالوجی ہوتی ہے۔ ہمارا یہ ریزہ بردار تیغ بند بزرگ انگریز کی بندوقیں اور توپ نہ روک سکے۔ بہانہ فوراً یہ بنایا کہ انگیز سور کھانے والے تھے، جن پر دم چھو کام نہیں کرسکتا۔(11)

بجار، پوڑی

یہ ٹیکس نہیں ہیں بلکہ امداد باہمی کے ذرائع ہیں۔ ان میں فرق یہ ہے کہ پوڑی ایک غیر معمولی مصیبت، ناگہانی آفت اور واقعہ کے سلسلے میں مالی امداد ہوتی ہے۔ یہاں ضرورت مند کو امداد حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں جانا پڑتا ہے۔ جبکہ بجار والی امداد قبیلے کے لوگ خود لاتے ہیں۔ یہ عام روٹین اور معمول کی امداد ہوتی ہے، جو معاشرے میں عام رواج کے مطابق جاری وساری رہتی ہے۔

گوکہ پوڑی بھی غیر رواجی بات نہیں ہوتی لیکن اسے اتنا اچھا فعل نہیں سمجھا جاتا۔ بہت مجبوری میں ایک شریف انسان امداد کی اپیل کے ساتھ لوگوں کے گھروں کا رخ کرتا ہے۔

وس پنڑ

یہ بھی امداد باہمی کا زبردست ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی ناگمان حالت جو ایک فرد کی پہنچ سے باہر ہوتی تو لوگ اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس کی مدد کرتے۔ مثلاً شادی کا خرچہ، خون بہا ادا کرنا، تباہی یا جرمانہ وغیرہ۔

حوالہ جات

1۔ سٹڈیز ان براہوئی، صفحہ نمبر 71

2۔ لائیوسٹاک سینسس رپورٹ 1985

3۔ چاغی ڈسٹرکٹ پروفائل، صفحہ نمبر 41

4۔ ڈسٹرکٹ پروفائل، پشین، صفحہ نمبر 37

5۔ پیہرسن.......... صفحہ 41

6۔ باؤلزگرڈن ٹی۔ دی پیپل آف ایشیا۔ 1977، وفلیڈ اینڈ نکلسن لندن، صفحہ 93

7۔ سبی گزٹیئر، صفحہ نمبر 148

8۔ ناصر عسکری/غوث بخش صابر، سیستان و بلوچستان، 1996 بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ نمبر 38

9۔ سبی گزٹیئر۔ صفحہ 304

10۔ بگٹی، عزیز۔ بگٹی قبیلہ۔ 2005۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 101

11۔ میسن، چارلس۔ Narratives of various journeys in Afghanistan, Balochistan, Kalat۔ جلد چہارم۔ 1977۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 425

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیسرا باب

بلوچ زراعت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زراعت انسانی تاریخ میں پہلا عظیم انقلاب تھا۔ اس کے نتیجے میں اولین زائد خوراک دستیاب ہوئی اور شہر اور تمدن وجود میں آئے۔ اناج کو زندگی کا خمیر بنا کر، انسان ورائٹی کی تعداد بڑھاتا رہا اور انہیں اپنے اپنے علاقے کی زمین اور ماحول کے مطابق ڈھالتا رہا۔ ہم زمین پر دوسری مخلوق کی طرح ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا سب سے بڑا روزانہ کا مسئلہ بھی اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ اور جب زمین کم سخی ہو اور پانی کم ہو، تو ہم زندہ رہنے کے لیے زمین سے زیادہ کچھ نچوڑ نکالنے کی حیرت انگیز کاوشوں کے اہل ہیں۔

آج ترقی یافتہ صنعتی دور میں بھی انسانوں کا نصف زمین پر کام کرتا ہے۔ اور ان کا تین چوتھائی اپنے ہاتھوں سے۔

گیارہ ہزار سال قبل کی مہر گڑھ زراعت کے بارے میں ہم پچھلے ابواب میں بات کر چکے ہیں۔ جو دنیا کی اولین کھیتی باڑی تھی۔ اب تو ہم چودھویں پندرھویں صدی کی بات کریں گے۔

بلوچستان میں سبی سے لے کر گنداواہ تک کے چاکر و گوہرام کے فیوڈل نظام نے ایک

بار پھر بلوچ مدنیت کاری کو تاخت وتاراج کر دیا۔ اور ایک بار پھر بلوچوں کو خانہ بدوشی اور مالداری والا نظام اپنانا پڑا۔ بلوچوں کے ساتھ معاشی ارتقا کی پوری تاریخ میں یہ مذاق بار بار کیا گیا۔ ہماری پیداواری قوتوں کی ہر ترقی کو جنگوں اور فتوحات نے پسپا کر دیا۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم سر قبیلوی نظام کے حوالے ہو گئے۔

جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابتدائی قبائلی دور میں سردار کا منصب قبیلے کی رضامندی پہ منحصر ہوتا تھا۔ اور گو کہ سردار کسی خاص انتخابی عمل سے نہیں گزرتا تھا مگر سردار بننے میں قبیلہ کی ایک طرح کی منظوری ضرور شامل ہوا کرتی تھی۔ غیر موزوں شخص پر عدم اعتماد بھی ہوتا تھا مگر اس کی جگہ پھر کوشش ہوتی تھی کہ اسی کے خاندان میں سے کوئی دوسرا مناسب شخص مل جائے۔

چونکہ جدل و جنگ ہی سیاست وثقافت ہوتی تھی اس لیے اس معاشی پیداوار کے ذریعے کو دوام بخشنے کا اہل فرد ہی سردار بن سکتا تھا۔ داخلہ وخارجہ پالیسیاں اسی فریم ورک میں بنتی بگڑتی تھیں۔ رسم و رواج، اچھائی برائی، سب کچھ اسی گز سے ناپی جاتی تھیں۔ سردار کے اختیارات، اس کی قوت کی کمی بیشی بھی جنگی صورتحال کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ ادب، شاعری، آرٹ، فلسفہ، نظریہ اور فکر سب کچھ فتوحات کو یقینی بنانے کی طرف متوجہ تھے۔ ہمارا سماجی اور انتظامی ڈھانچہ اسی لپکنے اور جھپٹنے کی مطابقت میں استوار تھا۔ ہماری یہی قبیلوی تشکیلات جو کہ جنگی اصول پر شروع ہوئی تھیں، بعد میں حاکم گروہ کی تقویت کا باعث بنیں۔ اس گروہ کا سیاسی اور اقتصادی اقتدار بڑھتا رہا اور وہ مرکزیت پاتا رہا۔ جس کی وجہ سے ان کے مویشیوں کے ریوڑ بڑھتے رہے اور غلاموں اور قبضہ میں آئے ہوئے لوگوں پر ان کا استحصال بڑھتا رہا۔ دولت مند ہوتے ہوئے سردار بہترین اور وسیع چراگاہوں کو اپنے قبضے میں لیتے رہے۔ رفتہ رفتہ قبیلوں کی چھوٹی شاخوں کی زمینوں کا ایک حصہ عملاً فیوڈل کی ملکیت بن گیا۔

خانہ بدوش فرقوں کی چراگاہوں کے ساتھ بھی یہی کارروائی ہوتی رہی۔ بہت اچھی اور پانی کے لحاظ سے فراواں چراگاہیں خود بخود سردار کے حصے میں جاتیں اور ان چراگاہوں پر بے چارے خانہ بدوش ان سرداروں کے چرواہے بن کر ان کی بھیڑ بکریاں چرانے لگتے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خانہ دوش سردار (فیوڈل) کے اقتدار کی مضبوطی کے سبب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ چھوٹے طائفے مجبور ہوئے کہ اپنے دائمی جھگڑوں کے حالات میں بڑے قبیلوں کی پناہ میں جائیں۔ میزبان قبیلہ ایسے طائفوں پر شرائط لگا کر اپنی حمایت عطا کرتا تھا، اور شرائط یہ ہوتی تھیں؛ مویشیوں پہ ٹیکس اور محصول ادا کرنا، بیگار کی مختلف شکلوں میں حصہ لینا، سردار کی طرف سے منظّم کردہ حملوں اور جنگوں میں شرکت کرنا۔

مشرقی بلوچستان میں لوگ جن زمینوں پر قبضہ کرتے وہ پہلے سے آباد ہوا کرتی تھیں۔ وہ سابقہ مالکان کو بھگا دیتے یا قتل کر دیتے اور یا پھر غلام بنا لیتے۔ قبضہ کردہ اس زمین کو وہ قبیلوں اور پھر قبیلوں کے فرقوں کے گھرانوں کے درمیان تقسیم کرتے تھے۔ ہم یہاں مری قبیلے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جس کی قبضہ کردہ زمینیں مندرجہ ذیل طریقے پر تقسیم ہوتی تھیں؛

چیف کا پنچک (پانچواں حصہ) پہلے الگ کر دیا جاتا تھا۔ باقی کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یعنی گزینی، لوہارانی اور بجارانی میں۔ ہر ایک کو ''سیک'' 1/3 حصہ کہا جاتا تھا۔ پھر ہر سیک کی اندرونی تقسیم یوں ہوتی تھی؛

گزینی:

1- ٹینگیانڑیں، بڈانڑیں......ایک حصہ

2- مہندانڑیں، چلگری اور ژنگ......ایک حصہ

3- لانگھانڑیں، عالیانڑیں اور مزارانڑیں......ایک حصہ

4- نوذبندغانڑیں، چُوری، مہکانڑیں اور لوڑی کُش......ایک حصہ

5- بھاولاں زئی، مرگیانڑیں، عیسفانڑیں اور جروار......ایک حصہ

لوھارانڑیں:

1- مہمدانڑیں، جنگوانڑیں......ایک حصہ

2- شمبوانڑیں......ایک حصہ

3- سارنگانڑیں، جنڈوانڑیں، درکانڑیں اور میلوھڑ......دو حصے

بجارانڑیں:

1- پوادی اور کنگرانڑیں......ایک حصہ

2- شاہیجہ اور کلوانڑیں......ایک حصہ

3- کلندرانڑیں، سالارانڑیں، سومرانڑیں، پیرادادانڑیں اور رامکانڑیں......تین حصے

پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک بلوچ سماج ایک ایسی تبدیلی سے گزرا جس میں کہ زراعت قبائلی مشترک صورت کے بجائے شخصی ملکیت میں چلی گئی اور قبیلوں کے حاکم لوگ فیوڈل لارڈز میں ڈھل گئے۔ بلوچ قبیلوں کی آبادکاری کا عمل سولہویں صدی کے آخر تک مکمل ہوا اور زرعی معیشت متشکل ہونے لگی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خانہ بدوشی مشینی انداز میں مکمل طور پر ختم ہوئی۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ زمین پر آباد ہونے والوں میں بھی، اور مالداری میں مشغول بلوچوں میں بھی، خانہ بدوشی جاری تھی۔

قلات میں تیرہویں صدی کے وسط تک مغلوں کے نائب حکومت چلاتے رہے۔ 1666 میں میرواڑی قبیلے کے فیوڈل ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے گیریزن تباہ کر کے قلات پر قابض ہو گئے۔ اس قبیلے کے بڑے فیوڈل (میر احمد) نے اقتدار سنبھال لیا اور یہاں احمد زئیوں کی حکومت قائم کی۔

میر احمد ثانی (1637-1629) نے زراعت کو ترقی دینے میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس نے قلات میں کاریزات کو ترقی دی۔ خضدار کی ندی سے کئی اور نالے نکال کر پانی کو بنجر زمینوں تک پہنچایا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں موضع کوہنگ قلات میں کاریز ملاورد، کاریز یوسف اور کاریز عثمان کھدوائے۔

اسی خان کے دور حکومت میں خشکابہ اراضیات کے حق مالکانہ پر مالک اور کاشتکاروں کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ اراضی کی آمدن سے فیوڈل کو کتنا حصہ ملے اور کسان کو کتنا۔ سرداروں کے ساتھ مل کر بلوچوں کے اس بڑے خان نے خشکابہ بندات کی آبادکاری کے چھ حصے مقرر کر دیے۔ ایک حصہ آب، ایک حصہ دیکھ بحال بند، ایک حصہ تخم، ایک حصہ ہل، ایک نگرانی اور ایک حصہ حق

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مالکانہ۔ چونکہ بندات کی کاشت میں پانی دینا، بندوں کی دیکھ بھال، تخم ریزی، ہل چلانا اور فصل کی نگرانی یہ سارے پانچوں کام کسان کے تھے، اس لیے پانچ حصے اس کے تھے اور مالک مفت میں ایک حصہ لیتا تھا جسے انہوں نے حق مالکانہ قرار دیا تھا۔ اسی کو بدنام زمانہ ''ششک'' کہتے ہیں۔

اٹھارویں صدی تک بلوچ قبیلوی شکل کی چوکھاٹ میں ایک طبقاتی فیوڈل معاشرے میں ڈھل گیا جہاں اپنے چیف کی عظمت و شان کی خاطر ہزاروں لوگ دیہی مزدور بن گئے تاکہ زائد پیداوار کر سکیں۔ ایک قبائلی فرقہ پورے قبیلے کیلیے ہمیشہ سردار مہیا کرتے رہنے کا گھرانہ بن گیا۔ اس فرقے کا ایک شخص تو سردار ہوتا ہی تھا مگر اس کے عزیز و اقارب اور فرقے کے دیگر ممبر بھی حکمران ہوتے تھے۔ وہ سردار کے لیے ٹیکس، عطیات اور ریونیو اکٹھا کرتے تھے۔ اس طرح انتظامی بالائی ڈھانچہ کی اجارہ داری بن گئی۔ اسی انتظامی بالائی ڈھانچہ نے قبائلی طرز پیداوار سے فیوڈل نظام پیداوار کی طرف عبور کی نگرانی کی۔ گوکہ عبور کی یہ رفتار بہت سست تھی۔

اٹھارویں صدی کے پہلے حصے میں نادر شاہ اور پھر احمد شاہ نے بلوچستان پر (اور یا بلوچستان میں سے ہو کر) کئی مہمات سر کیں، جن کے نتیجے میں دور دور تک ان کی سلطنت قائم ہوئی۔

1740 میں کچھی اور سیوی کا پانچ ہزار میل کا علاقہ قلات کا ہو گیا۔ یہ گویا ایک انقلاب تھا۔ زرعی اجناس کی صورت میں قلات کو زبردست آمدن حاصل ہوتی رہی اور خانی بہت مضبوط ہوتی گئی۔ کچھی میں دریاؤں پر بند باندھ لیے جاتے تھے جبکہ خود قلات میں سیلابی نالوں کے علاوہ کاریز آبپاشی کے بڑے ذرائع تھے۔

کچھی میں کئی فصلیں کاشت ہوتی تھیں۔ کپاس، دالیں اور تیل کا بیج سیلابی زمینوں پر کاشت ہوتے تھے۔ جبکہ کپاس، نیل، گندم، جوار اور میوہ و سبزیاں محدود مستقل پانی والے علاقوں میں ہوتی تھیں۔ تقسیم کار اور تقسیم پیداوار بہت پیچیدہ اور مختلف ہوا کرتی تھی۔ عموماً کسان بیج بھی دیتا تھا ایک بیل کا جوڑا بھی اور جانوروں کی غذا بھی۔ فصل کی پیداوار تین حصوں میں یعنی فرمانروا، زمین کے مالک اور کسان میں تقسیم ہوتی تھی۔

اس محنت طلب نظام آبپاشی نے ہر گاؤں کو ایک اجتماعی پیداواری یونٹ بنا دیا تھا۔ اس کی

بنیاد پر اناج کی تقسیم (بٹائی) ہوتی تھی۔ جہاں بڑے بڑے حصے تو حاکم لوگوں مالکوں اور کاشتکار کے ہوتے تھے مگر آبپاشی کے خرچ کا حصہ ریونیو حکام کا حصہ اور گاؤں کے سپشلسٹوں کا حصہ بھی الگ کیا جاتا تھا۔ حاکم لوگ فصل میں سے اپنا حصہ پہلے لیتے تھے۔ اس طرح انتظامیہ اور آبپاشی کا خرچہ گاؤں والوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

کچھی ہی نے خانی کو قبائلی کی بہ نسبت ایک فیوڈل سلطنت کی طرف دھکیلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

دراصل 17 صدی کے آخری نصف سے جب بلوچوں کے میر قمبر کی اولاد سے میر احمد خان نے کنفیڈریسی کی بنیاد رکھی تھی تو بلوچ ساج میں ایک سیاسی تشخص وجود میں آ گیا تھا۔ اس طرح قبیلوی ارسٹوکریسی کے عنصر نے بڑھنا شروع کر دیا۔ قبیلوی نام نہاد ڈیموکریسی کمزور ہوتی گئی اور اس کی جگہ پر سرداری نظام مستحکم ہوتا گیا۔ بلوچ ساج میں فیوڈل نظام کی عظیم الشان بلوغت نے سارے بلوچ عوام کو ناترسی کے ساتھ دولت پیدا کرنے پر لگا دیا۔ میر احمد خان کے نواسے میر نصیر خان کو سرمایہ کے اسی ارتکاز نے زبردست حاکم بنوایا۔ اسی دولت اور سرمایہ پر ایسی ہی فیوڈل ریاست ابھرنی تھی۔ اس نے احمد شاہ کے ساتھ مل کر ہندوستان فتح کر لیا اور بلوچستان کو خوب ترقی دی۔

خانی کے عہد میں (1666-1840) قلات ایک شورش زدہ خطے اور ہند پہ پے در پے فتوحات کے ذریعے مہاجر کردہ لوگوں کے لیے جائے پناہ کی حیثیت والے ملک سے ترقی کر کے ایک موثر آزاد خانی سلطنت میں ڈھل گیا۔ اس عبور میں ایک ایسی مقامی ارسٹوکریسی شامل تھی جس کی معاشی بنیاد بڑھتی ہوئی زراعت تھی مگر جس کے نمایاں ہونے کے ذرائع قبائلی طور پر منظم کردہ خانہ بدوش مویشی بانی پر مبنی تھے۔ اس دور میں خانوں اور سرداروں کے درمیان رشتہ بہت ہی ڈھیلا ڈھالا اور کمزور تھا۔

نصیر خان کی حکمرانی دراصل ایک فیوڈل انقلاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ عہد بہت شاندار تو تھا مگر ایک پڑھے لکھے جہاندیدہ اور عوام کے نبض شناس خان کی طرف سے مکمل فیوڈل طریقے سے شاندار تھا۔ نصیر خان نوری کی حکمرانی بلوچ معاشرے کی قبائلی تنظیم کی چوٹی پر کھڑی تھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس میں زرعی غلامی (سرف) اور منقولہ جائیداد کی طرح منقولہ غلامی پہلے ہی سے مروج تھیں۔ نصیر خان کی فتوحات نے بلوچستان میں غلامی کی دوسری شکلیں بھی متعارف کرادیں۔

غلامی پورے بلوچستان میں عام تھی اور کوئی بھی ایسا قابل ذکر خاندان نہ تھا جس کے پاس غلام مرد یا عورت نہ ہو۔ یہ غلام عام طور پر شیدی یا نیگرو ہوتے تھے جنہیں ساحلی شہر کراچی سے خریدا جاتا تھا۔

میر نصیر خان اجناس کی پیداوار کو وسعت دینے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ کپاس، نیل اور گھی کی پیداوار خوب بڑھی۔ وہ خود بھی قندہار اور ہندوستان سے مختلف فصلوں اور درختوں کے بیج اور نہال جمع کر کے لاتا رہتا تھا۔ اس کے پچاس سالہ دور حکومت میں تجارت کو زبردست فروغ ملا۔ بحر ہند کی کئی بندرگاہیں اور تجارتی راہیں قلات اور وہاں سے قندہار تک کھلیں۔ گویا ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان قلات کی حیثیت ایک تجارتی مرکز کی ہوگئی تھی۔ سونمیانی کی بندرگاہ ایک تجارتی وصنعتی مرکز بن گئی۔ خصوصاً کپڑے اور قالین کی پیداوار میں۔ گھوڑے بمبئی کو برآمد کیے جاتے تھے۔ رنگ کا سامان اور چمڑے کا سامان مسقط برآمد ہوتے تھے۔ ہندو تاجر کاروانوں کی شکل میں تجارت کرتے تھے۔ چیزوں سے قیمت فروخت کا 0.5 فیصد کے حساب سے چنگی لیا جاتا تھا۔ شاہراہیں استعمال کرنے پر کاروانوں سے پانچ روپیہ فی اونٹ کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔

بلوچوں نے ایک ترقی یافتہ زرعی کلچر قائم کر رکھا تھا۔ نیز پڑوسی سندھ و پنجاب کے علاقوں میں بھی زراعت اچھی خاصی ترقی یافتہ تھی۔ یہ ترقی یافتہ زرعی کلچر بلوچستان کے بلوچوں کی اجتماعی معیشت کی تیز رفتار ترقی اور ان میں فیوڈلزم کے فروغ کے پراسیس میں تیز رفتاری کا باعث بنا۔ میدانی علاقوں میں آباد بلوچ قبائل رفتہ رفتہ اپنی قبائلی خصوصیات کھو بیٹھے۔ یہاں طاقتور سرداروں نے اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو عملاً کسان غلام بنا کر رکھ دیا۔ وہ یوں کہ؛

1- سردار کا گھر یا اوطاق کمانڈر انچیف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

2- وہ قبائلی جھگڑوں کی منصفی بھی کرتا تھا۔ اقوام متحدہ کا کام۔

3- وہ چیف جسٹس بھی تھا۔ جج بن کر وہ تنازعات کے فیصلے کرتا تھا۔

ان تین عہدوں نے اور بھی بے شمار عہدے اُس کے ہاتھ میں مرکوز کر دیے؛

4- قبیلے کے اجتماعات کا بندوبست وہی کرتا تھا۔ ان کی بورڈنگ اور لاجنگ، ان کے خوردونوش کے بندوبست کا انچارج سردار ہی تھا۔

5- قبیلے کے مہمان خانہ کے اخراجات کے نام پر قبیلہ کے افراد اُسے ٹیکس یا امداد دیتے تھے۔

6- قبیلے کی وزارت خزانہ کا قلمدان بھی اسی کے پاس تھا۔ مال مویشی، آٹا، غلہ، بار برداری کے جانور، بہترین گھوڑے اور لہٰذا بہترین اسلحہ اسے ملنے لگا۔

چونکہ ''جنگی ادارہ'' اور مختلف النوع فرائض ادا کرنے والا ''سردار کا ادارہ'' ایک مستقل حیثیت کا حامل بن چکا تھا، اس لیے رفتہ رفتہ رضا کارانہ چندہ ٹیکس کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ یہ ٹیکس باقاعدہ بنتا گیا۔ البتہ ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہنگامی چندے کی گنجائش برقرار رکھی گئی۔ چونکہ یہ سارا عمل جبری نہ تھا اور قبائل کی مشترکہ ضرورت کا نتیجہ تھا اس لیے یہ سارا چندہ رضا کارانہ بنیادوں پر عوام نے خود تجویز اور قبول کیا۔ سردار کے مذکورہ بالا اخراجات خصوصاً اناج کی ضرورت پوری کرنے کے لیے علاقے میں زرخیز ترین زمین کا ایک ٹکڑا سردار کے عہدے کے ساتھ مستقل طور پر مخصوص کیا گیا۔ سردار بہ لحاظ عہدہ اس کا مالک ہوا کرتا تھا۔ یہ زمین اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں تقسیم ہونے کے لیے نہ تھی بلکہ آٹومیٹک طور پر سرداری کے عہدے کے ساتھ منتقل ہوا کرتی تھی۔ یہ تاج کی زمین (پاغ کی زمین) سرداری دستار کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔ یہ رضا کاری پہلے پہل نیم رضا میں تبدیل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ سردار کا عہدہ موروثی بنا اور لہٰذا ''پاغ کی زمین'' بھی موروثی بنی۔ چندہ (بجار، پوڑی، گھال، سنگ، تنڑی وغیرہ وغیرہ) مکمل طور پر ٹیکس میں بدل گئے۔ سردار کے اختیارات بڑھتے گئے۔ وہ قبیلے سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے لگا۔ عمدہ گھوڑے، قیمتی قالین اور بہترین ہتھیار اور لباس خرید لیے۔ اپنی حویلی بنوائی۔ مویشی اور اراضی کی صورت میں مختلف مراعات حاصل کر کے اس طبقے نے اپنی اقتصادی قوت خوب بڑھالی............اور سردار مکمل طور پر ایک فیوڈل میں بدلتا چلا گیا۔

عمومی طور پر بلوچ آبپاشی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛

www.iqbalkalmati.blogspot.com

1-(لڑآف)بارانی علاقہ

2-(سیاہ آف)پانی والا علاقہ

1-لُڑآف

بارانی علاقے میں سبی ،نصیر آباد ڈویژن ،کچھی چاغی،ژوب،لورالائی،پشین،قلات، خضدار،مکران اور خاران کے زیادہ تر حصے شامل ہیں۔ان علاقوں میں سیلابی پانی سے کاشتکاری ہوتی ہے۔اگر بارش نہیں ہوتی تو یہ سارا علاقہ خشک پڑا رہتا ہے۔بارانی علاقوں کی اکثریت میں جس طرح کی کاشتکاری ہوسکتی ہے اور جس طرز کے پیداواری تعلقات ہیں،ہم ان کا جائزہ ذرا تفصیل سے لیں گے۔

بلوچستان میں کاشتکاری کے طور طریقے ،اس میں استعمال ہونے والے اوزار اور زراعت سے متعلق اصطلاحات سنسکرت زبان کے۔پنجاب،سندھ اور دیگر پڑوسی زبانوں میں بھی یہی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

یہاں ابھی حال ہی تک زمینیں مشترکہ ملکیت میں تھیں۔یہ زمینیں دس دس، یا،بیس بیس سالوں تک کے لیے تقسیم ہوتی تھیں اور جب یہ عرصہ پورا ہوتا تھا تو ایک بار پھر یہ سارے قبیلے کی مشترکہ زمینیں تصور ہوتی تھیں۔زمین کی اگلی تقسیم کا وقت متعین ہوتا تھا۔تقسیم کے دن تک جتنے نرینہ بچے پیدا ہوتے، انہیں حصہ ملتا تھا۔اور مر جانے والے لوگوں کے نام کاٹ دیے جاتے تھے۔ذیلی قبیلوں اور ان کی شاخوں اور حتیٰ کہ خاندان تک بالترتیب زمین تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی تھی اور مردم شماری کے بجائے ''مردشماری'' بنیاد ہوتی تھی۔ہر ایک حصہ ''ونڈ''،''تیر'' یا ''کمان'' کہلاتا تھا۔قبیلے کے جتنے ونڈ ہوتے اتنے قرعے ڈالے جاتے۔اس دوران نہ تو زمین فروخت کی جاسکتی تھی اور نہ اسے رہن رکھا جاسکتا تھا۔

بلوچوں میں زمین کی شاید آخری حتمی تقسیم مری قبیلے میں مکمل ہوگئی۔1964 میں وہ میٹھی صبح آ گئی جب مری کے معتبرین اکٹھے ہوئے اور قبیلے نے اپنی مشترکہ زمین ہمیشہ کے لیے

بانٹ دی۔ہمیشہ کے لیے تقسیم کرنے کو''بوٹا تروڑ'' کہتے ہیں۔سرکار کا خیال تھا کہ اس طرح سردار کا اثر ورسوخ گھٹ جائے گا۔معتبروں کو یہ فائدہ ہوا کہ عام میلے کچیلے مری کی زمینیں پیسے، زور اور دغا سے اپنی بنالیں گے،اس لیے کہ اکثر خانی انہیں کسی اور طور نصیب نہیں ہوتی تھی۔لیکن عوام کو Bi Product کے طور یہ فائدہ ہوا کہ پاک اور مقدس نجی ملکیت پہلی بار اچھی طرح طلوع ہوگئی۔''بوٹا تروڑ'' سے قبل کی تقسیم اس عہد کو ظاہر کرتی ہے جب لوگ خانہ بدوش اور پاوندہ گیری کی زندگی سے ہٹ کر''نیم آباد'' زندگی کو منتخب کرتے ہیں۔

قدیم اشترکی نظام ایک زبردست عہد تھا لیکن زمین کی مکمل اور ابدی تقسیم زراعت کی طرف زیادہ پراگریسو، زیادہ تیز رفتار اور زیادہ حسین زمانہ ہے۔یہ دونوں عہد دنیا کے تقریباً ہر سماج پر آئے ہیں اور پھر ہر سماج جھپٹ کر ترقی کے راستے پر روانہ ہوا۔یہ زمانہ نئی اچھائی اور نیکیوں کا مانگنے والا تھا۔اس زمانے میں ماضی کے عہد کی کچھ پرانی اچھائیاں، برائیاں بن گئیں۔بہادری، غیرت اور قتل کی جگہ محنتی ہونا زیادہ باعث شرف سمجھا جانے لگا۔لڑائی جھگڑے کے بجائے ترتیب اور چستی زیادہ فائدہ مند بن گئی۔امن وامان کا پلہ بھاری ہوگیا۔تقسیم سے ان علاقوں میں پٹواریوں کے ذریعے زمین ناپی گئی اور لکھا پڑھی کی گئی۔اس نظام میں ہر شخص آزاد ہے کہ چاہے تو اپنی زمین فروخت کرے، چاہے تو رہن رکھے اور چاہے تو کاشت کرے۔

بلوچستان کے کچھ علاقوں میں ''لٹ بند'' والی زمینیں ہیں۔لٹ بند والی زراعت کچھی اور وسطی بلوچستان کے بلوچوں میں موجود ہے۔یہ ایسی زمین ہے کہ یہ ہے تو کسی کی ذاتی ملکیت مگر کوئی اور شخص مالک کی رضا سے اسے آباد کرلیتا ہے۔تب وہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ پرانا مالک اور نیا لٹ بند دونوں ہی زمین کے مالک تصور کیے جاتے ہیں۔ساری محنت لٹ بند کرتا ہے اور پیداوار پر عموماً چوتھائی یا پھر چھٹا حصہ پرانے مالک کو دیا جاتا ہے۔

بلوچوں میں ابھی تک اراضی کے بہت بڑے ٹکڑے ایسے ہیں جو مستقل (بٹوکی) طور پر تقسیم نہیں ہوئے۔یہ زمینیں ابھی بھی مقرر کردہ سالوں کی بنیاد پر تقسیم کی جاتی ہیں۔اور ہر مالک اپنے ٹکڑے کو کاشت کرتا ہے،فصل اگاتا ہے مگر وہ نہ تو اس زمین کو بیچ سکتا ہے، نہ تبادلہ کرسکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور نہ رہن رکھ سکتا ہے۔ جب یہ معینہ عرصہ پورا ہو جاتا ہے تو پھر نرینہ افرد کی تعداد پر یہ زمین تقسیم ہوتی ہے۔ بلوچوں میں مری علاقہ میں اس کی مثالیں منڈاہی، نیساؤ اور ڈھل ہیں۔

''ہمساخ'' مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے قبیلے کے نفع نقصان کو اپنا گرداننے والے کو کہتے تھے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کے تعین کے لیے فورٹ منرو میں ایک بڑے جرگے میں ایک خاص لائحۂ عمل مقرر ہوا تھا۔ اس کے تحت فیصلہ ہوا کہ ہمساخ وہ شخص ہے جو؛

1- کوئی جرم کرنے کے سبب اپنا قبیلہ چھوڑ دے اور کسی دوسرے قبیلے میں پناہ اور دفاع مانگے۔

2- عورت کے ساتھ زنا کاری کی بنا پر بھاگ گیا ہو اور کسی دوسرے قبیلے میں پناہ اور دفاع مانگے۔

3- مہم پسندی کے بطور شخصی احساسات کی بنا پر اپنا طائفہ چھوڑ گیا ہو اور کسی دوسرے قبیلے میں دائمی زندگی گزارنے کا انتخاب کر چکا ہو۔

جن علاقوں میں زمین کے معین برسوں تک عارضی تقسیم ہوتی رہتی تھی، ہمساخ کو زمینیں دی جاتی تھیں۔

قابل کاشت زمینیں بڑے میدانی علاقوں میں بھی ہیں۔ اور پہاڑوں پر چھوٹے چھوٹے ''تل'' کی صورت میں بھی۔ دائمی پانی والی زمینیں بھی ہیں اور سیلابی آبپاشی والی بھی۔ بلوچ اپنی اراضی سے بہت محبت کرتا ہے، وہ اس کو فروخت کرنے کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

بلوچستان مجموعی طور پر بارشوں سے آباد ہے۔ ہٹ دھرم بارشوں کا اصل موسم مون سون ہے۔ جولائی اگست بارشوں کے خزینے ہیں۔ سال میں تقریباً 200 سے لے کر 400 ملی لیٹر بارش برستی ہے۔ سردیوں میں لگا تار بارش (لسی) بھی بارانی علاقوں کو آباد کرتی ہے۔ سردیوں کی بارشیں نومبر سے لے کر مارچ تک برستی ہیں۔ بارانی زمینوں (لڑ آف) میں نالی (ربیع) اور سھیل (خریف) دونوں فصلیں ہوتی ہیں۔ بلوچستان کی زمین زبردست ہے۔ اسے پانی میسر ہو تو اس کی زرخیزی کا ثانی اور کہیں نہیں ہوتی۔ پانی جو زندگانی کے لیے ناگزیر ہے۔ پانی زندگی کا میڈیم ہے، کہ یہ سورج کی روشنی سے بھی اہم ہے۔ انسان نے آج تک کے اپنے علم، تجربہ اور چھان پھٹک

سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بھیڑ کے گلے میں گھنٹی وہیں بجی ہے جہاں پانی کا قطرہ دستیاب ہوا۔ جہاں نمی ہوئی مرغ نے وہیں آذان دے دی، گدھا وہیں ڈھینچوں کر گیا، بانسری وہیں بجی۔

جب بارش کافی سال نہیں ہوتی اور ڈکال (قحط) پڑ جاتا ہے تو اپنے مرشد کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دھوپ میں ڈالتے ہیں اور اس کے گڑگڑانے پر کہیں بارش کی دیوی کو ترس آتا ہے۔

ڈینس برے نے ''سنس آف انڈیا'' کے صفحہ نمبر 65 میں لکھا کہ وسطی بلوچستان کے لوگوں نے بارش برسانے کا کام خان کو سونپا ہے؛ ''خان اپنے سفید کپڑے اتارتا ہے اور کسانوں والا پشمینہ پوستین پہنتا ہے، کسی کھیت میں ہل چلاتا ہے تو بارش ہو جاتی ہے۔ مگر کئی بار وہ صبح سے رات تک ہل چلاتا رہتا ہے مگر بارش نہیں ہوتی۔'' (بے پیر بارش! بے خان بارش!)

بارش کا پانی ایک منٹ کا جوا ہوتا ہے۔ یا اِدھر یا اُدھر۔ بادلوں کے لیے سارا سال آنکھیں آسمان پر ٹکی رہتی ہیں۔ مگر بارش ترساتی رہتی ہے اور ناگہاں ایک روز (یا ایک رات) بادل برستا ہے تو یکدم پانی تے کرتا جاتا ہے۔ اگر اس پانی سے اچھی طرح سے آبپاشی کرائی جائے تو سارے بندات بھر جاتے ہیں بصورت دیگر یہ سمجھیں کہ بھرے ہوئے خورجین میں سوراخ ہو گیا ہو۔ ساری محنت رائیگاں، حاجت مند کا دامن خالی رہ جاتا ہے۔ اچھے کاشتکار پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ بارشوں کے موسم میں درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر گٹھے بناتے ہیں اور بندات کے لٹھ پر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے کہی اور بیلچے تیار رکھتے ہیں۔ لالٹین کا ''وٹ'' اور ''گھاسلیٹ'' برابر رکھتے ہیں تا کہ جس وقت بارش نامی ''دشمن'' کا سامنا ہو تو نعرہ لگا کر اس کا استقبال آسان ہو۔ جنگ کی طرح ہانپتے ہوئے، سردی سے کانپتے ہوئے، دھوتی پہنے، گُوچی (چٹائی سے بنی ہوئی بارش سے بچنے والی بوری) پہنے ہوئے جھپٹ کر اپنے بندات پر جانا ہوتا ہے۔ بارش کے بعد پانی کی تقسیم والی جگہ پر منصف آتے ہیں اور دوبارہ پانی کو منصفانہ انداز میں بانٹتے ہیں۔ جھگڑا، لڑائی اور فساد ہر بارش کے ساتھی ہوتے ہیں۔

ایک سیر گندم کی کاشت کے لیے ایک ہزار پونڈ ''نصف ٹن'' پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انچ بارش سے ایک ایکڑ پر ایک سو دس ٹن پانی ملتا ہے؟ اگر یہ حساب ہمارے کاشتکار کے پاس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہواور بارشوں کا اندازہ لگایا جا سکے تو بلوچستان بھر میں برسنے والی بارش کے سارے پانی کو ایک منصوبہ اور ترتیب کے ساتھ استعمال میں لایا جائے تو پتہ نہیں کتنے لاکھ ٹن گندم پیدا ہو۔ مگر منصوبہ بندی کہاں اور امریکہ والے سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نتھی ہونا کہاں! ایڈہاک ازم زندہ باد۔

گرجتے بادلوں کے برسنے کے باوجود ہمارے کھیت پانی کے لیے ترستے ہیں۔ ہمارے مال مویشی اور انسانوں کی آنکھیں میٹھے پانی کے جوہڑ کو ترستی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ساری شاعری، قصہ اور ادب، ضرب الامثال اور مجلس بارش کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے نام نوذو ہیں، ہوران، بشام اور ساونڑ ہیں۔ نوخاف، نوذبندغ، امریز اور نوذہان ہیں۔ ہمارے علاقوں کے نام ساڑتاف، سورآف، گندغیں آف اور شیرین آف ہیں۔ آف، آف کر کے مرجانا ہے۔

بارانی فصل کے دوموسم ہیں۔ یعنی نالی (ربیع یعنی گندم) اور سھیل (خریف یعنی۔ جوار ،باجرہ، تارامیرا، منگ، ماش، موٹھ)۔

فاصلے

بلوچوں میں فاصلے اس طرح بھی ناپے جاتے ہیں؛

گوانک پندھ ___ وہ فاصلہ جہاں تک آواز پہنچتی ہے۔

پہر پند ___ تین گھنٹہ کے سفر کا فاصلہ۔

نیمروش ءِ پندھ ___ چھ گھنٹہ پیدل سفر کا فاصلہ۔

روش پندھ ___ بارہ گھنٹہ پیدل سفر کا فاصلہ۔

اوزان و پیمائش

اناج وغیرہ کی پیمائش کے مندرجہ ذیل یونٹ ہیں؛

ایک پنڑکی۔ (3/4) سیر، 4 پنڑکی۔ ایک ٹوپہ یا 3 سیر، 4 ٹوپہ۔ (ایک کاسغ یا بارہ سیر)، 60 کاسغ، (ایک خروار)۔

کپڑا وغیرہ ناپنے کے لیے مندرجہ ذیل اصلاحات مروج ہیں؛

ھرش، کہنی سے لے کر درمیان والی انگلی کے سرے تک۔

لقمہ کو ''زمب'' کہتے ہیں، چبانے کا یونٹ ''ہائشی'' ہے اور ایک پیاس بجھانے کے لیے پانی کی مقدار کو ''کاناف'' کہتے ہیں۔

کاشتکار اور خانہ بدوش دونوں آسمان کے کچھ ستاروں پہ بہت انحصار کرتے ہیں۔ ان میں پُور (Pleiades)، تیر بند (Orion)، عقرب (Scorpio) اور تھت (Usra Major) شامل ہیں۔

نوروز: بلوچستان کا فیسٹول ہے جو زرتشیوں کا فیسٹیول رہا ہے۔ اور یہ بلوچستان سمیت پورے وسطی ایشیا میں رائج ہے۔

بارش کے وقت کی نمی (رتیج) کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ تاکہ بوآئی اور فصل اگنے کے بعد جب بارشیں ہو جائیں اس وقت نمی ضائع نہ ہو جائے، کھیت میں دو تین بار ہل چلایا جاتا ہے سول پھر لیٹ پھر بوائی کا ہل۔ اللہ اگر مہربان رہے، بخت اگر برابر رہے تو بارشیں برسیں گی اور بالآخر فصل جا کر تیار ہو جاتی ہے۔ ہل مرد چلاتا ہے مگر اس کے ساتھ جتنا کام عورت کرتی ہے اس کا نہ تو اندازہ کیا جاتا ہے اور نہ اس کام کو کوئی تسلیم کرتا ہے۔ عورت بیج تیار کرتی ہے، گھر میں اناج پیسنے، کھانا پکانے کے علاوہ خاوند کا کھانا کھیت تک لے جاتی ہے، جید کاٹنا، فصل کی رکھوالی کرنا، کٹائی کرنا، خرمن کو تیار کرنے کا کام کرنا، غلہ اور بھوسے کو سنبھالنا...... یہ سارے کام یہ گونگی بہری مخلوق کرتی ہے۔

لُڑ آف کی فصلات

بارانی علاقہ ہم اُسے کہہ رہے ہیں جہاں نہری آب پاشی نہ ہو بلکہ بارش پر انحصار ہو۔ یہاں کی بڑی آبی فصل ابھی تک گندم ہے۔ گندم کی ہماری وہی پرانی تخم ہے جسے ہم ''ملکی'' کہتے ہیں۔ ہمارے لیے میکسی، پون، ٹوڑھی اور کونج کی کاشت گویا ممنوع ہے۔ ہمارا ملکی تخم ایک تو ہمارے ماحول کی گرمی سردی کو برداشت کرتا ہے۔ عدم بارش اور پیاس اس کے ہونٹوں کو بہت زیادہ خشک نہیں کرتی، اس کا دانہ خوبصورت ہے، آٹا بہت لیس دار ہے، اس کی روٹی کا ذائقہ بہت اچھا ہے۔ اس کا بھوسہ بہت نکلتا ہے جو کہ جانوروں کے لیے زبردست خوراک ہے۔ یہ زیادہ تر ''نڑ'' کے ذریعے بیجی جاتی ہے تاکہ بیج اچھی طرح مناسب گہرائی اور مناسب فاصلے پر گر سکے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جوار باجرے کی کاشت زیادہ تر بارانی زمینوں پر کی جاتی ہے۔ آبی زمینوں کو کوئی بھی ان تھرڈ کلاس فصلوں کے لیے ضائع نہیں کرتا۔ چونکہ ہماری کاشت کاری وسیع پیمانے کی مارکیٹ کے لیے نہیں ہوتی اور ہم خود اپنے گزارے کے لیے محنت کرتے ہیں اس لیے ہم آبی زمین کو صرف گندم کے لیے وقف کرتے ہیں۔ البتہ جانوروں کی خوراک کے لیے ایک آدھ ٹکڑے پر جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ بارانی، زمینوں پر بھی باجرے کی بہ نسبت جوار زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔

باجرہ بے چارہ ہماری خوراک نہیں ہے۔ ہماری روزی تو جوار شریف ہے۔ باجرے کو بلوچ لوگ سردیوں میں مزہ لینے (ویھر) کے لیے کھاتے ہیں۔ جوار باجرہ دونوں کو گوندھ کر، ایک گولہ بنا کر پتھر کے توے (تافغ) پر رکھا جاتا ہے۔ پھر اس گولے پر ہاتھ تھاپ تھاپ کر اسے توے پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ باجرے کی روٹی مکھن کے ساتھ ملا کر کھائیں تو یہ زبردست ڈش ہو جاتی ہے۔ گندم تو "بے ساث کے بھی ساثی ہے"۔ (بلوچی ضرب المثل کہ حسین عورت بغیر زیور کے بھی سمجھو زیور پہنے ہوتی ہے)۔ ماش، موٹھ اور لوبیا بھی کاشت ہوتے ہیں مگر بہت چھوٹے پیمانے پر۔ ہم خود کھاتے ہیں، وہ بھی کھانے کے ساتھ نہیں بلکہ ویسے ہی ابال کر مزے لینے کے لیے۔ گھی سالن ویسے بھی تو نیا نیا "فیشن" ہے۔

ہمارا کسان بہت دکھی مخلوق ہے۔ بہت زیادہ لوگ بہت کم زمین پر گزارہ کرتے ہیں۔ پھر سہارا بارشوں پر ہے، اچھے دنوں کی امید، برسات و بارش کی امید، فصل و پیداوار کی امید، روٹی کے نوالے کی امید، کپڑے کے ٹکڑے کی امید، گرم گود کی امید، چاند سے بیٹے کی امید، سلامتی صحت کی امید............ آنکھیں چندھیا گئیں، دل تاریک ہو گیا، امید...... امید اللہ پر، امید اس درخشاں ساعت کی جب ہماری پیشانی پہ لکھی تحریر بدل جائے۔ مگر کہاں ہے ہمارے ٹھنڈے پانی کی جھیل، وہ میٹھی شفاف، پیاس بجھانے والی جھیل کہاں ہے۔ نہیں، نہیں۔ بادل ہم سے ناراض ہیں، بجلی کی چمک پر ہمارے علاقے میں پابندی ہے، گرج اپنے عدت کے ایام میں ہے۔ بھوکی آنکھوں کے موٹے آنسو گندم نہیں اگا سکتے۔ بھوک کی فریاد اور آہ پیٹ کا دوزخ بھر نہیں سکتے۔ دکھوں کی ہچکیاں سکھوں کی لیلڑی نہیں بن سکتیں۔

ہماری کاشتکاری کے خطرات بھی بہت ہیں۔ ہل چلانے والا بیل جب لنگڑا ہو گیا یا خیرات اور شادی میں ذبح ہوا یا پھر بڑی چٹان سے پھسل کر مر گیا تو بس ساری اکانومی دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔ خاص کر اگر یہ آفت ہل اور بوائی کے وقت آ جائے تو کاشتکار اور کسان کا گلہ سوکھ جاتا ہے۔ بھاگ کر اس یا اُس گھر جاتا ہے، وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے قرض کے لیے تاکہ اپنے لیے بیل خرید سکے۔ بقال (جو خوشحالی اور امن کی علامت ہوتا ہے) ہمارے علاقے سے غائب ہی ہو گئے ہیں۔ بس کسی مقامی سرمایہ دار (بھاگیا) کے پاس جانا ہوتا ہے یا کسی کنجوس پیسہ سٹور کرنے والے کے در پہ سوالی بننا ہوتا ہے۔ اپنی زمین کا ایک حصہ رہن رکھنا ہوگا اور ایک مقرر وقت تک اپنی زمین کی پیداوار سے محروم رہنا ہوگا۔

بیل کے ساتھ دوستی دیکھنی ہو تو بلوچ کے علاقے میں جائیں۔ ہمارا کسان اپنے بیل کا سنگھار کرتا ہے۔ بجنے والی گھنٹی (شب) اسے پہناتا ہے۔ اس کی بلائیں لیتا ہے۔ ہماری فوک شاعری میں ایک کسان "جھرا" نامی ایک داستان (نظم) میں جھرا نامی اپنے بیل کی تعریف میں سو سے زائد مصرعے کہہ گیا ہے۔ اس داستان کو "چیڑ ول" بھی کہتے ہیں۔

اسے بلوچی زبان وادب میں شامل کیا جانا چاہیے؛

جھرا شب و کنڈی آں نہ بنداں ذاتے بیکارا
نہ زئے گوخے، نیئے روڑے، نہ خنت جھرا تڑیں کارا
پنجاہ کاسغہ ریشان، جھّرا روشہ ننگارا
جھرا کوتلی جزی، ھیلا کیس سرہ مھارا
جھرا ڈھگوے جوائیس، تئی تعریف دہ قندھارا
لٹاں ھلمھاں کاری، چڑی جھرا گوں یہ تاڑا
ھزارا لوٹثہ، جھّرا، جمالی لوپہ سردارا
ھزار تہ چترے چینیں، نہ داثہ ما خو بھوتارا

ترجمہ:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھرا کی گھنٹیاں اور گھنگھرو میں کسی اور بے کار بیل پہ نہیں باندھوں گا
نہ کوئی گائے ایسا بچہ جنے گی نہ ہی کوئی اور بچھڑا جھرا جتنا کام کر پائے گا
میں ایک ہی دن میں جھرا کے ذریعے پچاس کا سہ بیج بوتا ہوں
جھرا ناز و نخرے کے ساتھ، مہار ڈالے چلنے کا عادی ہے
جھرا زبردست بیل ہے جس کی تعریفیں قندھار تک ہوتی ہیں
بند کے لٹ پر (چڑھائی) پر تو گویا حملہ آور ہوتی ہے اور اس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے
ایک ہزار روپیہ پہ مانگا تھا جمالی کے سردار نے
ایک ہزار کچھ کم رقم تو نہیں ہوتی مگر میں نے اور میرے جاگیردار نے نہ بیچا

وہ بیل سب سے اچھا تصور ہوتا ہے جو اندر اور باہر دونوں طرف ہل چلائے، بار بردار ہو، کام میں سست نہ ہو اور خوبصورت بھی ہو۔

2۔سیاہ آف

(مستقل پانی سے سیراب ہونے والی زمینیں)

مویشی بانی اور بارانی زرعی معیشت ہی کی طرح سیاہ آف والی زرعی معیشت سے بھی بلوچ کا سماجی نظام متشکل ہو چکا ہے۔ مثلاً یہاں بلوچ کے ہاں بام رنگ، گوئل، نیمروش، پیشین، دیغر، روش ٹب، نماشام، نُخپتن، زہریں وہاو، پذی شف کے علاوہ بھی 24 گھنٹوں کو تقسیم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

’’پاس‘‘ ہمارا اسٹینڈرڈ ٹائم بنا۔ کاریز ہو یا کچھ، مشترکہ ٹیوب ویل ہو یا نہری نظام، پاس گویا پانی کی تقسیم کی علامت بن گیا۔ لفظ ’’پاس‘‘ سیاہ آف کا اپنا لفظ نہیں ہے۔ یہ تو پندرہویں سولہویں صدی میں بیورغ کی شاعری میں بھی استعمال ہوا تھا۔ مگر یہاں یہ باقاعدہ وقت کا یونٹ بن کر سامنے آیا۔ چوبیس گھنٹے میں چار پاس تھے۔ یک پاس، دو پاس، سہ پاس، چیار پاس۔ ہمارے بڑے پیر ’’یک پاسی‘‘ اور دو پاسی مشہور ہیں۔

یہ جو گھنٹہ والی بات ہے وہ تو انگریز ساتھ لایا۔ اس نے ہمارے پورے برصغیر کے لیے ایک ہی سٹینڈرڈ ٹائم مقرر کر دیا۔ اُسے گرین وچ مین ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے کر دیا۔ پھر جب ہندوستان، پاکستان اور بلوچستان کی آزادی کا اگست 1947 کو اعلان ہوا تو ہمارا اور ہندوستان کا وقت آدھ گھنٹے کے فرق والا بنا۔ اُن کا آدھ گھنٹہ پہلے اور ہمارا بعد میں۔

سیاہ آف وہ مبارک نعمت ہے جس سے جاندار مخلوق اور شہروں کی زندگانی وابستہ ہے۔ مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ میسوپوٹیمیا کے دو دریاؤں دجلہ وفرات کے درمیان اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ بے شمار کلچر پھلے پھولے ہیں۔ بلوچستان میں آبادی، کلچر اور سولائزیشن دریائے بولان اور ہندو پاکستان میں دریائے سندھ، برھم پترا اور گنگا کے احسانات ہیں۔ آسٹریا کی ترقی وخوشحالی دریائے ڈینیوب کے سبب ہے۔ جرمنی کی تجارت اور صنعت ایلبے اور رہائین دریاؤں کے وسیلے سے ہوئی ہے اور فرانس کے کلچر اور ترقی کو لائر، رھون اور سین دریاؤں نے بالغ کر دیا ہے۔ روس میں دریائے والگا اور ڈان کئی کلچروں کا منبع ہے۔(1) بلوچستان کے اپنے قصبے اور شہر بھی پانی کی مستقل ندیوں نالوں کے دم سے آباد ہیں۔ مگر پورے بلوچستان میں، سوائے ایک آدھ کے مذکورہ بالا دریاؤں جیسے بڑے دریا نہیں ہیں۔ ہمارے علاقے کے دریاؤں میں دائمی پانی بہت کم ہے۔ زیادہ تر سیاہ آف کھارے پانی والے ہیں۔ دریا میں کچھ دیر تک دیکھیں تو بہتا پانی موجود ہے، پھر یہ پانی دوبارہ زمین کے نیچے گم ہو جاتا ہے، ایک دو میل کے بعد پھر پانی کی دھاری نمودار ہوتی ہے۔ پانی کی یہ آنکھ مچولی پورے روٹ تک چلتی ہے۔ پہاڑوں کے موڑوں کونوں میں جہاں پانی نمودار ہوتا ہے وہاں اس کی گہرائی دو انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بارش جب برستی ہے تو ان دریاؤں میں مردم بُرد سیلاب آتا ہے۔ اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ پانی اتر جاتا ہے۔ پانی کا یہ سیلاب بڑی بڑی جھیلیں (کمب) بنا تا ہے۔

ان دریاؤں سے لوگ چھوٹی نالیوں کے ذریعے آس پاس کی زمین سیراب کرتے ہیں جنہیں ’’کچھ‘‘ کہتے ہیں۔ کاریز اکا دکا ابھی تک چالو ہیں۔

کاریز کا نظام بہت دلچسپ ہے۔ معلوم نہیں ہے کہ کاریز کا نظام سب سے پہلے کہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اورکس نے شروع کیا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کاریز کس زبان کا لفظ ہے اور بلوچ نے کس قوم سے یہ نظام سیکھا؟۔ کاریز نظامِ آبپاشی سارے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں اور نیز چین اور جاپان میں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بات پکی ہے کہ بلوچستان میں کاریز بہت زمانے سے مروج ہیں۔ کاریز موتیوں کا پرویا ہوا ہار ہوتا ہے۔ پانی، دھاگے کی طرح کنوؤں کے منکوں کو باہم پروتا ہوا، اپنے سرچشمے سے لے کر فصل تک چھپے ہوئے یا دشمن دار جوانوں کی طرح خفیہ خفیہ، چپ چاپ، پاؤں کے بل چلتا ہوا مہر ومحبت، آبادی اور خوشحالی کا پیغام جا کر پہنچاتا ہے۔ کھڈوں کی دوستی کی یہ نشاں، انسانی فکر کے جادو کا یہ کرشمہ اور حیات نو کا یہ پیمبر زیادہ تحقیق، زیادہ ریسرچ اور چھان بین اور زیادہ صفائی وخدمت کا متقاضی ہے اس لیے کہ یہ ہماری کم آبی کا درمان ہے، اس کی مٹھاس کھارے جوہڑوں کو شرمندہ کرنے والی ہے اور اناج وطعام کے خرمنوں کا سبب ہے۔

رہٹ یا اَرٹ ایک زمانے تک دولتمند کاشکار یہ طریقہ آبپاشی بھی استعمال کرتے رہے۔ مگر اونٹوں پر لاد کر اس کے پرزہ جات دور دراز تک نہ لیے جاسکتے تھے۔ نیز خرابی کی صورت میں مستری علاقے سے بہت دور شہری مراکز میں ہوتے تھے۔ اس لیے یہ طریقہ نہ مقبول ہوا اور نہ دیرپا۔

ٹیوب ویلوں کا رواج ابھی پڑتا جا رہا ہے اور آباد اور مستقل رہائش پذیر لوگوں کی توجہ ابھی حال ہی میں سائنسی زراعت کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ پنجگور اور مکران کے دیگر حصوں میں پانی کا حقوق رکھنے والے لوگ، کاریز کے قریب ایک ٹیوب ویل لگانے نہیں دیتے۔ مستنگ ضلع کے حصوں میں ایسے علاقے بھی مخصوص کر دیے گئے ہیں جہاں کنویں یا ٹیوب ویل نہیں کھودے جاسکتے۔

ڈیزل کا خرچہ اتنا زیادہ ہے کہ زمیندار کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گوشت سے چھیچھڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ اب تو شکر ہے کہ گرڈ والی بجلی کشادہ پیشانی والے علاقے کی قسمت والے عوام تک پہنچ گئی ہے۔ زمینداری میں اس کی برکتیں یہ ہوتی ہیں کہ پہلے سے لگے ہوئے ٹیوب ویلوں کا خرچ کم ہوجاتا ہے۔ مگر بجلی کے شدید بحران نے ساری زراعت برباد کر ڈالی۔ اس لیے کہ

ڈیزل والے ٹیوب ویل پہلے اکھاڑ دیے گئے تھے اور اُن کی جگہ بجلی والے ٹیوب ویل لگائے گئے تھے۔ بجلی چونکہ ہے نہیں اس لیے نہ تو تین کے رہے نہ تیرہ کے زراعت میں۔

ٹریکٹروں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ بارانی و آبی دونوں زمینوں کو ہموار اور آباد کر رہے ہیں۔ بنجر اور پتھریلے علاقے اب قابل کاشت ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹریکٹر ہمارے لیے بہت مفید چیز ہے۔ اسے بار برداری کے لیے استعمال کریں یا سواری کریں، چاہے تو اس سے ہل چلائیں، چاہے زمین ہموار کریں، خواہ نالے، کیاریاں اور لٹ باندھیں یا اس سے ٹیوب ویل چلائیں، یہ ہمارے گدھے کا زبردست نعم البدل ہے۔ ہرفن مولا ہے اور لوگ روز بروز اس کی کرامتوں سے واقف ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی گرویدگی بڑھتی جا رہی ہے۔

مگر عمومی طور پر ہمارے ہاں کاشت کاری کی تکنیک بہت ابتدائی اور فرسودہ ہے۔ ہل لکڑی کا ہوتا ہے اور ہل چلانے کے لیے کبھی کبھی اونٹ، گائے اور گدھا استعمال ہوتے ہیں۔ مالہ درخت کا تنا ہوتا ہے۔ اور ''کھرپڈ'' نامی کسّی جیسے آلے سے ہم مٹی کے ڈھیلے توڑتے ہیں۔ کٹائی ہر جگہ درانتی سے ہوتی ہے۔ ریپر ابھی تک مقبول نہیں ہوا۔ تھریشر اور ٹریکٹر بھی گاہنے کے لیے استعمال ہونے لگے ہیں۔ مگر بیلوں سے فصل گاہنے کا رواج بھی متروک نہیں ہوا۔

آبی زمینوں پر ابھی تک بڑے پیمانے پر کرم کش ادویات استعمال نہیں ہو رہی ہیں۔ نہ ہی سائنس کی تیار کردہ کھاد سے مستفید ہوا جا رہا ہے حالانکہ آج بہت بڑا رقبہ آبی بنا دیا گیا ہے۔ کھاد اور کرم کش ادویات کو استعمال نہ کرنے کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں ماحول کی آلودگی کا بڑا شعور، ادراک یا غم ہے، نہ ہی ہمیں کسی نے یہ بتایا کہ یورپ وامریکہ کے ایڈوانس لوگ کرم کش زہر کے استعمال سے ہاتھ کانوں میں لگا کر توبہ کر رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ خدا کے بندوں ہمارے پانی میں بھی زہر ہے، اپنی فصل اور خوراک ہر چیز میں ہم نے خود زہر ڈال دیا ہے۔ ہم نے اپنی سانسوں میں بھی زہر بھر دیا ہے کہ ساری ہوا زہر آلود ہوگئی ہے۔ خدا کو مانو تم زہر کا دھندا چھوڑ دو مگر سرمایہ داری نظام وہاں کے کاشتکار کی بات بھی سننے نہیں دیتا۔ دواساز کمپنیاں پیسہ دے دے کر، اشتہارات نشر اور چھاپ چھاپ کر انسانی فلاح کی ہر آواز کو کامیابی سے دبا لیتی ہیں، انھی کمپنیوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بدولت تو حکومتیں چلتی ہیں، یہ چاہیں تو بادشاہ بنادیں چاہے تو مما لک میں آلندے شہید بنادیں۔

پانی کے سماجی انتظام میں یہ بات شامل ہے کہ پانی کی تقسیم بہتر اور موثر ہو۔ پانی کی چوری کی روک تھام ہو اور پانی کے نالوں کو صاف کرنے اور مرمت کرنے میں تعاون ہو۔ جہاں پانی کے حصے چھوٹے ہوں، وہاں پانی کی تقسیم پیچیدہ ہوتی ہے۔ دیکھ بھال بہت ہی نازک ہوتی ہے، آبپاشی کے خصوصی منیجر مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان افسروں کو رئیس، ارباب، سرشتہ، یا کہدا کہتے ہیں۔ ان کا تقرر موروثی ہوسکتا ہے مگر اس کا انحصار کارکردگی پر ہوتا ہے اور ان کا معاوضہ پانی میں حصہ کی صورت میں دیا جاتا ہے، یا پھر نقدی کی صورت میں، یا آبپاشی کے نظام کو صفائی کیلیے کام کرنے سے مستثنیٰ کر کے۔

نہری علاقہ

پاکستان کے زیرِ تصرف بلوچستان 134051 مربع میل یا 34.94 ملین ہیکٹر کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں صرف 12 ملین ہیکٹرز پر کاشت کاری ہوتی ہے۔ صوبے میں 5.22 ملین ہیکٹر قابل کاشت زمین ہے جب کہ باقی زمین پانی اور انفراسٹرکچر نہ ہونے کی وجہ سے غیر آباد پڑی ہوئی ہے۔ پانی صرف 0.34 ملین ہیکٹر کو نصیب ہے۔ تقریباً 0.18 ملین ہیکٹرز کو مستقل طور پر نہروں، ٹیوب ویلوں اور کاریزوں سے پانی ملتا ہے۔ بقیہ 0.16 ملین ہیکٹرز بارشوں کے رحم وکرم پر ہے۔ بلوچستان کو صرف 4200 کیوسک پانی سکھر اور گڈو بیراج سے ملتا ہے۔ یہی اس کا حصہ ہے۔ نہری پانی سے زیادہ تر نصیر آباد کا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔

نہریں آنے سے پہلے بلوچستان کے میدانی (صحرائی) علاقے کو ''پٹ'' کہا جاتا تھا۔ یہاں بارشیں نہیں ہوتی تھیں اور سیلابی پانی سے یہ علاقہ بہت دور واقع تھا۔ اس لیے اسے ''دشتِ اموات'' کہتے تھے۔ یہاں اہم سیلابی دریا ناڑی، بولان، سکلیجی ،مولا، لہڑی اور چھتر ہیں۔ کچھی میں داخل ہو کر ان دریاؤں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے نالے بن جاتے تھے۔ ان سیلابی دریاؤں پر آب پاشی کے لیے بڑے بڑے بند یا ڈیم بنائے جاتے تھے۔ جنھیں ''گنڈھو'' کہا جاتا تھا۔

کچھی و نصیر آباد میں نہروں سے قبل ان سیلابی دریاؤں کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ

بلوچستان میں ان زمینوں اور ان پر موجود زرعی نظام نے پیداوار دے کر بہت سے بیرونی حملہ آوروں کو ہم پر یلغار کرنے کی ترغیب دی۔

ناڑی، جس کا کہ ہم بیجی دریا کے بطور پہلے ذکر کر چکے ہیں، سبی کے لیے روزی رساں ہے۔ ضلع کی 90 فیصد نہری کاشتکاری اسی دریا سے ہوتی ہے۔ دریائے بیجی (ناڑی) کے آبی حقوق سبی میں یوں تقسیم ہیں؛

تخجک............	16.5 پاؤ
دھپال......	7.0 پاؤ
صافی............	8.0 پاؤ
مرغزانی............	7.0 پاؤ
کڑک............	7.0 پاؤ
سبی ٹاؤن............	6.0 پاؤ
خدائیداد مرغزانی......	1.0 پاؤ
موسیانی......	1.0 پاؤ
لونی............	3.0 پاؤ
بکھڑا............	2.0 پاؤ
کوٹ باروزئی......	2.0 پاؤ
محکمہ فارسٹ......	1.5 پاؤ
مندوانی............	1.0 پاؤ
نودھانی............	1.0 پاؤ

کل.................. 64.0 پاؤ یعنی 115.2 کیوسک (2)

ناڑی کا سیلابی پانی کچھی میں بھاگ کے مقام پر آن کر بہت سی شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ مگسی علاقے تک پہنچتا ہے اور سندھ تک چلا جاتا ہے۔ ناڑی پر بڑے بڑے بند ہوا کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے جو یہ تھے: مٹھڑی پر، اریری، گاڈی، حاجی، ٹاکری، گلاب اور گاموں پر۔ گاڈی گنڈھو کچھی کا سب سے اہم بند ہوا کرتا تھا جس پر پورا بھاگ اور نصیر آباد انحصار کرتے تھے۔ نیچے بھاگ کے علاقے میں 26 گنڈھو تھے۔ سب سے آخری صاحب ڈینا گنڈھو تھا۔ بھاگ کے قریب ناڑی سے ایک شاخ نکالی گئی جسے بشک واہ کہتے تھے۔ اور اس پر نو بند تھے۔

بولان دریا کولپور کے قریب شروع ہوتا ہے جس میں ''سرِ بولان'' پر پانی نظر آتا ہے اور ''آبِ گم'' میں غائب ہو جاتا ہے۔ ڈھاڈر پر پہنچ کر اس پر آبپاشی کے لیے ایک بند باندھا گیا۔ اس دریا پر اہم بندوں (گنڈھوؤں) نام کے ہیں؛ مھیسر، خان پور نوٹھل والا، باگائی، رستم اور ہانبی۔ اس کا پانی کبھی کبھی بھاگ اور گنداواہ تک پہنچ جاتا ہے۔

سکلینجی، ساروان میں ہربوئی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ہوتے ہوئے کچھی کے میدانوں کو سیراب کرتا ہے۔ شوران کے جنوب سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؛ ایک گاجان کو جاتا ہے اور دوسرا شوران کو۔

مولا، ہربوئی پہاڑوں سے شروع ہوتا ہے اور جھالاوان میں 180 میل تک جاتا ہے۔ کچھی میں داخل ہوتا ہے۔ ایک گاجان کو جاتا ہے اور دوسرا سندھ کو جاتا ہے۔

لہڑی دریا مری علاقے سے ہوتا ہوا لہڑی شہر سے آٹھ میل شمال مشرق میں داخل ہوتا ہے۔ خان واہ کے ذریعے یہ ڈومبکی فیوڈل چیف کی زمینوں کو سیراب کرتا ہوا بالا ناڑی جاتا ہے۔ بالآخر دریا ٹمپل ڈیرہ کی طرف جاتا ہے اور کبھی کبھی نصیر آباد کو سیلابی پانی پہنچاتا ہے۔

چھتر، بگٹی پہاڑوں سے نکلتا ہے اور کھیری علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ چھتر اور شاہ پور کے درمیان بہت بڑی زمین اس سے سیراب ہوتی ہے۔(3)

نصیر آباد کے علاقے کی نہریں بیگاری اور شاہی واہ ہیں۔ یہ دونوں نہریں دریائے سندھ سے نکلتی ہیں۔ اول الذکر کی دو شاخیں ہوتی ہیں؛ نور واہ اور سیر واہ۔ بیگاری شاید نور محمد کلہوڑا کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ بیگاری نام اس لیے پڑا کہ مزدور بیگار پر لیے گئے تھے۔(4) اس سے زرعی پیداوار خوب بڑھی۔ لوگ خانہ بدوشی کی بجائے آباد ہو کر زراعت کرنے لگے۔ ریل اور سڑک

نے زراعت کو مزید ترقی بخشی۔

کپاس کی خوب کاشت ہوتی تھی۔ پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں شائع شدہ مشہورِ عالم پمفلٹ ''شمس گردی'' میں کچھی کے اندر کپاس کی کاشت اور اس پر ظالمانہ سرکاری ٹیکس کا ذکر موجود ہے۔

انگریزوں نے 1932 میں کیرتھر نہر بنائی تھی۔ یہ سکھر بیراج سسٹم کی شمال مغربی نہر کی شاخ ہے۔

پاکستان نے کشمور کے مقام سے دریائے سندھ سے ایک نہر نکالی جسے پٹ فیڈر کہتے ہیں۔ پٹ فیڈر بلوچستان میں نہری آبپاشی کا سب سے بڑا نظام ہے۔ جس کی لمبائی 112 میل ہے۔ اس طرح یہ نہر، نہر سویز سے لمبی ہے جو سرخ سمندر کو میڈیٹرن سے ملاتی ہے۔ کیرتھر اور پٹ فیڈر دونوں ہی دریائے سندھ سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ پٹ فیڈر نے شروع شروع میں 6700 کیوسک پانی لینا تھا مگر جب 1962 میں اس کی تعمیر شروع ہوئی تو اسکا ڈیزائن تبدیل کر دیا گیا اور اسے صرف تین ہزار کیوسک رہنے دیا گیا۔ یہ نہر سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں سے گزرتی ہے۔ سندھ میں یہ 35 میل کا سفر طے کرنے کے بعد بلوچستان میں داخل ہوتی ہے اور کچھی کے میدانوں کے علاوہ بگٹی قبیلہ کی کچھ زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ پٹ فیڈر نصف ملین ایکڑ کو سیراب کر سکتی ہے۔ نہر میں ضروری حفاظتی کام نہ ہونے کی وجہ سے تین سے چار سو کیوسک پانی رس رس کر نیچے کے علاقے بالخصوص مشرقی نصیر آباد کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ سارا علاقہ ایک عظیم جھیل بن چکا ہے جس نے زرخیز ترین زمین کا ایک لاکھ ایکڑ سے زائد علاقہ سیم اور تھور کے حوالے کر دیا۔ اور یہ ہر سال تقریباً دس ہزار ایکڑ مزید زرخیز زمین کو ناکارہ بنا رہا ہے۔

نصیر آباد ڈویژن کے علاقے میں بہت ساری زراعت نہری زمین پہ کی جاتی ہے۔ یہ نہری زمین تقریباً چار بڑے فیوڈل خانوادوں کی ملکیت ہے؛ کھوسہ، جمالی، مگسی اور عمرانی۔ یہ جاگیریں زیادہ تر ان قبائلی سرداروں کی ملکیت ہیں جو انگریز کے وفادار تھے۔ اس علاقے میں گندم، چاول، دالیں، کاٹن اور تل جیسی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں بھی رعیتی کسان ہیں۔ اور کسان پابند ہوتا ہے کہ بیوی بچوں سمیت فیوڈل کا کام کرے۔ تقسیمِ پیداوار بارانی علاقوں کی طرح ہوتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مگر یہاں مخصوص بات یہ ہے کہ فیوڈل کے مراثی، ترکھان، لوہار، ملا اور نائب (رئیس) کا متعین معاوضہ کسان اور مالک کی مشترکہ پیداوار سے دیا جاتا ہے۔

بلوچستان میں نہری نظام کے ذریعے تقریباً نو لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے جس میں سے پٹ فیڈر نہر سے 4 لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ، کیرتھر سے 2 لاکھ 55 ہزار ایکڑ، اوچ کینال سے 85 ہزار، مانجھوٹی سے 28 ہزار ایکڑ، خان واہ سے 25 ہزار ایکڑ۔

نہر آنے سے پہلے نصیر آباد ''بٹائی'' کے نام سے خان کو ٹیکس دیتا تھا۔ اس کی شرح مکمل پیداوار کے چھٹے حصے سے لے کر چوتھائی تک ہوا کرتی تھی۔ ریاست کچھ دیگر ٹیکسوں کے علاوہ تجارت پر بھی ٹیکس لیتی تھی۔ جب نہر آئی تو جان جیکب اور نصیر خان دوئم میں یہ معاہدہ طے پایا کہ ٹیکس دونوں آدھوآدھ کریں گے۔ یہ معاہدہ 1843 میں ہوا تھا۔

میرانی ڈیم: بلوچستان کے مقام تربت سے 30 میل مغرب میں میرانی کے مقام پر میرانی ڈیم تعمیر ہو چکا ہے۔ یہ دو بڑے سیلابی دریاؤں، کیچ اور نہنگ کے سنگم پر ہے۔ یہاں سے آگے بہاؤ سمندر تک جاتا ہے جسے دشت کور کہتے ہیں۔

منصوبے کے مطابق میرانی ڈیم پہ 200 کلوواٹ کے تین جنریٹر لگا کر چھ سو کلوواٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ میرانی ڈیم سے دائیں اور بائیں جانب نہریں نکالی گئیں۔ اس منصوبہ کے تحت اس ڈیم سے 32 ہزار ایکڑ زرخیز ترین زمین کو سیراب کیا جاسکے گا۔ اس ڈیم سے سالانہ ٹوٹل ڈسچارج 125000 ایکڑ فیٹ پانی ہے اور اس میں چار سال تک کا پانی سٹور کیا جاسکے گا۔

دریائے پورالی ضلع لس بیلہ کی زراعت میں منفرد بات یہ ہے کہ یہاں ہماری روایتی فصلوں کے بجائے نقد آور سبزیاں اور پھل کاشت کیے جاتے ہیں۔ چیکو، کیلا، ناریل، پپیتا، املی کپاس............ یہ کاشت کاری مقامی لوگ بھی کرتے ہیں اور قبضہ کنندگان بھی۔ واضح رہے کہ بہت بااثر اور قبائلی سرداروں نے بقیہ بلوچستان سے یہاں آ کر زمین کسی نہ کسی صورت اپنی کر لی اور یہاں کی زمینداری میں لگ گئے۔

****

نہری زمین کے علاوہ بلوچستان میں آبی زمین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں آبیاری، قدرتی چشمے، رہٹ، ٹیوب ویل یا کاریزیں کرتی ہیں۔ ان زمینوں پر دو روایتی فصلوں کے علاوہ نقد آور فصلیں (یعنی سبزیاں اور پھل) بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں رعیتی کسانوں کے علاوہ یومیہ اجرت والے کھیت مزدور بھی کام کرتے ہیں۔ چونکہ یہ فیوڈل اپنی زرعی پیداوار کے حوالے سے منڈی سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ کھیت مزدور گو کہ رعیتی کسانوں کی طرح پوری زندگی فیوڈل کے غلام نہیں رہتے مگر انہیں بھی کوئی آئینی و قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔

****

مندرجہ بالا زمینوں کے علاوہ کاشتکاری کی تیسری قسم مکران اور اس کے پڑوسی علاقوں میں بڑے پیمانے کی کھجور کی کاشت ہے۔ یہاں کسان عموماً یومیہ اجرت کے حساب سے یا پھر پیداوار کے حساب سے اپنا حصہ لے لیتا ہے۔ چونکہ کھجور کو ڈبوں میں بند کرنے یا سرد خانوں میں رکھنے کے انتظامات موجود نہیں ہیں اور نہ ہی کھجور سے وابستہ کوئی صنعت موجود ہے۔ اس لیے کسان اور مالک دونوں ہی ناگفتہ بہ زندگی گزارتے ہیں

کسانوں کی یہ حالت بہتر بنانے، کاشت کاری کو فروغ دینے اور پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ ضروری کام یہ ہو سکتے ہیں؛

1۔ کاشت کاری کے لیے آبادی و آباد کاری بہت ضروری ہے۔ خانہ بدوش اور ''کاشروڑی''، لوگ کبھی بھی زراعت نہیں کر سکتے۔ اس لیے لوگوں کی مستقل آبادکاری، ان کے کڑی خیموں کو کمروں میں تبدیل کرنے اور الگ تھلگ رہنے والوں کو شہر اور قصبوں کی صورت میں اکٹھا اور مستقل آباد کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ (جو کہ خود ایک مشکل کام ہے۔ اس میں بہت سی سماجی، معاشی اور سیاسی مشکلات اور رکاوٹیں ہیں)۔

2۔ انفراسٹرکچر مہیا کرنا۔

3۔ منڈی قائم کرنے اور انہیں سڑکوں کے ساتھ پرو دینے کے بغیر زراعت کبھی ترقی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کرسکتی۔صرف یہی نہیں بلکہ منڈی کے اندر کاشتکار کا خیال رکھنا ضروری ہے۔اس لیے کہ قلعہ نما پہاڑ تو ہمارے باپ دادا کی میراث ہیں۔مگر منڈی تو دوسروں کے قبضے میں ہے۔وہاں تو ''مال لگاؤ، مال ملے گا'' کا قصہ ہے۔مال کی اچھائی اور کمتری کی بات ہے۔ارزانی اور گرانی دیکھنی ہوتی ہے۔موسم اور بے موسمی تفریقات ہیں اور مانگ اور رسد کا کالا قانون ہے۔ہمارا سامان تو کبھی فروخت نہیں ہوسکتا جب تک کہ '''' یاردستامہ گیڑت داں تنگویں کلامہ باڑت'' (جب تک کہ محبوب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خیمہ عروسی تک نہ لے جائے)۔اس لیے منڈی کا تحفظ بہت ضروری ہے۔

4۔کاشتکاروں کو بنیادی معلومات مہیا کرنے ضروری ہیں کہ وہ کونسی فصل کس وقت کس طرح کاشت کریں۔کس کس وقت پانی لگائیں،کونسی کھاد اور اسے کب استعمال کریں۔کونسی فصل کی قیمت زیادہ ہے اور کہاں قیمت زیادہ ہے۔

5۔اچھا بیج، کھاد، کرم کش ادویات کی سپلائی کے ایسے مراکز بنانے کی ضرورت ہے جو نزدیک بھی ہوں، سستے بھی اور بے رشوت وسفارش وجنجال بھی۔

6۔پانی کا بندوبست کرنا، کاریز، کنواں، ٹیوب ویل، چشمہ اور ندیوں کو ڈویلپ کرنا، آبی زراعت کو فروغ دینا۔

7۔ٹریکٹر، تھریشر، بلڈوزر یعنی مشینی کاشت کاری کو رواج دینا۔

8۔غیر حاضر زمینداروں کی زمین ضبط کرنا اور کسانوں کے درمیان مفت تقسیم کرنا۔

9۔سختی سے معاشی اصولوں پر چلتے ہوئے زراعتی کوآپریٹو قائم کرنا۔

10۔دریاؤں اور ندیوں پر بند باندھنا، ٹیوب ویل کے علاقوں میں ڈیلے ایکشن ڈیم بنانا۔

11۔کسان کمیٹیاں بنانا۔

12۔زرعی اجناس کی قیمت بڑھانا۔

13۔زرعی ٹیکنالوجی جس میں فرٹلائزر اور زرعی ادویات شامل ہیں کی قیمت میں 50 فیصد کمی کرنا۔

14۔دیہاتی علاقوں میں زراعت کے ساتھ بندھی صنعتوں کا قیام اور لوگوں کو روزگار دینا۔

15۔کسان اور چھوٹے زمینداروں کی بہبود کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں کا قیام، مشینی کاشت کی ترقی کے لیے تحقیقی مراکز کھولنا، موجود زرعی فارموں کی کارکردگی بہتر بنانا، اور کسانوں کو نئی ٹیکنالوجی سے واقف کرنے کے لیے پروگرام بنانا۔

16۔بڑی بڑی جاگیریں، قومی ملکیت میں لے کر بے زمین کسانوں میں بانٹنا۔

بلوچستان میں ایک لاکھ ٹن فروٹ پیدا ہوتا ہے۔ 1985-86 میں 38,524 ہیکٹر زیر پھلوں کی کاشت ہوتی تھی۔(5) اس کی مارکیٹنگ بہت فرسودہ ہوتی ہے۔اس کی پیکنگ بھی تھرڈ کلاس گھاس پھونس اور کریٹوں میں ہوتی ہے۔گریڈنگ اچھی طرح کرنی ہوگی۔عموماً پھلوں کے درخت کراچی، بالائی سندھ اور پنجاب کے تاجروں کو پیشگی فروخت کیے جاتے ہیں۔اگر یہ پھل والا درخت ایڈوانس میں بیچنے کی بجائے وہ پھل ہی فروخت کریں تو انہیں کافی فائدہ ہوگا۔اس کے لیے فروٹ کی ہول سیل مارکیٹ قائم کرنا ہوگی۔جن میں ضروری کولڈ سٹوریج اور مربہ، اچار کی سہولتیں موجود ہوں۔ڈبہ بندی کی صنعت کو صوبے میں ترقی دینا ہوگا۔

پھلوں میں سیب کی پیداوار سب سے زیادہ ہے۔1975-76 میں سیب کی پیداوار 35500 ٹن تھی۔1984-85 میں سیب کی پیداوار بڑھ کر 79400 ٹن تھی۔پاکستان کے سیب کی کل پیداوار کا 56 فیصدی بلوچستان پیدا کرتا ہے۔(6) سیب کو Dehydrate کر کے بھی بہت پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔سیب کے علاوہ ہم دوسرے میووں اور سبزیوں کو بھی Dehydrate کر سکتے ہیں، جن کی پیداوار بلوچستان میں بہت ہوتی ہے، مثلاً؛

زرد آلو	(39000 ٹن)
آڑو	(26000 ٹن)
Plums	(12500 ٹن)
دھنیا	(1100 ٹن)
مرچیں	(2700 ٹن)
لہسن	(800 ٹن)

(7)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم کھجور، چیری، سیب اور انگور کے لیے پراسیسنگ اور پیکنگ یونٹس قائم کر کے جام، جیلی، مربہ، اچار، چٹنی اور لیمن سکواش بنا سکتے ہیں۔

پشین جو باغات کا علاقہ ہے، وہاں 43 فیصد رقبے پر گندم کاشت کی جاتی ہے۔ میوے 31 فیصد پر اور بقیہ رقبہ پر خربوزے، تربوز، سبزیاں اور تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ خاران میں بھی گندم ہی بڑی فصل ہے۔ میووں میں سیب، انگور اور انار ہوتے ہیں۔

مکران میں 30 ہزار ٹن پیدا ہونے والی کھجور بہترین تصور کی جاتی ہے۔ جن علاقوں میں کھجور پیدا ہوتی ہے وہاں یہ صدیوں سے بنیادی خوراک رہی ہے۔ مکران تقریباً 40 قسم کی کھجوریں پیدا کرتا ہے جن میں سے بیگم جنگی، آبے دندان، خنزن باد، شکر، کلونٹ، ہُشکینچ، کلوت، محمد حسنی، کہروا، زرد، چپ شانک، چینی، شنگشکان، پشپاگ، شکری، پیشنا، سبزو، کنگن، سنٹ گورگ، روغنی، کروچ، شکاش، مکلی، موزاوتی، الینی، ربائی، جواں سُہر اور ڈنڈالی شامل ہیں۔ (8) مکران کی کھجور میں شکر کی مقدار کافی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے خوراک کے علاوہ صنعتی پراسیسنگ کے کام بھی آتی ہے۔ اس میں تقریباً انسانی ضروریات کے سارے اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ جتنی توانائی ایک درمیانے سائز کا سیب دیتا ہے، پانچ، چھ دانے کھجور اس سے دگنی توانائی دیتے ہیں۔ کھجور کی فارمنگ برآمدات کے لیے ڈویلپ کی جاسکتی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی طرح غیر معمولی لمبی کھجور بلوچستان میں بھی کاشت کی جاسکتی ہے۔ جس کی بالخصوص بہت برآمدی قیمت مل سکتی ہے اور جس کی عرب ممالک میں بہت مانگ ہے۔ کھجور سے جام، مٹھائیاں، جوس وغیرہ بنتے ہیں۔ ہمارا کھجور کراچی میں پراسیس ہو کر وہاں سے برآمد ہوتا ہے۔

بلوچستان میں آلو کی پیداوار 76-1975 میں 18 ہزار ٹن تھی۔ جبکہ 85-1984 میں یہ بڑھ کر 79.4 ٹن ہوگئی۔ آلو کو پراسیس کر کے Potato Rice اور Dehydrated Potato Granules , Potato Flour بنا سکتے ہیں۔

زیرہ قلات جیسے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کاشت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زعفران بھی۔ زعفران کی پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ مقامی مارکیٹ کے علاوہ اس کی برآمد کے

بھی کافی اچھے امکانات ہیں۔

اب کے میرانی ڈیم نے غربت کو گڑھے میں پھینکنے کے بوجھ کو شیئر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دشت کو سیلابی دریا ''دشت کور'' سیراب کرتا ہے۔ یہ دریا تربت کے قریب ناصر آباد کے مقام پر بنتا ہے جہاں دو سرکش دریا، نہنگ اور کیچ کور مل کر اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ دریائے نہنگ، منداور تمپ کو سیراب کرتا ہے اور کیچ کور بلیدہ، سامی اور کیچ کو پانی پلاتا ہے۔ مشترکہ کور پھر جنوب کی طرف دشت وادی میں بہتا ہوا سمندر میں اتر جاتا ہے۔ سمندر تک اس کی کل لمبائی 408 کلومیٹر ہے۔

ہنگول کور مکران کے میدانوں میں بہتا ہے اور بحیرہ بلوچ میں شامل ہوتا ہے۔ جب بارش زیادہ ہوتی ہے تو اس دریا میں زبردست سیلاب آتا ہے۔ بند ہو گیا، زراعت ہو گئی۔ مگر اس کی تعمیر سے بے گھر شدہ لوگ ابھی تک دربدر پھر رہے ہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں۔

مکران کی روایتی زراعت میں کہن (کاریز) کا اہم رول رہا ہے۔ یہ بلوچستان میں آبپاشی کا ایک قدیم ذریعہ ہے۔ کاریزوں کے انتظام اور بندوبست اور دیگر معاملات حل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک عہدے دار مقرر ہوتا ہے۔ اُسے یہاں مکران میں کہدا (کئوھدا) کہا جاتا ہے۔ جسے ان فرائض کے عوض ایک ہنگام پانی دیا جاتا ہے۔ کاریز کا پانی ہنگام، نیم ہنگام، تنسو، نیم تنسو کی بنیاد پر شریک لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کاریز تربت میں بہت ہیں۔

مگر دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ضلع تربت کے برعکس ضلع گوادر میں ایک بھی کاریز نہیں ہے۔

تربت کے علاقے نلینٹ کے آم بہت مشہور ہیں تمپ میں بھی اچھا آم ہوتا ہے۔

روایتی فصلوں کے ساتھ ساتھ کھجور کی پیداوار بڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ کوئی پیکنگ نہیں، کوئی مربع اچار کی فیکٹریاں نہیں، کوئی dehydration پلانٹس نہیں۔ اس لیے یہ بڑی پیداوار سمجھو منڈی کے لیے ہے ہی نہیں۔ ضیاع............وسائل کا بے دریغ ضیاع۔

ہامین جون کے ماہ میں پنجگور کے ہامین سے ذرا جلدی آجاتا ہے اور اگست کے ماہ تک چلتا ہے۔ ہر کھجور کی لذت اور ذائقہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ تربت کے کھجوروں کے نام یوں ہیں؛

آبےِ دندان، بیگم جنگی، موزاتی، شکری، زرد، ھیلنی، دِشتاری، کروچ، پیش نا، روغنی،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گونزلی، چرپان، ماکلی، جدگالی، پیشپاگ، مشوری، پٹولی، گوک ناہ، رہئی، کلوت، سبزو۔(3)

مکران میں زمین کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جن کے پاس پانی نہیں ہوتا وہ لوگ پانی والوں سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ درزادہ کے پاس کبھی کبھی زمین کا پلاٹ ہوتا ہے۔ اور پانی ہوتا ہے مگر یہ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ روایتی لوہار ہوتے ہیں جو زرعی اوزار بناتے رہتے ہیں۔ کھجور سے وابستہ پوری معیشت قابلِ مطالعہ ہے۔

شفع (شبہ)

شفع بلوچستان میں بہت زیادہ ہے۔ سرکاری شفع اور ہے اور شرعی شفعہ اور ہے۔ مگر بلوچ کا شفعہ جدا بھی ہے، پیچیدہ بھی اور لڑائی جھگڑا اور کش بہ گیر کی ایک بہت بڑی وجہ بھی۔ بس دعا کریں کہ کوئی اراضی نہ خریدے، اراضی کا سودا نہ ہو اور اراضی لب چٹی (جرمانے) کے عوض لی دی نہ جائے۔ شفعہ لگ جائے یا نہیں مگر لوکل عدالت اور کھینچا تانی ضروری ہوتی ہے۔ زمین کی خرید و فروخت کے 9 ماہ کے اندر اندر اگر شفعہ کی بات کی تو ٹھیک، ورنہ اگر لیٹ ہوگئے تو کوئی آپ کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ہاں اگر شفعہ کرنے والا علاقے میں موجود نہ ہو تو 11 ماہ کے اندر اندر اسے نوٹس دینے کی رعایت ہے۔

چرّک

زمین جب پانی سے بھر جائے تو زائد پانی نچلے یا اگلے بند یا کھیت کو دیا جاتا ہے۔ اس پانی کو چرک کہتے ہیں۔ بنو (بند) کا چرک آتا ہے نمبر 1 پر، پھر نمبر 1 کا چرک نمبر 2 پر اور کھیت نمبر 2 کا چرک نمبر 3 پر............ یہ نمبر اسی ترتیب سے شفعہ کا پہلا حق رکھتے ہیں۔ یعنی لوڑا اور چرک (کھانے) والے آدمی شفعہ کا پہلے حق رکھتے ہیں۔ اگر وہ شفعہ نہ کریں تب اوپر کے ملحقہ کھیت کے مالک یعنی ''A'' والے کا حق ہے کہ شفعہ کرے اور زمین کی قیمت دے کر زمین اپنی کر لے۔ اگر وہ بھی شفعہ نہ کرے تو اوپر کے بازو یعنی ''B'' کا مالک خود کو شفعہ کے لیے تیار رکھتا ہے۔ اگر وہ بھی نہ کرے تو بائیں بازو کے پڑوسی یعنی ''C'' والے ہمت کریں گے۔ یہ شفعہ اس وقت جائز نہ ہوگا اگر درمیان میں ندی پڑ جائے، یا آدمی کے قد سے بلند پہاڑی ہو۔ مختصر یہ کہ یہ مردانگی اور غیرت کا کام ہے کہ باہر

والے آدمی کو اپنے اندر نہ چھوڑا جائے۔ قبائلی بندشیں اس قدر سخت کی ہوئی ہیں کہ آدمی جا کر دوسروں کے گھر بیٹھتا ہے، بھیک مانگتا ہے، قرض لیتا ہے اور اس زمین پر شفعہ کر کے اسے اپنے لیے خرید لیتا ہے۔ قبائلی نظام کو برقرار رکھنے والوں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں جہاں کوئی سوراخ، کوئی دراڑ رہ نہ جائے، لیکن لوحِ محفوظ کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے آلات کنکریٹ کی ہر سخت و مضبوط دیوار میں اپنی کرامت سے اچانک بڑے بڑے سرنگ بنا ڈالتے ہیں اور اپنے رواج مروج کر دیتے ہیں۔ سرمایہ برگزیدہ چیز ہے جو ذات، قبیلہ، رنگ، نسل اور مذہب سے بہت بلند ہوتا ہے۔ یہ کوئی سرحد، کوئی باؤنڈری نہیں مانتا، کسی کی بڑائی اور عظمت کو تسلیم نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلیت کی ساری مضبوطی کی موجودگی میں ایک چالاک شخص نے سارے علاقے کی زرخیز زمینیں اس طرح جھپٹ کر اپنی بنا لیں کہ بلوچ بے چارے کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ ابھی تک اپنی دنیا میں اس طرح منہمک ہے کہ اس کے لیے گویا دنیا اسی پرانی ڈگر پر چلی رہی ہو۔

3۔ لُڑآف کے پیداواری رشتے

کسان اور فیوڈل

کسان بننے کے معاہدہ کی شرائط کسان کے لیے بالکل ناروا اور غیر انسانی ہوتی ہیں۔ معاہدہ کے وقت فیوڈل اسے کچھ رقم (آٹھ یا دس ہزار روپیہ) بطور قرض دیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ فصل اٹھاتے وقت کسان کے حصے سے فیوڈل کا قرض چکانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کسان کے لیے کھانے کے لیے غلہ نہیں بچتا اس لیے وہ فیوڈل کی منت سماجت کرتا ہے اور اپنے حصے کا کچھ غلہ اپنے گھر لاتا ہے اس لیے کہ اس کا خاندان بھوکا ہوتا ہے۔ تین چار ماہ بعد یہ غلہ ختم ہو جاتا ہے، اس لیے وہ پھر مالک کے پاس جا کر قرض لیتا ہے۔ اس کی ادائیگی پھر فصل کے وقت ہونی ہوتی ہے۔ وہاں بھی پورا قرض نہیں چکتا۔ لہٰذا اس کا کسان ہونا دوام پاتا ہے۔ بزگری اور مقروضی، دین و دنیا کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ اس دوران بیماری، شادی بیاہ، غم، جرمانہ یا خیرات وغیرہ کرنا ہو تو پھر جا کر قرض لیتا ہے، پھر فصل اٹھانے کے وقت منت سماجت! ۔ یہ شیطانی سلسلہ ساری زندگی بھر چلتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دوران بزگر اگر اس کی زمین چھوڑنا چاہے تو وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ دوسرا کوئی فیوڈل تلاش کرے جو اپنی جیب سے اس کا قرض ادا کرے اور دو تین ہزار مزید کسان کو دے تا کہ اس کا گزارہ ہو سکے۔ اس طرح کسان کو اب اس نئے فیوڈل کی محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ کسان اپنے مالک کی شکل وصورت تو بدل سکتا ہے مگر بغیر مالک بالکل نہیں رہ پاتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم عوام یعنی ووٹر اپنے لیڈر بدل سکتے ہیں مگر خود ووٹر والی اپنی حیثیت بدل نہیں سکتے۔(9)

فیوڈل اور کسان کے درمیان پیداوار ان باتوں پر تقسیم ہوتی ہے کہ زمین کس کی ہے، بیل کس کے ہیں، محنت کون کتنی کرتا ہے، زمین اچھی ہے یا ویسے ہی ہے۔ زکواۃ خیرات، پیر کا حصہ مشترکہ خرمن سے نکلتا ہے۔ پیداواری رشتے فیوڈل اور کسان کے ہیں مگر شرائط الگ الگ ہیں؛

ششک

سردار زمین کا چھٹا حصہ الگ لے جاتا تھا۔ اور اس کے بعد قبائلیوں کی بقیہ زمین کی پیداوار سے بھی چھٹا حصہ سردار لے جاتا تھا۔

زمین کا مالک زمین کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں دیتا......نہ بیل، نہ ہل، نہ خرچ......اور پیداوار کا چھٹا حصہ لے جاتا ہے۔ اس کا فائدہ کسان کو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی فصل کاشت کرتا ہے اور اس سلسلہ میں فیوڈل کی مداخلت سے آزاد ہوتا ہے۔ زیادہ تر اس کسان کو نکالا بھی نہیں جاتا اور تبدیل بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چیارک

کسان کو سال کی دونوں فصلیں کاشت کرنی ہوتی ہیں اور غلہ اور بھوسہ و دیگر فائدوں کا چوتھا حصہ کسان کا ہے۔ کسان تخم نہیں دیتا۔ حشر، گوئٹ اور گیلی مٹی پر اخراجات کا چوتھائی اسے دینا پڑتا ہے۔ وہ بازو کا کام کرتا ہے۔ (خرمن کا غلہ صاف کرتا ہے، کٹائی کرتا ہے، ہل چلاتا ہے)۔ بیل فیوڈل کے ہوتے ہیں۔

سیک

بیل یہاں بھی فیوڈل کے ہیں لیکن کسانوں کو یہ بیل اپنے گھر رکھنے پڑتے ہیں اور انہیں کھلانا پڑتا ہے۔ بیج بھی فیوڈل دیتا ہے۔ ہر پیداوار کا تیسرا حصہ کسان کا ہوتا ہے۔

نصف

یہاں بیلوں کا جوڑا کسان کا ہوتا ہے۔ تخم فیوڈل اور کسان کو برابر برابر دینا ہوتا ہے۔ محنت کسان کی ہوتی ہے۔ آمدن اور خرچ آدھو آدھ ہوتی ہے۔ فیوڈلزم کی یہ شکل غیر حاضر فیوڈل کی زمینوں پر ہوتی ہے۔

مالک کا تہائی حصہ

یہاں زمین مالک کی ہوتی ہے۔ باقی سارا جنجال کسان کو کرنا پڑتا ہے۔ تخم اور دیگر خرچہ سارا کسان کا اور اسی طرح سارے دیگر فائدے بھی کسان کے ذمے ہوتے ہیں۔

بوھروئی

زمین فیوڈل کی ہے۔ وہ اسے کسان کو دیتا ہے۔ شرط یہ رکھتا ہے کہ کسان سال کا ایک معین مقدار غلہ اسے دے گا۔

پتی

یہاں کسان بقیہ زمین پر تو معاہدے کی شرائط کے مطابق بزگری کرتا ہے مگر کسی ایک کھیت، یا کسی ایک بند کی ساری فصل کسان اپنے فیوڈل کو تحفہ میں دیتا ہے۔

کند ھوئی

بیل لاتا ہے، سال تک اسے استعمال کرتا ہے۔ اس کا معاوضہ وہ ایک خاص متعین مقدار میں غلہ کی صورت میں دیتا ہے۔ یہ غلہ پیداوار کی مقدار سے بندھا ہوا نہیں ہوتا۔

روزانہ اجرت

بلوچستان بھر میں نقد آور فصلوں کی کاشت کا رواج بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ان فصلوں میں پیاز، سبزیاں، تمباکو، چارہ، میوے اور کپاس شامل ہیں۔ نقد آور زراعت میں روزانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔اسی طرح زراعت میں مشینوں کے استعمال سے بھی ان مشینوں سے وابستہ مزدوروں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔

وسطی بلوچستان میں البتہ موروثی کسان گیری اس زمین پر ہوتی ہے جس کے لیے لوگوں کے پاس انفرادی ایک مخصوص وقت تک کے حقوق ہوتے ہیں ۔ یہ طریقہ بالخصوص بارانی علاقوں (مستنگ ، قلات ، خضدار اور خاران اضلاع) میں عام ہے ۔موروثی کسان گیری حقوق کو عموماً بیچا اور کسی اور کو کرایہ پر دیا کیا جا سکتا ہے ۔اگر بیچا جائے تو لازم ہے کہ کسان گیری کے حقوق پہلے زمین کے مالک کو پیش کیے جائیں ۔اسی طرح اگر زمین کا مالک زمین کو فروخت کرے تو پہلی پیشکش کسان کو دی جائے ۔اپنی مرضی سے کسان بننے والی صورت مکران اور کچھی کے کچھ حصوں میں عام ہے جہاں ایسا سمجھوتہ ہر سال نیا ہو جاتا ہے ۔

ھشر ، مشر ، واھر

ہشر میں نے جان بوجھ کر ’’ح‘‘ سے نہیں لکھا اس لیے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ کا شوق ہے کہ ہر چیز کو لے جا کر عربوں سے ملا دیں ۔ہشر کے بارے میں بھی میں نے دو تین جگہ پر دیکھا کہ یاروں نے ’’ہشر‘‘ کے لفظ کے ناک میں نکیل ڈال کر اس کی مہار کھینچ کھینچ کر اسے سعودی عرب جا پہنچایا ۔مثلاً فیروز سنز (10) کے منبع سے حفیظ بزدار (11) یہ دور کی کوڑی لائے کہ ہشر عربی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے ’’شامل کرنا‘‘ یا ’’شامل ہونا‘‘ ۔اللہ ہماری ہدایت کرے ۔لفظ ’’ہشر‘‘ قدیم آریائی لفظ ہے ۔(12) یہ صرف ہمارے علاقے میں استعمال ہوتا ہے ۔صرف بلوچ، پشتون و دیگر پڑوسی اقوام اس لفظ کے معانی اور اس کی وسعت سے واقف ہیں ۔

بلوچوں کے اندر دوسرے لفظوں کی طرح اس لفظ کی بھی بے شمار صورتیں ،شکلیں ہیں ۔ یہ لفظ اصل میں زمین کے تقسیم ہونے اور نجی ملکیت میں جانے کے بعد کا لفظ ہے جبکہ بڑے کام ایک شخص یا دو تین افراد سے نہیں ہو سکتے تھے ۔مزدوری کا رواج بھی نہ تھا اور نہ مزدور کو اجرت دینے کے لیے کرنسی مروج تھی ۔صرف ایک صورت تھی ،اور وہ یہ کہ کام کرنے والے افراد جمع ہو جاتے اور مل کر

یہ کام سرانجام دیتے ،کھانا کھاتے اور واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ۔ اللہ اللہ خیر صلا ۔قدیم انسانی سماج کے بارے میں آج کی علمی تحقیق اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ان کا طبیعی ماحول انہیں اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ اکٹھے ہو کر کام کریں اور محنت کے ثمر کو مل کر کھائیں ۔

تاریخ میں زوراک دوم توران کا اعلیٰ امیر گزرا ہے جس نے اپنی امارت کے وقت ہشر کو رواج دیا تھا ۔اہم اور بہت بڑے بڑے کام اس رواج کی وجہ سے بہت جلد تکمیل کو پہنچے ۔اس کے نتیجے میں سرزمین توران کے ایک سرے سے دوسرے سے تک دشتوں میں لاتعداد بند آبہ تعمیر ہوئے ۔ ایسا کام جو لوگوں کی بڑی تعداد سرانجام دے اسے ہشر کہا جاتا ہے ۔(13) ہشر کا لفظ وہیں استعمال ہوتا ہے جہاں پہ یہ کام مرد کرتے ہوں ۔عورتوں کے مل کر کام کرنے کو ہشر نہیں کہتے حالانکہ وہ بھی ایک دوسرے کی مدد کے لیے اکٹھی ہو جاتی ہیں، چائے اور کھانا مل کر بناتی ہیں ،اپنا کام مکمل کرتی ہیں اور روانہ ہوتی ہیں اپنے آقا (خاوند) کے گھر ۔وہ شادی کی چٹائی کے لیے مل کر پیش لاتی ہیں، پیش کو مل کر بناتی ہیں، بنتی ہیں مگر اس کو ہشر کہنے کی اصطلاح نہیں بننے دی گئی ۔(کم اصل کا واھر کیا، کم اصل کا ہشر کیسا؟) ۔اسی طرح وہ شادی کی سیج مل کر سیتی ہیں ،شادی بیاہ کی دعوت کا کھانا مل کر پکاتی ہیں ،فصل کی کٹائی مل کر کرتی ہیں مگر حرام ہے اگر ’’ہشر‘‘ کا لفظ ان کے لیے استعمال ہو ۔

بلوچ ہر اس کام کو ہشر کہتے ہیں جسے گاؤں کے بہت سے افراد مل کر کرتے ہیں ۔ کاشتکاری ،گھر اور مکان کی تعمیر ،راستہ اور سڑک کی مرمت ،مختصر یہ کہ جس وقت بہت سے مرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اپنے کسی مشترکہ کام کے لیے یا ایک شخص کے کام کے لیے ،وہ ہشر ہے ۔

مالک صرف انہیں اور ان کے جانوروں کو اس ٹائم کا کھانا اور چارہ دیتا ہے (14) ۔ دکھ، تکلیف ،جرمانہ ،ناگمان ،بیماری تو ہر کسی پر آ سکتے ہیں ۔آج اِس کی باری ہے تو کل اُس کی ۔آج تم پہ آئی ہے کل مجھ پر آ سکتی ہے ۔اس لیے ہر کوئی جا کر اپنا کندھا دیتا ہے تاکہ آج اس کا کام آسان ہو جائے تو کل خود اس کا اپنا بار ہلکا ہو جائے گا ۔واھر اور ہشر اس لیے لازم ہیں ۔

ہشر سندھ میں بھی ہوتا ہے اور پنجاب میں بھی ۔سندھ میں اسے ’’ونگار‘‘ کہتے ہیں ۔ یہ لفظ بلوچستان کے نصیر آباد ڈویژن میں بھی ’’ہشر‘‘ کی جگہ استعمال ہوتا ہے ،اور استعمال بھی اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وسیع معنوں میں ہوتا ہے۔ کچھ پشتون اسے پگاڑا کہتے ہیں۔ (15) مگر صوبہ سرحد میں اسے ہشر ہی کہتے ہیں۔ ازبکستان میں بھی اس مشترکہ محنت کا نام ہشر رہا ہے۔ روسیوں نے اُسے ''سپوتنک'' کا نام دے رکھا ہے۔

آج کل بلوچ عموماً ہشر کو صرف زراعت تک محدود کرتے ہیں۔ وہ ہل یا کین چلانے کے رضا کارانہ، بلا معاوضہ، اجتماعی کام کو ہشر کہتے ہیں۔ بیلوں کا جوڑا بھیجا جاتا ہے ہل چلانے والے کے ساتھ۔ ہل چلانے والا مالک خود بھی ہوسکتا ہے اور اس کا بزگر (راہک) بھی۔ ہشر میں کام کرنے والوں کو ''ہشری'' کہتے ہیں۔ جس آدمی نے اپنے کھیت میں ہشر سے کام کرانا ہوتا ہے، وہ ایک دو روز قبل ہشر کے دن کی درخواست نما اطلاع ہشریوں کو دیتا ہے اور ان سے شراکت کا اصرار کرتا ہے۔ وہ کام کی نوعیت اور حد بتاتا ہے اور بیلوں کے جوڑے سمیت ہشری کو ''مانگتا'' ہے۔ اگر کین کا کام ہو تو کین اور ہل دونوں لے جانے پڑتے ہیں۔ اگر صرف ہل کا کام ہے تو صرف ہل لے جانا ہوتا ہے۔ اس کام میں کوئی منت اور احسان نہیں ہے۔ یہ امدادِ باہمی کا کام ہے۔ ہر ایک روایتاً مانگتا ہے اور ہر ایک روایتاً تیار ہوجاتا ہے۔

ہشر کی بات جب بھی ہوتی ہے تو بلوچ کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے آدھے گز کی سیخ نما وہ چھڑی آجاتی ہے جس پر آخر تک ابلا ہوا گوشت پرویا ہوتا ہے۔ گوشت کے ابلے ہوئے خوبصورت اور موٹے موٹے ٹکڑے، کلیجی کے ٹکڑے، چربی کی چکیاں...... ہر کسان اس پروئے ہوئے گوشت کی لڑی کو ہاتھ میں تھامے نمائش کے طور پر نمایاں کرتا ہوا چلا جاتا ہے اپنے گھر کی طرف۔ اگر ہشری کم از کم سات افراد ہیں تو مالک ایک دنبہ (کم از کم) ان کے لیے ذبح کرتا ہے۔ اگر سات افراد سے زیادہ ہوں تو دو، تین یا افراد کے تناسب سے اس سے بھی زیادہ دنبے لازماً ذبح کرنے پڑتے ہیں۔

ول ڈورانٹ نے لکھا کہ ''ہمارے اندر لالچ، حرس اور لڑاکا پن، اس خاطر ہے کہ ہمارے ذہن میں ان ہزاروں لاکھوں سالوں کی یادداشت موجود ہے جب ہمارے آباؤ اجداد کو زندہ رہنے کے لیے دوڑ، بھاگ، لڑائی، مار دھاڑ لازماً کرنا پڑتی تھی۔ وہ اس خوف کے سبب اپنا

پیٹ حد سے زیادہ بھرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ اگلا شکار جلد نہ مل پائے اور بھوک سے مرنا پڑے۔'' (16) بات خواہ آباؤ اجداد کی مشکل زندگانی اور خوراک کی نایابی کی ہو یا آج کے استحصالی سماج میں خوراک کی غیر مساوی تقسیم کی ہو، یا پھر کسان کی طرف سے گوشت کو لڑی میں پرو کر سرعام نمائش کرنے کی شوبازی ہو، مگر سچی بات یہ ہے کہ جب بھی سیخ پر پروئے ہوئے گوشت کے ساتھ کوئی کسان گزرے تو دل کہتا ہے کہ اگر بس چلتا تو جھپٹ کر گوشت کی دو تین بوٹیاں سیخ سے توڑ کر نگل جاؤں۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ کسان لاٹھی مارتا ہے یا پتھر۔

گوشت کو سیخ میں لگا کر گھر کی طرف لے جانے کا رواج بلوچوں میں الگ الگ ہے۔ مثلاً مری میں بجارانی گوشت گھر لے جاتا ہے۔ لوہارانی اور گزینی گوشت گھر نہیں لے جاتے۔ بلکہ وہاں ہشر کا مالک گوشت لاتا ہے اور پاتار (چٹائی کے اوپر سجا کر رکھ دیتا ہے۔ اور سارے ہشری، معاہدے کے مطابق پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ انہیں پیٹ بھر کر کھانا لازمی ہوتا ہے۔ جب ڈکار مار کر ہشری روانہ ہوجاتے ہیں تو باقی بچا ہوا گوشت مالک کا ہوتا ہے۔ کسان (ہشری) روٹی اور سالن کو منہ بھی نہیں لگاتے۔ مگر بجارانی میں کسان زور دیتا ہے تریت کی تھالی پر۔ اور اپنا گوشت کا حصہ عموماً کھیت پر نہیں کھاتا بلکہ گھر لے جاتا ہے۔ ہشر کا تریت اس لیے زبردست ہوتا ہے کہ اس میں سالن سے بھرے تھال میں روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے سے قبل ڈال دی جاتی ہے اور اس کے اوپر چینی یا گڑ چھڑکا جاتا ہے۔

گوشت کے حصہ داروں میں دو افراد کا اضافہ کر کے اسے برابر بانٹ دیا جاتا ہے۔ ایک فرد تو کھیت کا مالک ہوتا ہے، دوسری مالکن۔ باقی ہشریوں کا۔ ذبح کیے ہوئے مویشیوں کی کھال بھوتار (مالک) کی ہوتی ہے۔ باقی پائے سے لے کر اوجھری تک سب وہیں تقسیم ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں چھوڑنا ہوتا۔ ایک سے زیادہ مویشی ذبح کرنے کی صورت میں ہر مویشی پر ایک اضافی حصہ (بھوتار) کا ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گوشت ہشری کے علاوہ کوئی اور نہیں کھاتا، نہ ہی کسی اور کو دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی کو کھلانا چاہیں بھی تو اسے رواجاً انکار کرنا ہوتا ہے۔ (جو کام کرے وہی کھائے!)۔ کسان جب اپنا حصہ (سیخ پر لٹکائے ہوئے) گھر لاتا ہے تو آدھا حصہ خود رکھتا ہے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آدھا بیلوں کے مالک یعنی اپنے مالک کو (جس کا وہ بزگر ہوتا ہے) بھیج دیتا ہے۔ (بیلوں کا یہ بدبخت حصہ ہشر کے گوشت سے لے کر فصل کی پیداوار تک بزگر کو اپنے مالک کو دینا ہوتا ہے۔ وہ بیچارہ اپنی محنت کا پھل مکمل طور پر اس لیے نہیں رکھ سکتا کہ نہ ذرائع پیداوار (زمین) اس کی اپنی ہوتی ہے اور نہ آلات پیداوار یعنی بیل ہل وغیرہ اس کے اپنے ہوتے ہیں)۔

یہ تو تھا اس کھانے کا حصہ جو کام کے ختم کرنے پر دیا جاتا ہے۔ رات کا کھانا کوئی نہیں دیتا۔ صبح کھانے کے لیے (سالن وغیرہ) مہیا کرنا پڑتا ہے ہشر کے مالک کو۔ جب کہ روٹی وہ ہشر میں حصہ لینے والے کسانوں کے گھروں سے اکٹھی کر کے لاتا ہے۔ دوپہر کی روٹی اور سالن مالک کو مہیا کرنا ہوتا ہے۔ کسانوں کو تھوڑی دیر تک آرام دلانے کے لیے آئے ہوئے متبادل افراد کو بھی دوپہر کا کھانا مالک ہی دیتا ہے۔ بیلوں کا چارہ موسم کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اگر ہشر ایک ایسے موسم میں ہو رہا ہو کہ سبز چارہ کھیت پر میسر ہے تو کھانے کے وقفے کے دوران بیلوں کو بھی چارہ دیتا ہے مالک۔ ناشتہ ظاہر ہے کہ جانور نہیں کھاتے صرف ہشری یہ عیاشی کر سکتے ہیں ہشر کے بھوتار کے خرچ پر۔

آلات یعنی ہل، کین، جغ وغیرہ کھیت تک اٹھا لے جانے کی ذمہ داری ہشر کے مالک کی ہوتی ہے جبکہ انہیں واپس ہر ہشری خود لاتا ہے۔

جان محمد (17) نے ہشر کے ہم معنی ایک لفظ کی تفصیل دی ہے جس کا نام ''ہواچک'' ہے۔ میں نے یہاں وہاں سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ پنجگور میں ہشر کو ''ہواچک'' کہتے ہیں۔ تربت کے علاقے میں ہشر اور ہواچک دونوں مستعمل ہیں۔ مگر مشرقی قبائل کے ہشر سے اس کا فرق یہ ہے کہ وہاں صرف ہل اور کین کے اجتماعی کام کو ہشر کہا جاتا ہے جبکہ پنجگور میں لوگ ہر اجتماعی کام کو ہواچک کہتے ہیں۔

مشر بھی ہوتا تو ہشر کی طرح ہے۔ مگر اس میں بیل کے جوڑے پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ دنبہ عموماً ذبح کیا جاتا ہے مگر لازم نہیں ہے۔ بس صبح شام کا کھانا دینا پڑتا ہے۔ یہ کھانا دوسرا مہمان یا مسافر بھی کھا سکتا ہے۔ گوشت گھر کوئی نہیں لے جاتا۔ بیل کا جوڑا اور کسان یہاں بھی

مالک کو مانگنے پڑتے ہیں۔

واھر بھی ایک رضا کارانہ امداد باہمی ہوتی ہے۔ یہاں لوگ بیلوں کی جوڑی خود لے جاتے ہیں۔ مانگنا نہیں پڑتا۔ یہ نسبتاً بے ساختہ وخود کار امداد ہوتی ہے جو عزیز، رشتہ دار، پڑوسی یا دوست دوسرے کسان کو کام میں دیتے ہیں۔

دراصل یہ سارے مظاہر آپس میں مدد و تعاون کے معاہدے ہیں۔ یہ معاہدے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ آٹو میٹک طور پر ایک دوسرے کے کام آنے کے رواج ہیں۔ یہ قوانین نہ کسی ملا مولوی نے بنائے اور نہ کسی سرکار سردار نے اور نہ ہی کسی کمیٹی یا کمیونسٹ پارٹی نے۔ یہ تو شکستہ وریختہ قدیم سماج کی اپنی پس ماندہ اچھائی ہے۔ اور یہ قانون صرف ایک علاقے میں نہیں ہے بلکہ سارے بلوچ میں، پشتون اور سندھ و ہند المختصر پوری دنیا میں چھوٹے بڑے فرق کے ساتھ موجود رہا ہے۔ یہ سماج کی سلامتی اور صحت مندی کی ایک علامت، ایک نشانی ہے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی اور ہمکاری کی علامت۔ بھائی چارے اور کامریڈ شپ بڑھتی ہے، دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے، اور بلغو اور گانے ہوتے ہیں، کسان کی چیخ و پکار، سیٹی نعرے، کووڈورڈ کا تبادلہ، حال احوال، الغرض سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ کسان کے کلچر کی بھرپور نمائندہ چیز ہوتی ہے۔ ہشر، مشر اور واھر زندگی کے ہر پہلو کو امیر بناتے ہیں۔ یہاں زندگی کے مسائل پر بات ہوتی ہے۔ اور اجتماعی چیخ و پکار سے حل ہوتے ہیں۔

ہشر، مشر اور واھر اتنے پیارے رواج ہیں کہ غریب، امیر، بے بس، طاقتور سب کو فائدہ دیتے ہیں۔ علاقہ خواہ ساتیں والی کا ہو یا سائبیریا کا، لیڈر خواہ کاسٹرو ہو یا کوئی کہور خان زئی (مری کا ایک قبیلہ ہے) ہو، نظام خواہ قدیم کمیونزم ہو یا ترقی یافتہ سوشلزم کا، میلے کچیلے اور بے شعور بلوچ کے ہشر، مشر اور واھر کا دستور ہر کسی کو اپنانا ہوتا ہے۔ انسان اور حیوان کے اندر فرق ان میں ہشر کی موجودگی یا غیر موجودگی میں ہوتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حوالہ جات

1-ول ڈورانٹ/ظفر الحسن ''تاریخ کیا سکھاتی ہے؟''۔1990،روھتاس بکس،ٹمپل روڈ لاہور۔صفحہ نمبر17۔

2-ڈسٹرکٹ پروفائل سبی۔صفحہ نمبر29۔

3- گزیٹیئر آف بلوچستان۔کچھی۔دوسرا ایڈیشن،1986۔گوشۂ ادب کوئٹہ،صفحہ نمبر93۔

4-سبی گزیٹیئر،صفحہ نمبر111۔

5-محبوب رضا،صفحہ نمبر34۔

6-سید،مجیب رضا،Investment Opportunities in Balochistan۔الوہاب پرنٹرز کراچی،صفحہ نمبر34۔

7-سید،مجیب رضا،Investment Opportunities in Balochistan۔الوہاب پرنٹرز کراچی،صفحہ نمبر118۔

8- کیچ پروفائل،صفحہ نمبر37۔

9-نودھانی،عوامی جمہوریت لاہور۔

10-فیروز سنز انسائیکلوپیڈیا1984،تیسرا ایڈیشن۔فیروز سنز لاہور،صفحہ نمبر430۔

11-بزدار،عبدالحفیظ۔''حشر''۔کوآپریٹو سیلف ہیلپ ان بلوچستان،پمفلٹ۔

12-عطائی،ابراہیم،''خیل اوویش''1981۔افغانستان اکیڈمی آف سائنسز کابل،صفحہ نمبر32۔

13-اخوند صالح محمد/عبداللہ جان،نادر قمبرانی۔''گوردگال نامک''۔1994،بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ نمبر26۔

14- گزیٹیئرز آف بلوچستان،جھالاوان۔1986،گوشۂ ادب کوئٹہ۔صفحہ نمبر112۔

15-عطائی،خیل اوویش۔صفحہ نمبر43۔

16-ول ڈورانٹ/ظفر الحسن،''تاریخ کیا سکھاتی ہے''۔1990،صفحہ نمبر20۔

17-جان محمد،''دی بلوچ کلچرل ہیری ٹیج''،1982۔رائل بک کمپنی کراچی۔صفحہ نمبر64۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چوتھا باب

سمندری پیداواری رشتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

1۔ ماہی گیری

بلوچ ساحل پہ مچھلی کی تقریباً 350 سے زائد اقسام موجود ہیں۔ پران و شرمپ جیسی مہنگی برآمدی مچھلی بھی۔ ٹنوں کے حساب سے برامدی مچھلی۔ کوئی پراسیسنگ سہولیات نہیں۔ سیٹھوں دلالوں (غیر بلوچ ہوتے ہیں) کی کمائی کا ایک بلوچ ذریعہ۔ تباہ حال ماہی گیر، تباہ حال بلوچ۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ۔

جیٹی، دو بڑی ء دنیاؤں کو ملانے والا پلیٹ فارم ہوتا ہے، دو مختلف بری ماحالیاتی ثقافتی اور معاشی دنیاؤں کو ملانے والا پلیٹ فارم۔ ہفتوں تک سمندر میں در بدر رہنے کے بعد دو تین دن کے لیے جیٹی، ماہی گیر اور اس کی کشتی کو خشکی پر انسانی حیات کے کاروان میں شمولیت دلانے والی دلآویز جگہ ہوتی ہے۔ مگر دوسری طرف یہی وہ منحوس جگہ ہے جہاں انسانی معاشرہ کی سب سے بڑئی برائی بھی شروع ہوتی ہے کہ یہیں پہ اس کا ناترس استحصال شروع ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے ڈریکولا اس کی پیداوار کو سستے داموں ہتھیا کر اپنی چیزیں اس پر مہنگی فروخت کر دیتے ہیں۔

بلوچ ساحل پر مچھلی کی 350 سے زائد اقسام کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے۔ سمندری ممالیہ حیات میں ڈولفن، Propoises، دودھ پلانے والی مچھلیاں اور وہیل پائے جاتے ہیں۔ سمندری کچھوے تو دنیا جانتی ہے کہ بچے جننے کے لیے مکران کے ساحلوں کا دورہ کرتے ہیں۔ Taq، جزیرہِ استولا، جیوانی، اور گنز سمندری کچھوے کیلیے اہم آشیانے ہیں۔ سبز کچھوا اور زیتون، Riddle کچھوے دونوں بلوچ ساحل پر پائے جاتے ہیں۔ آئیے ہم صرف بلوچ سمندر کی مچھلیوں کی قسموں پر ایک نظر دوڑائیں۔

پاگاس (شارک)

ہم خشکی کے رہنے والوں کیلیے جب بھی شارک اور وہیل مچھلی کا نام آتا ہے تو ہم ٹی وی پہ دیکھے اور کتابوں میں پڑھے ہوئے دیوہیکل اور آدم خور سمندری بلاؤں کا سوچتے ہیں۔ مگر بلوچ سمندر میں اس بڑے مہلک شارک کا سمال سائز پایا جاتا ہے جو محض دس بیس سیر کا ہوتا ہے اسے ہمارے محنت کے ولی پکڑتے ہیں، صاف کرتے ہیں اور تازہ یا پھر خشک کر کے سری لنکا برآمد کرتے ہیں۔ یہاں کے چھوٹے شارکوں کے نام ہیں:۔ بمپل، سورازپی، بگوئی، سیاہ گوش، کالی زید، جبروٹی، بارکالی، گورک، کانٹو، جومبو، گسو، چتی وغیرہ وغیرہ۔

کھانے کی مچھلیاں

کھانے کی بڑی مچھلی کی قسمیں یہ ہیں:

گور، گنڑ ان، سنگلور، کرّ، سولی، سارم، سونام، گیدر، کڑہ، تو لگ، گور، اہور، گور چک، کلگن، گزی گواز، الس، کشگی، کندو۔ وغیرہ۔

کھانے کی درمیانی مچھلیوں کے نام یہ ہیں:

سہرو، گدری، سفیت، تنگلم، سیاہیں تنگلم، گوانز، مشکو، سولی چک، سیاہو، نامبو، چیلانکر، بڑی، پنڈاسی، پشنت، تاکاں، بولا، جاراڑ، پتر، کاکاون، سہردپ، سہر پیگ، چیل، دولنٹ، کلانچو، چانچو، کنلو، چاہ، ٹٹیل، الولو، آدھے کلاہ، کلونٹو، ماہ پری، ٹاٹار، ٹونٹ، لونڈ، چناور۔ وغیرہ۔

کھانے کی چھوٹی مچھلی کی قسمیں:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوجر (sardines)، مربہ، بلو، ہینگ، تاگاں، گواریز، مرو، سواسک، کگڑ، بوتی، بڑنی، اشور، پالیڈی، دنگولی وغیرہ۔

مچھلی کی کچھ اور قسمیں یہ ہیں:

سکیٹ، رے، ٹونا، سائمن، ٹراؤٹ، باس، کراکر، پرچ، ہیرنگ، سارڈین، کارنج، گولاٹ، راکو اور پٹن وغیرہ۔ (پٹن کی اپنی مزید قسمیں ہیں مثلاً دولنٹ، ہتھوڑا، ابرہ، بہرن، لیڈ وغیرہ۔

مدگ:

جب بھی آپ دنیا میں کہیں بھی کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوں تو جب مینو پہ Prawns لکھا پائیں تو سمجھ لیں کہ یہ آپ کے لیے کسی بلوچ محنت کش نے پکڑے تھے۔ ایرانی بلوچستان سے لے کر پاکستانی بلوچستان میں اسے ''مدگ'' کہتے ہیں۔

یہ ہماری عام جانی پہچانی مچھلیوں سے جدا ہیں۔ ان کے جسم اور ٹانگوں پر خاص قسم کی جلد ہوتی ہے۔ ان میں نہ ہڈی ہوتی ہے نہ کانٹے۔ سارا جسم گوشت ہی گوشت ہے اور یہ گوشت پروٹین میں بہت امیر ہوتا ہے۔ اسی لیے بیرونی ممالک خصوصاً جاپان اور امریکہ میں اس کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ ''مدگ''، پسنی، گوادر اور کلمت میں بہت ہوتی ہے۔

مدگ کی کئی اقسام ہیں:

جیارو، پٹاپٹی، کڈی مات، ٹائیگر، شرمپ، لسو، کلری اور کڈی۔ شرمپ پاکستان میں اہمیت کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔ یہ عموماً کم گہرے پانیوں (20-30 میٹر) میں ہوتی ہے۔ ہمارا سمندر تو سمجھیں شرمپ سے بھرا ہوا ہے۔

کلری اور جیارو بھی بیرون ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں برف میں جما کر ہوائی جہاز کے ذریعے باہر بھیجا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نعمت بلوچستان کو حاصل نہیں ہے۔ یہ چیزیں دور کراچی میں بیٹھے سرمایہ داروں کے کنٹرول میں ہیں۔

بلوچستان کے ساحلی پانیوں میں مچھلی پکڑ کر بلوچ ساحل پر اتارنے والی مچھلی کی

مقدار 119,000 ٹن ہے۔ جبکہ مزید 60,000 ٹن پکڑی تو جاتی ہے بلوچستان میں، مگر اتاری جاتی ہے کراچی میں۔ دونوں کو ملا کر تقریباً 2 ارب روپے سالانہ کی مچھلی بلوچ سمندر میں پکڑی جاتی ہے (ہم پھر بھی غریب صوبہ کہلائے جاتے ہیں اور مرکز خدا ترسی میں ہمارے صوبائی بجٹ کا خسارہ عطا کرتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وسیع صوبائی خودمختاری مالی حقوق کی دستیابی کے علاوہ ہماری عزت نفس، ہماری خودداری کے لیے بھی اشد ضروری ہے)۔

سچی بات یہ ہے کہ سمندری ماحولیات کو بگاڑے بغیر ہم تین لاکھ ٹن ماہی پکڑ سکتے ہیں۔

ابھی ہم 180,000 ٹن ماہی پکڑ سکنے کے قابل ہیں۔ یعنی ہم ابھی تک سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار ٹن مزید ماہی پکڑ سکتے ہیں۔ جس کے لیے ہمیں مزید بارہ سو کشتیوں کی ضرورت ہوگی۔

بلوچ کی ماہی گیری اور اس کا پورا عمل ابھی بہت فرسودہ اور ابتدائی ہے۔ پکڑی ہوئی مچھلی کا ایک بڑا حصہ سمندر میں ضائع ہے۔ 35 فشنگ گاؤں میں سے صرف دو (گوادر، پسنی) میں فش ہاربر ہیں۔ باقیوں میں اندھیر ہی اندھیر ہے۔ فزیکل انفراسٹرکچر اور ساحل پر سہولیات کی غیر موجودگی میں مچھلی ابھی تک بے حجاب اور ننگی زمین پہ ہینڈل کی جاتی ہے۔ جہاں ہر قسم کی گندگی پڑی ہوتی ہے اور ابتر ہائی جین جلد ہی مچھلی کی کوالٹی خراب کر دیتی ہے۔ اس فوری سڑاند کے نتیجے میں ماہی کا 70 فیصد ضائع ہو جاتا ہے۔ بڑی سائز کا شرمپ اور لابسٹر دو ایسی اجناس ہیں جنہیں پکڑ کے کے فوراً بعد برف میں رکھا جاتا ہے۔ چھوٹی سائز کے شرمپ (کڈی) کو بھی بید کی ٹوکریوں میں برف میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ ماہی گیری کی کشتیوں میں Insulatyed (پولی سٹرین) کے ڈبے ہوتے ہیں جن میں ''جیرا'' گریڈ کے شرمپ کو رکھا جاتا ہے۔

فش ہاربر پہنچ کر پکڑی ہوئی مچھلی اتاری جاتی ہے اور ''جیرا'' کے علاوہ ساری مچھلی کو نیلامی کے ہال میں فرش پر پٹخ دیا جاتا ہے۔ ڈھیر لگ جاتے ہیں اتارنے اور نکلام کرنے کے دوران۔ طویل دورانیہ (10 سے 30 دن) کے ٹرپ میں پکڑی مچھلی کو جہاز کے تختے پر ہی صاف کیا جاتا ہے۔ یہ طریقے بہت ہی ضیاع والے ہیں۔ قیمتی ماہی کے لیے برف کے سٹوریج کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ جبکہ بقیہ ماہی مثلاً پاگاس، ڈول فش، کیٹ فش، سپینش سیل فش، کوئین فش، میکرلز، مارلنز، اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹرولیز کی آنتیں نکالی جاتی ہیں، انہیں چیر پھاڑ کران کو نمک لگایا جاتا ہے۔(ماہی کو خشک کرنا ہمارے ساحل کیا یک بڑی سرگرمی اور ذریعہ معاش ہے) اور تختہ جہاز پر ان کا انبار لگایا جاتا ہے، ماہی کی Curing (نمکی لگا کر خشک کر کے محفوظ بنانا) بہت گندی حالت میں کی جاتی ہے۔ یہ طریقے بہت فرسودہ ہیں جن کا ترک کرنا بہت ضروری ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ فریز کرنے اور پراسیسنگ کی صنعتیں لگائی جائیں تا کہ زیادہ سے زیادہ اور قیمتی پیداوار حاصل ہو اور اس سیکٹر میں ترقی ہو۔ مچھلی کی ترقی یافتہ پراسیسنگ یعنی ڈبوں میں بند کرنا وغیرہ بلوچستان میں کہیں نہیں ہوتی۔

فارمی مرغی کے لیے پولٹری فارم کے مالکان جو خراک خریدتے ہیں، ان میں بہت قیمتی مچھلی بھی شامل ہوتی ہے۔

بلوچ ساحل پر جون سے ستمبر کے اوائل تک ماہی گیری نہیں ہوتی کہ مون سون کا موسم ہوتا ہے اور سمندر مکمل وجد میں آجاتا ہے۔ بپھرے پانی کے جوش میں بے چارہ انسان اور اس کا ساز اور سامان سمندر کے لامتناہی پیٹ میں نگل لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ چھٹی۔

ماہی گیری ایک بڑی صنعت کے طور پر ابھر رہی ہے اور مزید پھیل رہی ہے مگر اس کا اصل فائدہ ماہی گیر عوام کو نہیں ملتا۔ مڈل مین فائدے لوٹتا ہے۔ یہ مڈل مین بہت ذلیل حالات پیدا کرتا ہے۔ اس نے ساحلی معیشت کو مکمل طور پر کنٹرول کر رکھا ہے۔ یہاں اس نے Serfdom (زرعی غلامی) کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ ماہی گیر اور حتیٰ کہ کشتیوں کے مالک بھی غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں اور مڈل مین یا سیٹھوں سے قرض لیتے ہیں۔ یہ لوگ مزید محنت کرتے ہیں محض قرض اتارنے کی خاطر۔ مگر قرض ہے کہ بڑھتا رہتا ہے، ضروریات ہیں کہ مہنگی ہوتی جاتی ہیں۔ یہ سود والا قرض ہوتا ہے اور جب تک قرض ادا نہیں ہوتا مقروض پابند ہوتا ہے کہ اپنی مچھلی اسی قرض خواہ کو مارکیٹ ریٹ سے بہت کم قیمت پر فروخت کرے۔ اگر ماہی گیر کا دماغ زیادہ ''خراب'' ہو تو وہ کسی اور سیٹھ یا دلال سے قرض لے کر پچھلے قرض خواہ کا قرض چکا دیتا ہے۔ تب وہ نئے قرض خواہ کو اپنی مچھلی بیچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہے تو مالک بدل سکتا ہے مگر آزاد نہیں ہوسکتا، اپنی تقدیر بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ جیٹی میں یہ دلال معمولی قیمت پر ماہی گیر کی مچھلی ہتھیا لیتا ہے۔

نیلام والا دلال فروخت پر 4 سے 5 فیصد کمیشن لیتا ہے۔ تازہ ماہی کے خریدار یا تو مقامی مڈل مین ہوتے ہیں یا پھر کراچی والے۔ نیلامی کے دوران بھی برف استعمال نہیں ہوتی۔ پکڑی ہوئی مچھلی ساحل پر رکھی جاتی ہے جہاں سورج کی شعاعیں اور گرد وغبار اس کا حشر کر دیتے ہیں۔ نیلام کے بعد ماہی کو یا تو نمک لگا کر خشک کر دیا جاتا ہے یا فروخت کے خشکی والے علاقوں کی طرف اونٹوں، گدھوں یا پک اپ پر روانہ کیا جاتا ہے۔ (کراچی، کیچ، پنجگور اور آواران) ہر جگہ کوسٹ گارڈ والے تنگ کرتے ہیں، رشت لیتے ہیں اور مچھلی چھینتے ہیں۔

بلوچستان کی مچھلی کا دس فیصد مقامی طور پر بیچا جاتا ہے جہاں سے مقامی آبادی کا وہ حصہ اپنی ضرورت کی مچھلی خریدتا ہے جو خود ماہی گیری میں شامل نہیں ہے۔ ساحلی بلوچ بڑا ماہی خور ہے، تازہ مچھلی کھاتا ہے وہ۔ سال بارہ مہینے وہ مچھلی ہی کھاتا رہا ہے، عاشق ہے اس پر۔ کبھی کبھار جب مچھلی نہیں ملتی تو دال سبزی کھاتا ہے منہ بسور کر، بڑی کوفت سے۔

یہاں کی مچھلی پورے مکران ڈویژن کو جاتی ہے۔ بقیہ مکران ایک زمانے میں مال کے بدلے مال کے تحت مچھلی لیتا تھا، کھجور لو، مچھلی دو۔ مگر اب تو کرنسی کا، روکڑ کا راج ہے۔

پکڑی ہوئی مچھلی کا 25 سے 35 فیصد پاکستان کے دیگر علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ مچھلی تازہ بھی ہوتی ہے اور خشک قسم کی بھی۔

کراچی یا بیرونی ممالک سے کچھ بزنس مین کھلے سمندر میں مچھلی خریدتے ہیں۔ اس طرح وہ پارٹ اخراجات سے بچ جاتے ہیں۔

خواہ تازہ مچھلی ہو یا خشک (یعنی سوریں) شکل میں، لازم ہے کہ یہ کراچی جائے اور وہاں سے دوسرے ممالک مثلاً سری لنکا، چین، کوریا، جاپان، سنگاپور، برطانیہ اور امریکہ کو۔ سری لنکا ہماری مچھلی خریدنے والا سب سے بڑا ملک ہے، مگر وہ قیمت بہت کم دیتا ہے۔

ماہی گیروں کے ہاں سیٹھوں اور دلالوں کے استحصال سے نجات کے لیے کبھی کبھار تنظیمیں بنتی رہتی ہیں مگر یہ کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ لیڈر شپ قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ نیز سیٹھوں اور دلالوں کے ایجنٹوں کی طرف سے بھی سازشیں ہوتی رہتی ہیں کہ ایسی تنظیم کاری نہ ہو پائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاسی پارٹیاں تو ''اور'' کاموں سے فارغ نہیں ہیں، وہ ٹریڈ یونین کیا بنائیں گی ؟۔ پاکستان کی ٹریڈ یونین تحریک بھی ''لیڈر زدہ'' حالت سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ اور اس طرح بلوچستان کی دو اہم صنعتیں (معدنیات اور ماہی گیری) بغیر ٹریڈ یونین کے ہیں۔ قیامت کے دن ہم سب کو لائن پر کھڑا ہونا ہوگا جوابدہی کے لیے ہے۔ جوابدہی بھی نہیں سزا پانے کے لیے۔ ہماری زبانوں سے بڑے بڑے بچھو لٹکے ہوں گے۔

ماہی گیری کے لیے انفراسٹرکچر اور ساحل پر سہولتوں کی کمی نے ہماری ماہی گیری کی صنعت کو اپاہج بنا رکھا ہے۔ تربیت گاہوں کی کمی نے اسے مزید نقصان پہنچایا ہے۔ میرین انجن اور ماہی گیری کے آلات کی کمی نے ایک طرف تو پیداوار کو بری طرح متاثر کیا ہے تو دوسری طرف ماہی گیری کو قدامت پرستی، رجعت پسندی، اوہام پرستی، اور پیری فقیری، تعصّبات کا شکار اور پیر پرست بنا ڈالتا ہے۔

بلوچ ماہی گیری کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ مارکیٹ کا نہ ہونا ہے۔ ساحلی شہروں کے اپنے درمیان پکی سڑکیں بنائی جائیں اور کراچی کی مارکیٹ کو منسوخ کر کے گوادر اور پسنی سے ڈائریکٹ مچھلی برآمد کرنے دی جائے۔ گوادر سے خلیجی علاقے محض تین گھنٹے دور ہیں جو ماہی کی برآمد کے لیے زبردست مارکیٹ ہیں۔

اور ماڑہ، گڈانی، سور، پیشوکان، چاندی، جیوانی اور ہنگول میں جیٹی کی سہولیات سخت ضروری ہیں۔ بلوچ ساحل پر ایک فشریز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا قیام بہت ضروری ہے ۔ انتہائی فرسودہ اور بہت پسماندہ بینکنگ کے نام پر نیشنل بینک، حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک، الائیڈ اور مسلم کمرشل بینک کی موجودہ شاخوں کی از سرِ نو تنظیم کرنی پڑے گی۔ ADBP ماہی گیروں کے ساتھ جو کھیل تماشے کرتی آئی ہے، سے الٹ دینا ہوگا۔ سمال بزنس کارپوریشن کی تمام تر اخلاقی اور انتظامی دیوالیہ پن کا علاج کرنا ہوگا۔ چونکہ صنعتی ترقی نہیں ہے، اس لیے آبپاشی کے ذرائع کو ترقی نہیں دی گئی۔ صرف ماہی گیری کو ہی ساحلی علاقوں کے باشندوں کا ذریعہ معاش رہنے دیا گیا۔ یہاں سمال انڈسٹریز سٹیٹس بنائی جائیں۔ ماہی گیروں کی سماجی معاشی حالات میں عمومی بہتری لانا انتہائی اہم

ہے۔ بے روزگاری، بے سکولی، بے ہسپتالی، اور بے بسی نے جس پیمانے پر نشہ اور دیگر اخلاقی بے راہ رویوں کا پھیلا دیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ مچھلی کی ہینڈلنگ، ڈسٹری بیوشن اور مارکیٹنگ کے نظام میں بنیادی تبدیلیوں سے لے کر ماہی گیروں کی تعلیم، صحت اور تفریحی مشاغل کی فراہمی تک کے پورے سلسلہ کو تبدیل کیا جائے۔

2۔ بوجیگ

بوجیگ تاریخی وسیلہ رہا ہے سمندری تجارت کا۔ یہ بلوچ ساحلوں سے انڈیا، عرب ممالک اور افریقی ساحلوں کے درمیان درآمد و برآمد کا بہت ہی اہم ذریعہ رہا ہے۔ یہ سو فٹ لمبا، 50 فٹ چوڑا اور 12 فٹ گہرا ہوتا تھا۔ یہ 100 ٹن تک وزن لے جانے کے قابل تھا یعنی 100 کلوگرام والے 1500 سے 2000 بوری گندم کے۔ خالص لکڑی کی بنی ہوئی اس پہلوان کشتی میں انجن نہیں ہوتا تھا۔

یہ بوجیگ بہت طویل سفر طے کیا کرتے تھے جو تین سے چھ ماہ تک کے عرصے کے ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو اپنے گھر لوٹے بغیر ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک مال لانے لے جانے میں پورا سال لگا لیتے تھے۔

ساحلِ بلوچ تاریخی طور پر تجارت کا شاہراہ رہا ہے۔ ماضی بعید میں بھی یہاں سے درآمد برآمد بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ خشکی کی طرف بھی اور سمندر میں بھی۔ ساحل سے بلوچستان کے اندرونی علاقوں (نیز دیگر پڑوسی علاقوں) میں بارٹر والی تجارت ہوا کرتی تھی، یعنی مال کے بدلے مال کی تجارت۔ جس میں ساحل انہیں مچھلی (خصوصاً مربہ اور کول گیر) مہیا کرتا تھا۔ اور خشکی کے بلوچ علاقوں سے خشک کھجور (لد، اُش کیچ اور ہارگ) اور تازہ کھجور (موزاتی، سورچ اور آمی) آتا تھا۔ کھجور اور آٹے سے بنی ہوئی مٹھائی (پنڈی) آتی تھی۔ گندم اور اصلی گھی آتا تھا۔

بوجیگ ہندوستان کے مالا بار، بمبے، کوچین، کالی کٹ، پور بندر، صورت اور جام نگر تک نمک لگی مچھلی (خصوصاً پلاّ، سولی، کیر، گور) پہنچاتا تھا اور وہاں سے درآمد کے بطور کھوپرا، بیڑی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پتے، ریڈی میڈ گارمنٹس، کھوپرے کا تیل، گندم، گھی، چاول، اور مٹی کا بنا ہوا توا (دانگی) لائے جاتے تھے۔

زنجبار (تنزانیہ) تک بوجیگ بلوچستان کی چٹائی، رسے رسیاں، کھجوریں، اور دیگر اشیا لے جاتے تھے۔ جبکہ وہاں سے ہر قسم کا بانس اور کشتیاں بنانے والی عمارتی لکڑی ڈھو کر لاتے تھے۔

عراق میں بصرہ کو بلوچستان سے چٹائیاں، رسے رسیاں اور خوردنی اشیا برآمد ہوتی تھیں اور بوجیگ کے ذریعے وہاں سے زاہدی اور کوسار نامی تازہ کھجوریں درآمد ہوتی تھیں۔

سب سے بڑی تجارت سری لنکا (سیلون) سے ہوتی تھی۔ بوجیگ کے ذریعے یہاں سے تو اچھی اور خیر والی چیزیں (نمک لگی مچھلی) جاتی تھیں۔ مگر ادھر سے فضول چیزیں آتی تھیں جو ہمارا قومی دشمن بن چکی ہیں۔

یکدار

پانچ سے لے کر گیارہ میٹر طویل ہوتا ہے۔ یہ کشتی جہاز کے پیندے کی بیچ کی ایک لمبی لکڑی سے بنتی ہے۔ یکدار اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہولیگ (چپو) والے یکدار تو بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ دوسرے یکدار پر بھی اب موٹر (انجن) فٹ کئے جا رہے ہیں۔ یہاں زیادہ تر یاماہا موٹریں کشتیوں پر لگائی جاتی ہیں۔

رنچن

یہ لمبائی میں یکدار جتنی ہوتی ہے۔ فرق صرف لکڑی کا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی لمبائی والی لکڑی کے تختوں سے بنتی ہے جنہیں لوہے کی میخوں سے جوڑا جاتا ہے۔

Gill-knetter

میڈیم سائز کی کشتی ہوتی ہے جس کے پیندے کی لکڑی کی لمبائی نو سے چودہ میٹر تک ہوتی ہے۔

لانچ

اس کے پیندے کی لکڑی چودہ سے بیس میٹر لمبی ہوتی ہے۔ Gill-Knetter اور لانچ

میں بڑی انجنیں لگائی جاتی ہیں۔

بُچ

پلاسٹک پیکنگ والے ڈبوں کو جوڑ کر کشتی نما چیز بنا لیتے ہیں۔ جس پر سوار ہو کر ماہی گیر اپنی کشتی سے خشکی تک آ جا سکتے ہیں جو کہ ساحل سے پندرہ بیس گز اندر سمندر میں لنگر انداز ہوتی ہے۔

ترشت، یا، کائیک

یہ تیز رفتار موٹرائزڈ کشتی ہوتی ہے جو کہ فائبر گلاس سے بنتی ہے۔ یہ ماہی گیری میں کام نہیں آتی۔ سپورٹس کار کی طرح شوقیہ اور مستی میں امیر لوگ یا ادارے استعمال کرتے ہیں۔ سمندری سپورٹس کار۔

3۔ کشتی سازی

یہاں کے دستکار اپنے کام میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں مقامی لوگوں کے علاوہ ایران سے بھی کشتی بنانے کے آرڈر ملتے ہیں۔ یہ لوگ ہر طرح کی چھوٹی بڑی کشتی اور لانچ بنا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ 35 میٹر تک کی لمبائی والی دیوہیکل کشتی تک بھی۔ چونکہ یہاں بجلی نہیں تھی، اس لیے سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جس میں محنت اور وقت دونوں بہت زیادہ لگتے تھے۔

پندرہ میٹر لمبائی کی لانچ تقریباً آٹھ ماہ میں بنتی ہے۔ بڑا استاد روزانہ چار سو روپے لیتا ہے۔ باقی دستکار ڈھائی تین سو روپے لیتے ہیں۔ لانچ پر کل لاگت تقریباً 25 سے 35 لاکھ روپے آتی ہے۔ صرف لکڑی پر دس لاکھ روپے لگتے ہیں۔ پانچ سلنڈر کا انجن آٹھ لاکھ کا پڑتا ہے۔ ایسی بڑی کشتی بنانے کے لیے باوقار اور قیمتی لکڑی ساگوان ہوتی ہے، جسے بلوچی میں (ساگ) کہتے ہیں۔ اسی طرح Biau نامی لکڑی بھی درآمد ہوتی ہے۔ یہ قیمتی لکڑی کالی کٹ، برما اور انڈونیشیا سے منگوائی جاتی ہے۔

ساگوان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بہت پائیدار ہوتی ہے اور ایک بار تیار ہو جائے تو بہت عرصہ تک نہ یہ ٹیڑھی ہوتی ہے، نہ اس میں دراڑیں پڑتی ہیں اور نہ یہ گل سڑ جاتا ہے۔ بہت نرم لکڑی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس لیے اسے تراشنے میں بہت مشقت نہیں کرنی پڑتی۔ بہت لچکدار اور طاقتور لکڑی ہوتی ہے۔ (آرا مشین لگنے کے بعد اب کشتی سازی میں یہاں کی لکڑی بھی استعمال ہوتی ہے)۔

ایسی بڑی کشتی بنانے کے لیے ایک بڑے استاد (دستکار) کی ضرورت پڑتی ہے۔ آٹھ سے دس دوسرے دستکار اور پانچ سے سات شاگردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پورا لشکر چاہیے ہوتا ہے ایک کشتی بنانے کے لیے۔ اور یہاں اس اوپن ائیر فیکٹری میں تو بہ یک وقت دس پندرہ لانچوں پر کام ہو رہا ہوتا ہے۔ میلہ لگا رہتا ہے۔ صرف پسنی میں 70 سے 80 ''استاد'' کشتی سازی میں مصروف ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پسنی میں ہر سال 50 فٹ لمبائی کی بارہ لانچیں اور 20-30 فٹ لمبائی کی 80 لانچیں بنتی ہیں۔

لکڑی کے کام کے بعد اس کی بیرونی سطح پر Cod Liver آئل (کاڈ مچھلی کا تیل) لگائی جاتی ہے تاکہ یہ واٹر پروف بن جائے۔ پہلے یہ لوگ شارک مچھلی کے جگر سے نکالے گئے تیل کو کشتی پر لگاتے تھے۔

ان کی اندرونی آرائش بلوچ ذوق کی مکمل نمائندہ ہوتی ہے۔ یہاں مغربی بلوچستان کے آخری سرے پر اگر کشتیوں کی رنگین گلکاری اور آرائش قابلِ دید ہوتی ہے تو بلوچستان کا مشرقی سرا یعنی ڈیرہ غازی خان ٹرکوں کی آرائش کا مشہور اڈہ ہے۔........ بلوچ، ایک آرٹسٹ قوم ہے۔

ایک تعمیر شدہ کشتی کی اوسط عمر بیس برس ہوتی ہے۔

4۔ ماہی گیری کا جال

اس فیکٹری کے ساتھ ہی جال بُننے والے ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں زیادہ تر سترہ میٹر لمبے اور تین میٹر چوڑے جال استعمال ہوتے ہیں۔ جن کا وزن 40 کلوگرام ہوتا ہے۔ لیکن جالوں کی لمبائی 600 میٹر تک بھی ہوسکتی ہے۔ Floats (لکڑی یا دوسرے ہلکے مواد کا ٹکڑا جو جال کو تیرتے رہنے میں مدد دیتے ہیں) ہر دو میٹر پر لگائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر جال اور Floats کوریا، جاپان اور تائیوان سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ کچھ کراچی میں بھی بنتے ہیں۔ جال کی قیمت

سائز پر نہیں بلکہ وزن کے حساب سے مقرر ہوتی ہے۔ یہ 200 روپے سے لے کر 650 روپے فی کلوگرام تک ہوتی ہے۔ Floats تیس سے 45 روپے فی دانہ ہوتا ہے اور نائیلون رسی 125 روپے فی کلوگرام ہوتا ہے (جال، نائیلون کی رسیاں، Floats اور Winch سب کو فشنگ گیئر کہتے ہیں)۔

نائیلون کے جال چھوٹی کشتیوں میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ بڑی لانچوں میں دھاگے کے جال استعمال ہوتے ہیں جو کہ زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتے ہیں۔ جال میں سوراخ کا سائز، مچھلی کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ مقامی طور پر سائز ہاتھ کی انگلیوں سے ناپا جاتا ہے اور یہ دو سے پانچ انگلیوں تک ہوتا ہے۔ دھاگے والے جال (بلوچی میں ماہور) جھینگا کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جھینگا کو بلوچی میں ''مدگ'' اور انگریزی میں Prawn کہتے ہیں جو کہ بلوچستان کے ساحل میں بہت اچھا ملتا ہے۔ یہاں دو دو گراٹ (بالشت) لمبا مدگ (جھینگا) ہوتا ہے۔ ایک ماہوار بیس سے لے کر ''چالیس کندو'' کا ہوتا ہے اور ایک کندو 160 ''گام'' کا ہوتا ہے۔

اب ایک نیا جال آیا ہے، پلاسٹک کا۔ اس میں سوراخ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بہت ظالم جال ہوتا ہے، جس سے ماہی کی پوری نسل تباہ ہوتی ہے۔

جوں جوں جال پرانا ہوتا جاتا ہے اتنا زیادہ مرمت مانگتا ہے۔ مرمت والا مزدور 150 روپے روزانہ معاوضہ پر ملتا ہے۔ مرمت میں اوسطاً چھ دن لگتے ہیں۔ عورتیں گھروں میں مرمت کا کام کرتی ہیں۔ (اور بہت زیادہ کرتی ہیں جس کا حساب بہر حال لگانا چاہیے)۔

لانچ ماہی گیری کی بڑی کشتی ہوتی ہے جو بہت مہنگی بنتی ہے۔ اور اس کا مالک بڑا سرمایہ دار ہوتا ہے۔ یہاں ایسے سرمایہ دار بھی ہیں جن کی پندرہ پندرہ، بیس بیس لانچیں ہیں۔

مچھلی کے شکار کی اجتماعی شکل ''سنگار'' کہلاتی ہے۔

لانچ پہ کام کرنے والے افراد کی تقسیم اس طرح ہے:

1-ناھدا (کپتان):

یہ تجربہ کار شخص ماہی گیری کے سارے آپریشن کا انچارج ہوتا ہے۔ یہ بڑا دریا نورد شخص،

ماہی گیری کے مشن کی منصوبہ بندی کرتا ہے، اسکی نگرانی کرتا ہے اور کشتی، اوزار اور عملے کا حتمی ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ موسم کے بارے میں اندازہ کر سکتا ہے اور طوفان وغیرہ جیسی مشکل صورت حال میں راہنمائی کرتا ہے۔ اسے طوفان کی بہت پہچان ہوتی ہے۔ بہت حوصلہ مند یہ ناھدا طوفان میں لانچ کا سکّان (سٹیرنگ) خود سنبھالتا ہے۔ ناھدا ماہی گیری کے فن میں طاق اور پختہ ہوتا ہے۔

2-سارنگ (سرہنگ)

اسسٹنٹ کپتان ہوتا ہے۔ آگے آگے ہوتا ہے اور جال پھنکوا دیتا ہے۔ بہ وقت ضرورت وہ ناھدا کا کام بھی سنبھالتا ہے۔

3-ڈرائیور

لانچ چلاتا ہے۔

4-باڈاری

یہ محنت کشوں کے اس کنبے کا مسلسل 20-25 دن تک باورچی ہوتا ہے۔

5-خلاصی

اسے ''جاں شو'' بھی کہتے ہیں اور ''ملاح'' کا لفظ بھی اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لانچ میں کم از کم آٹھ نو خلاصی ہوتے ہیں۔ سمندر میں ماہی گیری کی ساری مشقت یہی لوگ کرتے ہیں۔ یہ جال پھینکتے ہیں، نکالتے ہیں، شکار کردہ مچھلی کو جال سے نکالتے ہیں۔ اس مچھلی کو نمک لگاتے ہیں، برف توڑتے ہیں اور مچھلی کو لانچ کے نچلے خانوں میں سٹور کرتے ہیں۔ ''جاں شو'' بہت مشقت کرتے ہیں۔ جال ہر وقت مرمت مانگتا ہے اس لیے کہ منہ زور مچھلیاں اپنی آزادی کی جدوجہد میں اسے پھاڑتی رہتی ہیں۔ پلاسٹک کے سرخ، سفید خوبصورت فٹ بال آپ کو اس کے جال پہ جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ یہ بال سطح آب پر تیرتے رہتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وسیع سمندر میں جال ہے کہاں۔ خلاصی بلوچ ساحلوں کی آبادی کا 50 فیصد حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ لوگ شام چار بجے جال پھینکتے ہیں اور رات کے تین بجے نکالتے ہیں۔ پھر اپنا شکار جال سے نکال کر نمک و برف لگا کر سٹور والے تہہ خانوں میں رکھتے ہیں۔ وہ جنگ وجدل کا شکار ہو جانے والے اس

جال کی مرمت کرتے ہیں اور شام چار بجے پھر جال سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ روز کا یہی معمول رہتا ہے۔ ع:

ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

ماہی گیر کے لیے بلوچی زبان میں عمومی لفظ ''مید'' (Sea man) استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مچھلی پکڑنے والا۔ اسی لفظ سے گوادر میں ایک محلّہ آباد ہے جسے ''میدانی پاڑہ'' کہتے ہیں یعنی ماہی گیروں کی بستی۔ یہاں کے مقامی باشندوں کے دیگر محلوں کے نام ہیں: کمان وارڈ، کولگری وارڈ، ملا بند وارڈ، شادو بند وارڈ، کوبن وارڈ، بلوچ وارڈ، ملا کریم بخش وارڈ، شیخ عمر وارڈ، اور گزروان وارڈ وغیرہ۔

ہمارے ان بلوچ محنت کشوں کے پاس ماہی گیری کی کوئی جدید سہولت نہیں ہے۔ ہمارے یہ گونڈل عملاً بے تیغ ہیں۔ یہ لوگ سمندر کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ محض ستاروں کی مدد سے اپنا پیداواری عمل بجالاتے ہیں حتیٰ کہ یہ افریقہ کے ساحلوں تک آتے جاتے ہیں......یہی ہیں ہمارے ماہر فلکیات، ہمارے علمائے نجوم......انہیں اپنے سمندروں سے اس قدر واقفیت ہے کہ محض تجربے کی بنا پر ان کو معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کا کونسا علاقہ گہرا ہے، زیرِ زمین کہاں چٹانیں چھپی ہوئی ہیں جہاں ان کی کشتی ٹکرا کر ٹوٹ سکتی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیچڑ اور دلدل والا علاقہ کون سا ہے۔ اور وہ زیرآب مچھلیوں کی قسم اور متوقع شکار کی تعداد کا ٹھیک اندازہ کر کے جال ڈال دیتے ہیں۔ (کتنا اچھا ہو، اگر انہی ماہی گیروں میں سے ایک پاکستان کا وزیر ماہی گیری ہو، ایک وزیر تجارت، ایک بحریہ کا سربراہ، اور ایک بلوچستان کا وزیر اعلیٰ)۔ آپ کی بھی خواہش یہی ہے تو ہاتھ کھڑا کیجئے۔

جو (ماہی گیر) دوپہر کے بعد سے عصر کے وقت تک سمندر جاتے ہیں اس وقت کا نام ''شب ریچ'' ہے۔ کانٹے ڈور کی مدد سے مچھلی پکڑنے کے کام کا نام ''چیران'' ہے۔ دستی جالوں کی مدد سے چھوٹی مچھلیوں کے شکار کا نام ''گند'' ہے۔ اسی طرح ''چیر آپ''، ''بندیگ''، ''جل''، ''برام''، ''کیگنٹا''۔ شکار کے مختلف طریقوں کے نام ہیں۔ مدگ پکڑنے کا موسم سرما ہے، تاہم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گرمیوں میں بھی اس کا شکار ہوتا ہے۔

لانچ ایک ٹرپ میں تین سے چار ہزار مچھلیاں پکڑتی ہے۔ واپسی پہ جب یہ مچھلی جیٹی پر بولی کے ذریعے بکتی ہے تو حاصل شدہ رقم میں سے سفر کے سارے اخراجات نکالے جاتے ہیں۔ ان اخراجات میں ٹیکس، کمیشن، رشوت، جرمانہ، خوراک، مرمت اور ایندھن وغیرہ شامل ہیں۔ بقیہ رقم آدھی آدھی بانٹ دی جاتی ہے۔ آدھی تو سید مالک لے جاتا ہے، بنا کسی محنت کے، بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ محض اس لیے کہ اس کے پاس حلال حرام کا پیسہ تھا جس سے اس نے آلاتِ پیداوار (لانچ، جال انجن، ونچ) خرید رکھے تھے۔ بقیہ آدھے حصے میں چار حصے ناھدا کے، ڈیڑھ حصہ سارنگ (سرہنگ) کا، ایک ایک حصہ ہر خلاصی کا اور ایک حصہ ڈرائیور کا ہو جاتا ہے۔

اختیارات کے حساب سے مالک سب کا مختار ہے۔ وہ ساری اسمبلی، پوری کابینہ یا کسی بھی فرد کو برطرف کر سکتا ہے۔ ناھدا کو مالک ہی نکال سکتا ہے۔ سارنگ کو نکال دینے کا اختیار ناہدا کو بھی حاصل ہے۔ اور خلاصی کو سب نکال سکتے ہیں بغیر وجہ بتائے، بغیر چارج شیٹ کے، بغیر جواب طلبی اور انکوائری کے۔ جنگل میں تو چلتا ہی جنگل کا قانون ہے، شہر میں بھی جنگل کا قانون اور اب سمندر میں بھی جنگل کا قانون............حضرتِ انسان، تجھے خدا عقل دے، حضرتِ بلوچ تجھے خدا سمجھائے۔

گو کہ عورتیں گوادر میں تو کھلے سمندر میں نہیں جاتیں مگر بحیرۂ بلوچ کی دیگر بندرگاہوں میں بلوچ عورتیں کھلے سمندر میں باقاعدہ ماہی گیری کرتی ہیں۔ (بلوچ میں صنفِ نازک کا بھونڈا تصور اب تک موجود نہیں ہے)۔

لانچ بیس پچیس دن بعد واپس آتی ہے۔ دو چار دن مرمت، ایندھن، خوراک پانی لینے میں لگ جاتے ہیں اور یہی دو چار دن ماہی گیروں کی سوشل لائف کے ہوتے ہیں۔ ابھی بال بچوں سے ملنے بھی نہیں پاتے کہ پھر سمندر، پھر ماہی گیری، پھر مزدوری، مشقت۔ زمینی دنیا میں انسانوں کی بستی میں محض چار دن؟ کسی کی فاتحہ، کسی کی شادی، تیمارداری............کیا کچھ ہو سکتا ہے چار دنوں میں، نہ آپ تصور کر سکتے ہیں اور نہ میں بیان کر سکنے کا اہل ہوں۔

ہمارے ماہی گیروں کا بدترین استحصال سرمایہ دار کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔ ہمارے یہ خلاصی جو ناھدا کے بھی مقروض ہوتے ہیں اور مالک کے بھی، کشتی پر غلاموں کی طرح وابستہ رہتے ہیں۔ ایک کا قرضہ ادا کرنے اور وہاں سے جان چھڑانے کے لیے دوسرے کی کشتی پر خود کو بیچنا پڑتا ہے۔ مقروض خلاصی کی آزادی وخود مختاری ایسی ہے جیسے مقروض پاکستان کی۔ ہر حکم آئی ایم ایف کا چلتا ہے اور ہم آزاد ہیں۔ 14 اگست کو ہم آزاد ہیں ترانہ بجانے کے لیے، ترانہ سن کر اٹنشن کھڑے ہونے کے لیے۔ بقیہ ساری آزادی آئی ایم ایف کی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پانچواں باب

بلوچوں کا ویلیو سسٹم

رسم ورواج

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غیر بلوچ محققوں، سیاحوں اور حملہ آوروں نے بلوچوں کی بے شمار خوبصورت صفات کو رشک کے الفاظ میں ڈبوڈبو کر بیان کیا ہے۔خود بلوچوں نے ایک زبردست ضخیم مواد اس سلسلے میں پیدا کیا ہے۔

بلوچ کم شورش پسند، کم دھوکے باز اور کم متعصب ہے۔اس کا قد وقامت نسبتاً پست، جسم کٹھیلا اور دبلا مگر زور آور ہے۔بلوچ کا چہرہ لمبا اور بیضوی، نقش تیکھے اور ناک باز جیسی ہے۔اس کے بال سیاہ اور روغن میں تر لہراتے ہوئے، داڑھی اور مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں۔

اس کی عورت سر پر چادر اوڑھتی ہے، اس کا چولا ٹخنوں تک ہوتا ہے۔بلوچ اپنی عادات وخصائل میں خانہ بدوش ہے، اس لیے وہ اپنی عورتوں کو خانہ نشین نہیں رکھتا۔وہ رکھ رکھاؤ میں زیادہ صاف گو اور کھلا، اور کمینے پن سے مبرا، ہماری عدالتوں کے ہاتھوں بے ایمان نہ ہو جانے کی وجہ سے سچا اور کھرا، قول کا پکا، معتدل مزاج اور با حوصلہ اور ہمت کو اعلیٰ ترین وصف قرار دینے والا ہے۔(1)

ولیبو سسٹم انگریزی کی اصطلاح ہے۔بلوچوں میں رسم کا بھی سختی سے خیال رکھا جاتا ہے

مگر اس میں شخصی اور علاقائی طور پر تبدیلیاں بھی کی جاسکتی ہیں۔نیز اس کی پابندی کرنے، نہ کرنے یا کم کرنے کی ہلکی سی آزادی ہوتی ہے۔آپ شادی میں دو سو دنبے کاٹیں گے یا محض ایک دنبہ، یہ آپ پر منحصر ہے۔مگر رواج وہ آئین اور قانون ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔سماج ایسا کرنے نہیں دیتا۔رواج کا اجر یا سزا سماجی ہوتا ہے۔جیلیں وغیرہ نہیں ہوتیں۔جرمانہ بھرنا ہوتا ہے یا پھر موت۔ہاں، مکمل یا جزوی معافی بھی مل سکتی ہے۔ولیبو سسٹم منظم صورت میں سرمایہ داری نظام سے قبل بن کر، متشکل ہو کر لاگو ہوتے ہیں۔اس لیے ہم انہیں یہیں بھیڑ پال اور زرعی معیشت کے حصے میں لا رہے ہیں۔

اس کے عمومی رواج میں انفرادی قبائلی ورائٹی موجود ہوتی ہے۔بلوچ آزاد و علیحدہ قبائل کا اجتماع ہے۔اس لیے یہ بات تو طے ہے کہ اس کا رواج الگ قبائل میں الگ ہے۔مگر چونکہ ہم ابھی ابھی قدیم اشتراکی نظام سے نکلے ہیں اور مجموعی طور پر ماقبل سرمایہ داری پیداواری رشتوں سے منسلک ہیں اس لیے معمولی فرق ہو تو ہو کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا۔

سرمایہ داری گو کہ انہی رسوم و رواج کا ارتقا کرتی ہے مگر وہ اس رفتار سے ایسا کرتی ہے اور اس میں عالمی اجزا اس قدر زیادہ شامل ہوتے ہیں کہ ان کے اطلاق کے لیے باقاعدہ ادارے وجود ہوتے ہیں۔ریاست کا وجود لازمی بن جاتا ہے۔وہاں رسوم و رواج بلدیاتی اداروں، صوبائی قومی اسمبلیوں اور سینٹ جیسے اداروں کے اندر وضع ہوتے ہیں۔انہیں تحریری صورت دی جاتی ہے۔پھر اُن کی تشریح کے لیے عدالتوں کا الگ ادارہ ہوتا ہے۔اور نفاذ کرنے کے الگ لاٹھی بردار ادارے۔

بلوچستان میں تو عملاً دو متوازی صورتیں موجود ہیں۔ایک وہ جو سرکار کے کنٹرول والے علاقوں میں ہے اور دوسرا ہمارے اپنے کوہستان و دیہات میں۔ان دونوں متوازی صورتوں میں کبھی کبھی نکتہ ہائے اتفاق آتے ہیں اور کبھی کبھی تو بالکل ہی متضاد دو مخالف۔سماجی ارتقا کی سائنس دلچسپ ترین مطالعے کی سائنس ہوتی ہے۔

یوں تو ہر سماجی عہد کا رواج بہت راسخ اور سخت جان ہوتا ہے مگر سرقبیلوی، ماقبل جاگیرداری نظام کے رواج تو بہت ہی حتمی ہوتے ہیں۔رواج اپنے سماجی عہد میں ایک بہترین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانی رفیق ہوتا ہے جس کے بغیر سماج کی زلفیں ژولیدہ ہو جاتی ہیں۔

مگر سماج تو جامد چیز نہیں ہوتا۔ یہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ جا کر رواج سماج کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ سماج کی وہ قوتیں جو پیداوار کرتی ہیں وہ جب میسر ٹیکنالوجی کی مدد سے ترقی کرتی جاتی ہیں، پچھلے عہد کے رسوم و رواج کو ایک زنجیر کی طرح محسوس کرنے لگتی ہیں جنہیں توڑے بغیر وہ مزید آگے نہیں جا سکتیں۔ اسی لیے رواجوں کے وہ صرف حصے زندہ رہ پاتے ہیں جو یا تو عمومی عالمگیر سچائیوں کی نمائندگی کرتے ہوں یا پھر مزید کچھ عرصہ تک تدریجی انداز میں تبدیل ہوتے رہنے کی خاصیت رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بلوچ رسومات ساکت و جامد و حتمی و مطلق و مستقل کبھی نہیں ہوتیں۔ زندہ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ نئی باتیں، نئے قانونی آئینی معاملات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور انسانی معاشرہ اُن کی بابت اصول وقوانین وضع کرتا رہتا ہے۔ پرانا بوڑھا اور بیمار ہو کر مرتا جاتا ہے اور نیا نئے خون کے ساتھ شامل ہوتا رہتا ہے۔

رسم کی بہ نسبت ہمارے رواج روز نہیں بدلتے۔ ایک متعین طریقہ ہے رواج میں ترمیم کرنے کا۔ سردار اور پورے قبیلے کے وڈیروں کا اجتماع (مُچی) ہونا ضروری ہے، حتمی ترمیم کے لیے۔ گو کہ اس ترمیم کی ضرورت بہت عرصے سے محسوس کی جا رہی ہوگی۔ اور اس کے بارے میں پیام و پیغام بہت پہلے سے ہو رہے ہوں گے۔ جرگہ حتمی منظوری دے گا تو رواج میں مذکورہ تبدیلی آئے گی۔ ہاں البتہ کوئی بہت ہی فوری بات ہو تو سردار (اب تو علاقائی سفید ریش بھی) عبوری ترمیم کرے گا.........مگر ایسی جو سماج کو قابلِ قبول ہو۔

رواج بنیادی طور پر کسی قوم کے سماجی معاشی عہد کا اظہار ہوتا ہے، اس کی پسند کا اظہار، اس کی ممنوعات کا پرتو، اور اس کے سانچوں کا اظہار۔ فرائض وحقوق سے متعلق معاملات سے نمٹنے کے طریقوں کا سیٹ۔ حقوق و فرائض کا یہ سیٹ تحریری نہ تھا، اب بھی یہ تحریری صورت میں موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موجودگی غیر موجودگی محسوس کرنے والی بات ہی نہ تھی۔ سب کو پتہ ہوتا کہ اس کے فرائض کیا ہیں، حقوق کیا ہیں۔ کوئی این جی اوز نہیں بتاتے تھے۔ یہ تو ماں باپ، چولہے اور محفل میں ہی بغیر احساس دلائے سکھا دیتے تھے۔ غیر محسوس طریقے سے آزادیوں کی موجودگی

جانچتے تھے اور یادداشت و یاددہانی کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ سچی بات یہ ہے، ہم اپنے حقوق وآزادیوں سے اس قدر آشنا ہیں کہ ان کے لیے الگ اصطلاح اور لفظ موجود تک نہیں ہیں۔

اور پھر حقوق و فرائض اتنے پیچیدہ بھی نہ تھے۔ برابر کے انسان ہوا کرتے تھے، کوئی مالک اور آقا نہ تھا۔ انسان ابھی جنس و کماڈٹی نہ بن چکا تھا۔ اسے خریدا بیچا نہ جا سکتا تھا۔ حقوق اتنے حتمی، اتنے فطری اور اس قدر محفوظ تھے کہ کسی چارٹر، لکھا پڑھی، سٹامپ پیپر کی بالکل کوئی ضرورت نہ تھی۔

بلوچ رسوم میں اہم بات یہ ہے کہ ان میں اجتماعیت واشتراکیت بہت ہے۔ یہ انسانی باہمی مدد و امداد، پورے قبیلے قوم کا فائدہ، خوشحالی آبادی اور سلامتی پر مبنی ہیں۔..........وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی حال میں قدیم اشتراکیت سے پیدا شدہ ہیں۔ صنعت، منڈی، ٹھگی ابھی نہیں آئی۔

1۔ پیدائش سے جوانی تک

ششغان

انسانی زندگی میں بچے پہ نام رکھنے کی رسم ایک بڑا جشن اور خوش قسمت دن ہوتا ہے۔ یہ رسم دنیا کے ہر کونے اور ہر علاقے میں موجود ہے۔ کہیں اسے زیادہ جوش اور مستی سے منایا جاتا ہے، کہیں پہ سادگی اور خاموشی سے۔ مختصر یہ کہ بغیر نام کے دنیا میں کوئی نہیں رہتا۔ ہمارے علاقے میں نام رکھنے کا باقاعدہ جشن ہوتا ہے۔ بچے کا نام عموماً پیدائش کے چھٹے دن رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے لفظ ''شش غان'' اس دن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلاوا دینے والے جاتے ہیں، چاروں طرف لوٹ (دعوت) دے آتے ہیں۔ جشن کے دن سے پہلے والی شام کو مویشی ذبح کیے جاتے ہیں اور اس سے پہلے والے دن پانی لکڑی لانے کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ مویشی کا گوشت کاٹنے، ٹکڑے بنانے کے بعد متعدد نوجوان گوشت کی حفاظت کرتے ہیں درندوں، کتوں سے۔ وہاں پہرہ دیا جاتا ہے اور صبح چار بجے گوشت چڑھایا جاتا ہے تاکہ سات آٹھ بجے تک کھانا تیار ہو جائے اور ٹولی ٹولیوں میں آنے والے مردوں کو کھانا مل سکے۔ جو شخص بھی باہر سے آتا ہے تو کوئی بزرگ شخص اس سے بلوچی کا رسم ''حال احوال'' کرتا ہے۔ کھانے کے بعد جب اٹھنے لگتا ہے تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پوچھتا ہے ’’بیٹے کا کیا نام رکھا ہے؟‘‘۔

جواب ملتا ہے ’’فلاں‘‘۔

’’مبارک ہو‘‘۔

’’بخت والا ہو جائے شالا‘‘۔

جھنڈ

ششغان کے بعد پھر ’’جھنڈ‘‘ کی تقریب ہوتی ہے "**جھنڈ ایر کنغ**"۔

بیٹے کے سر پر بالوں کی پہلی فصل جب تیار ہوتی ہے تو بال اتار کر اپنے پیر کے مقبرے پر لے جا کر ٹانگ دیے جاتے ہیں۔ یہاں جشن منایا جاتا ہے۔ (ششغان کے مقابلے میں ذرا کم)۔

بچپن اور تعلیم

علم تو حیات القلوب ہے۔ یہ انسان کو زندگی اور زندگی کے لاڈ اور ناز کے مزے لینے اور اس کے مقاصد و مشکلات سے نمٹنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ علم ہر پوشیدہ راز کو بے نقاب کرتا ہے۔ ڈھونڈ کر چھپائی ہوئی، خفیہ رکھی ہوئی چیزوں کو بوکیاں، بالٹیاں بھر بھر کر باہر لاتا ہے۔ علم و نا انصافی، علم و استحصال اور علم و پسماندگی کے درمیان ایک دائمی، نہ ختم ہونے والی جنگ برپا ہے۔ اور اس جنگ میں انسان دوستوں کی خواہش ہوتی ہے کہ علم کی روشنی ہر جگہ پھیلے۔

بے علم ڈرپوک ہوتا ہے اور ڈرپوک ہمیشہ جھک جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ علم سے بہرہ مند ہو جائے تو پھر وہ بولتا ہے۔ اور جب بولتا ہے تو پھر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔

علم وہ روشنی ہے کہ اگر ترقی پذیر زندگی اور کائنات کے ساتھ ہم قدم رہے تو جاننے اور پرکھنے کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے، نامعلوم کے دائرے کو کم کرتی چلی جاتی ہے۔ بہت سی ایسی ’’حیرتوں‘‘ کو جو علاقۂ نامعلوم کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں، کترتی ہوئی چلتی ہے۔ اس عمل میں تیقن کی اس درجہ فراوانی ہے کہ وہ حضرات جو علم کی روشنی کے بجائے حیرتوں کے اندھیروں میں پاؤں پسارنے پر قانع رہتے ہیں۔ روشنی سے اس قدر دور ہو جاتے ہیں کہ وہ اگر اپنی زندگی کے کسی موڑ پر روشنی کی طرف مڑنا بھی چاہیں تو ایسا کرنے پر قادر نہیں رہتے۔

بلوچستان میں بیرونی مستبد حاکم تو ویسے ہی علم کی روشنی بجھانے میں ہمہ وقت مصروف رہے ہیں، خود ہمارا اپنا حکمران طبقہ بھی اپنے مفادات کے تحت یہ نہیں چاہتا کہ عقلوں پر سے جہالت کے پردے ہٹیں اور علم و دانش کی کرنیں پھوٹیں، نشوونما کی راہ کھلے اور خرافات و توہمات کے سیاہ بادل چھٹ جائیں جو کہ بزدلی و کم ہمتی کا نامبارک مینہ برساتے ہیں۔

ہمارے نصاب میں غیر ضروری مضامین بہت زیادہ ہیں۔ اردو کی بالادستی میں اُسی زبان کے شاعر اور ادیب پڑھائے جاتے ہیں جو سب کے سب فیوڈل فرسودہ دور کے نمائندے ہیں۔ اسی لیے عملی زندگی کے تقاضوں اور فطرت کی ضرورتوں کے مطابق نصاب ترتیب دینا بہت ضروری ہے۔

ہماری قوم سائنس اور ٹیکنالوجی میں پسماندہ ہے اور اس طرف توجہ دینا ہوگی۔ حضرت علی نے فرمایا کہ ’’اپنے بچوں کو اپنی طرح تعلیم نہ دو کیونکہ وہ تمہارے دور اور تمہارے زمانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں‘‘۔

زبان کا مسئلہ بھی پڑھانے اور تعلیم کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس وقت انگلش کے علاوہ دنیا میں کسی زبان کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انگریزی تو ہوگی ہی، اردو بن گئی مقتدرہ، لہٰذا وہ بھی ضروری ہوگئی۔ پھر عربی کو ضیاالحق نے کورس میں آن ٹھونسا۔ ہماری مادری زبانیں کبھی گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آتی ہیں اور پھر بھگوڑے، مات کھائے سگ کی طرح دُم دبائے بھاگ جاتی ہیں اور گم ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے دیگر علاقوں کے دانشوروں کی طرح بلوچستان کے دانشمند لوگ بھی بہت دیر سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ بنیادی تعلیم صرف اور صرف مادری زبان میں دی جائے۔ یونیسکو کے قوانین میں بھی لکھا ہوا ہے کہ پڑھانے کے حق کا مطلب یہ ہے کہ بچہ خود اپنی زبان، تہذیب و ثقافت، قومی تاریخ، سرزمین اور قومی رواج اور قدروں سے واقف ہو جائے۔ اور اس کے بعد دوسری قوموں کے بارے میں جانے۔ مگر ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ ہم انگلش، اردو، عربی کے گرد و غبار میں اپنی میٹھی دلکش بلوچی زبان گم کر چکے ہیں۔ بلوچی نے انتقام لیا اور جواباً ہمیں گم کر دیا۔ جب تک ہم اپنی زبان کو جھاڑ پھونک کر صاف ستھرا نہیں کریں گے۔ جب تک اپنے تعلیمی اداروں اور کورس میں اسے توقیر و عزت سے نہ بٹھائیں گے، اس وقت تک ہماری ترقی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

افضل و اشرف زندگی قائم نہیں ہوسکتی ۔ جب تک ہم لوگ بنیادی تعلیم کو مادری زبانوں میں دلانا منظور نہیں کروائیں گے، بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت نہیں بنادیں گے۔ جب تک اس کی کتاب، کاپی، فیس، جیب خرچ، یونیفارم سب کی ذمہ داری سرکار پر نہ ہوگی اس وقت تک نجات ممکن نہیں۔

تعلیم اب کسی طرح کی سستی کاہلی، آگے پیچھے ہونے، حیل وحجت سے کام لینے اور اگر مگر کرنے کے تھپیڑے برداشت نہیں کرسکتی۔ اب ہماری قوم کے لیے علم و مرگ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ضروری ٹھہرا ہے۔

سانگ (منگنی)

خاندان کو انگریزی میں فیملی کہتے ہیں۔ جو کہ لفظ Familia سے نکلا ہے۔ رومنوں میں شروع میں یہ لفظ شادی شدہ جوڑے اور ان کے بچوں کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ صرف غلاموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ Famulus کا مطلب تھا گھریلو غلام اور Familia کا لفظ مجموعی طور پر ایک شخص کے سبھی غلاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

یہ بات یقینی ہے کہ ہماری تاریخ میں کئی بیویاں رکھنا بہت بعد میں رواج پا گیا۔ مکران کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً پورے بلوچستان میں کہیں کم کہیں زیادہ '' لب'' موجود ہے۔ سندھیوں میں اس پیسے کا نام ''پھلن مٹھ'' ہے جبکہ پشتونوں میں اسے ''ولور'' کہتے ہیں۔

منگنی کی شرائط پر مذاکرات کرنے والے وفد کو ''سانگہ مرکہ'' کہتے ہیں جو کہ ''ربالو'' کے دونوں طرفین کے ساتھ بات چیت کرنے اور شٹل ڈپلومیسی کے بعد وجود میں آتا ہے۔ پہلے ربالو پیغام لاتا، لے جاتا ہے۔

ہر کوئی اپنے جتنے آدمی کے گھر میں رشتہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معتبر عموماً اپنے برابر والے لوگوں سے رشتہ داری کرتے ہیں۔ باقی عام لوگ زیادہ تر اپنے چچا زادوں، ٹکر (Sub-tribe) یا قبیلے کے اندر رشتہ کرتے ہیں کچھ خصوصی حالتوں میں ایک قبیلہ کے افراد دوسرے قبیلے کے لوگوں میں منگنیاں کرتے ہیں۔

خاندان کے اندر رشتہ داری اصل میں معاشی انضمام کا بندوبست ہوتا ہے۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ یہ رشتہ داری لافی بانہہ اور لب سے زیادہ پروگریسو اور زیادہ انسان دوستی والی رشتہ داری ہوتی ہے۔ گو کہ یہ ایک ارتقائی مرحلہ ہے مگر خود پسماندگی کی سیڑھی کے نچلے زینوں میں سے ہے۔ جب تک کہ کم عمری کی منگنی ختم نہیں ہوجائے گی، اس وقت تک منگنی کی ہر شکل نامکمل ہے۔

منگنی کی رسم جیسا کہ ہم پہلے بتاچکے ہیں میڑھ یا مرکہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی رشتہ مانگنے والے سفید ریشوں کا وفد لے کر لڑکی والے گھر میں رشتہ مانگنے جاتے ہیں۔ جب منگنی طے ہو جاتی ہے تو ایک بندوق کی گولی داغی جاتی ہے اور گولی چلانے والا بلند آواز میں پکار کر کہتا ہے کہ ''خیر کی فائر ہے، فلاں کے بیٹے کی منگنی کا فائر ہے''۔ منگنی کا فائر ہونے کے بعد مٹھائی بانٹی جاتی ہے، مبارکی خیر مبارکی کا تبادلہ ہوتا ہے۔ لڑکی کو عزیز رشتہ دار عورتیں منکے پرو کر ہاتھوں میں پہناتی ہیں، جنہیں ''دستین'' کہا جاتا ہے۔ لڑکی پہلے تو انہیں پہننے میں سخت مزاحمت کرتی ہے اور تقریباً تین دستین توڑ ڈالتی ہے۔ مگر بعد میں ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ہر عورت حسبِ حیثیت اور حسبِ رشتہ خوبصورت دستین لاتی ہے اور لڑکی کے ہاتھ میں پہنا دیتی ہے۔ منگنی کا دنبہ کاٹنا ضروری آئٹم ہوتا ہے۔

منگنی بلوچوں میں ٹوٹتی ہرگز نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی سلطان راہی ''اے برات نئیں جائے گی اوئے'' کہہ سکتا ہے۔

سِیر (شادی)

ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ گیارہ ہزار برس قبل کے مہر گڑھ کا بلوچ کس طرح شادی کرتا تھا۔

قبائلی، فیوڈل اور سرمایہ داری نظام میں شادی اور خاندان انسانی معاشرے کا مرکز اور کلچر و تہذیب کا منبع ہوتے ہیں۔ بلوچوں میں معلوم تاریخ کے وقتوں سے یہ ادارہ مضبوط ہے۔ ہمارے سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس ادارے میں بھی چھوٹی موٹی تبدیلیاں آتی رہیں۔ کہیں لب رہا، کہیں مٹنڑ، لافی بانہہ اور کہیں نیخ۔ مگر اس ادارے کی اہمیت ہر عہد میں برقرار رہی۔ افرادی قوت کی اشد ضرورت کے پیشِ نظر کم سنی کی شادیاں ہی رہیں۔

شادی کا موسم اور مہینہ باہم مشورے سے پہلے سے مقرر ہوتے ہیں۔ تاریخ ''چاند کی فلاں تاریخ'' ہی گنی جاتی ہے۔ بلوچستان کے کچھ علاقوں میں تاریخ کے مقرر ہونے کے ساتھ ہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دولہا ''بادشاہ'' کہلانے لگتا ہے۔اور اس کا سب سے عزیز اور قریبی دوست ''وزیر'' مقرر ہوتا ہے۔

شادی کے جشن کے انتظام،اور اس کے اخراجات مرد کی طرف سے ہوتے ہیں۔شادی میں شرکت کی دعوت (لوٹ) بھی مرد کی جانب سے دی جاتی ہے۔ذبح کیا جانے والا مویشی (زیادہ تر بیل، یا ملا جلا یا پھر،امیر لوگ ہوں تو صرف دنبے بکرے ذبح کیے جاتے ہیں)، جلانے والی لکڑی اور پانی کا انتظام بھی دولہا کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

سارے کام اجتماعی طور پر انجام پاتے ہیں۔لوگ دولہا کو اخراجات میں باہمی امداد کے بطور نقد، جنس یا بھیڑ بکریوں کی صورت میں عطیہ دیتے ہیں جسے ''بجار'' کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک دوسرے کی امداد کرنے کا خوبصورت اور مہذب ترین سسٹم ہوتا ہے۔ایک طرح کا قرض ہے جو وہ ایک دوسرے کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔

تاریخ سے ایک ہفتہ یا زیادہ دنوں قبل دلہن کو گھر میں بٹھایا جاتا ہے۔اسے ''ڈھری'' کہتے ہیں۔اس کی سہیلیاں دن رات ساتھ ہوتی ہیں۔لڑکیاں شادی کی رات تک ہلو ہالو، اور لیلا ڑونامی شادی کے گیت گاتی ہیں، گھمر ، دھریس اور دوسرے قبائلی رقص و کھیلیں کھیلتی ہیں۔

مرد دولہا کی شادی سے چار دن پہلے مکمل طور پر سرگرم ہوجاتے ہیں۔لکڑی پانی کا انتظام کرتے ہیں۔ذبح کیے جانیوالے مال مویشی کا بندوبست کرتے ہیں۔ پیغام رسانوں کے ذریعے آس پاس دعوتی پیغام بھیجتے ہیں۔دو تین دن قبل مہمانوں کی آمد شروع ہوجاتی ہے۔ان کی خاطر تواضع شروع ہوجاتی ہے۔محفل اور مجلس منعقد ہوتی ہے۔ڈومب اپنے سریندا (سارنگی) سمیت آن موجود ہوتے ہیں، فرمائشی گانے گیت بجتے ہیں، مزاح و مذاق اور حال احوال کے تبادلے ہوتے ہیں۔ایک سماجی، سیاسی حتیٰ کہ معاشی میلہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔بندوقوں، کارتوسوں کی تجارت تو یقینی بات ہے۔نوجوان رقص کی پھیریاں پھرتے ہیں۔

ڈومب کو نوجوان لوگ رقص کے بیچ بیچ ایک ایک، پانچ پانچ یا دس روپے دیتے جاتے ہیں۔اس بخشش کو ''گھور'' کہتے ہیں۔ڈومب زیادہ تر سریندا بجاتے ہیں۔دمبیرو (طنبورہ) بھی چل جاتا ہے۔اگر یہ سازندے میسر نہ ہوں تو مجبوری ہے''ٹیپ ریکارڈ کے سیل نئے کرنے پڑتے ہیں

اور جب اس کا والیوم فل ہو تو ''پانی نہ ہو تو تیمّم روا'' ہو جاتا ہے۔اسی پہ رقص رواں رہتا ہے۔

یہاں سے ذرا دور عورتوں کی ''ہالو'' کی نغمگی، ڈیہی کی مدھر و سندر زیر و بم سنائی دیتی ہے اور انسان کو دل مجبور کرتا ہے کہنے کو...... ''ہر روش ہے روش'' (ہر روز یہی روز)۔

شادی کے دن جھنجھ جاتی ہے دلہن کے گھر۔دلہن کی سنگی سہیلیاں اور عزیز واقارب جھنجھ پر مرچوں، آٹا یا پھر گوبر سے حملہ کرتی ہیں۔عورتیں اس کام کے لیے چھتوں پر باقاعدہ مورچہ زن ہوتی ہیں۔ان کے ہتھیاروں میں گوندھا ہوا گوبر، آٹے کی تھالیاں یا مرچوں بھرے کٹورے ہوتے ہیں۔اور وہ یہ ہتھیار بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔دشمن (دولہا والے) زیادہ تر کوشش کرتے ہیں کہ گاندھی کی عدم تشدد والی پالیسی رائج ہو اور اس کے اصل مقصد (یعنی واپس دولہا کے گھر تک خیر و امن سے پہنچا جائے) کا حصول ہو۔

جب ایک بار آپ دلہن کے گھر پہنچ گئی تو پھر ساری جنگی فضا کے دیوتا یکدم بھسم ہو جاتے ہیں اور امن کی دیوی کی حاکمیت قائم ہو جاتی ہے۔دولہا والوں کی طرف سے آئی ہوئی عورتیں دلہن کو زیور گہنے پہناتی ہیں۔غریب اپنی غربت بھرے گہنے دیتا ہے اور امیر امارت بھرے زیور۔زیور تو گویا شادی کی علامت ہوتے ہیں۔

دلہن شادی کے زیور اور کپڑے پہننے پہ سخت ترین مزاحمت کرتی ہے۔وہ آسانی سے بال دھلوانے اور باٹن (اُبٹن) لگوانے بھی نہیں دیتی............اس کی دوشیزگی کی زندگی کے اختتام کی نشانیاں ہیں یہ۔یہ اس کے ''لڑکی پن'' والی سرحد کے خاتمے اور عورت پن والی سلطنت کی شروعات کی علامتیں ہیں۔اس کے دل میں بیک وقت نئی زندگی کی خوشخبری بھی ہے مگر والدین کا گھر چھوڑ دینا، اپنی سنگی سہیلیوں سے بچھڑ جانا، اپنے رشتہ داروں، عزیزوں سے جدائی، اور آبائی گھرانے اور علاقے کا پیچھے رہ جانا، اور اپنی ماں اور بہنوں سے جہنم نما جدائی کے رنج، اس کا دل ڈبو دیتے ہیں۔اس کے آنسو اور آہیں دل کی گہرائی سے نکلتی ہیں۔خود بھی زار زار روتی ہے اور اپنے ہمدردوں کو بھی دریا دریا رلاتی ہے۔رونا اس کا کتھارسز ہے۔اس کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔مگر اس کے رونے پر اُسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔بوڑھی عورتیں ''خوشی اور جشن'' کے موقع پر رونے کو بری علامت قرار دیتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔اورفتویٰ صادر کرتی ہیں کہ ہنسنے کے دن آنسو گرانا نہیں چاہئیں۔

واضح ہو کہ بلوچوں میں شادی سے پہلے لڑکیاں مسواک (اخروٹ کی چھال جو دانتوں اور ہونٹوں کو سرخ رنگت بخشتی ہے) نہیں کرتیں۔ وہ آئینہ نہیں دیکھتیں، آنکھوں میں سرمہ نہیں ڈالتیں۔ یہ ساری باتیں بن بیاہی لڑکیوں کے لیے معیوب سمجھی جاتی ہیں۔سنگھار نہ کرنا اس کی دوشیزدگی کی ناموس اور امتیاز تصور ہوتا ہے۔ وہ عورت بننے سے بہت کتراتی ہے۔لہٰذا بچیاں جب آپس میں جھگڑ پڑتی ہیں اور جب کسی ساتھی لڑکی سے کوئی کام کرانا ہوتو اسے کہہ دیتی ہیں ''لڑکی یہ کام کرے گی،عورت نہیں کرے گی''۔تو وہ بے چاری اپنے لڑکی پن کی ساکھ پالنے کی خاطر وہ کام کرتی ہے۔

شادی کا کھانا علی الصبح شروع ہوتا ہے(مویشی رات کو ذبح کیا جاتا ہےاور پکایا جاتا ہے تاکہ چرواہوں،مسافروں اورصبح سویرے کام پر جانے والوں کوکھانا دیا جاسکے)۔یہ جشن شام پانچ بجے تک چلتا ہے۔اس دوران نشانہ بازی، گھڑ دوڑ،ہست دوڑ اور دوسرے مقابلے ہوتے ہیں۔ جہاں اول، دوم اور سوم آنے والوں کو دولہا کے عزیز اقارب انعامات دیتے ہیں۔مہری دوڑ کے مقابلے مشرقی بلوچستان میں کم ہوتے جارہے ہیں۔ وگرنہ چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں اور رنگ برنگے پھول وجھالر اور مہار، مہری کی کمان نما گردن میں دیکھنے کے لائق نظارے ہوتے ہیں۔گھڑ دوڑ تو سمجھئے جنگی حملہ ہوتی ہے۔گھوڑی کی ننگی پیٹھ پہ سوار، ہاتھ میں ڈنڈا اوراس ڈنڈے کی شائیں شائیں اورتڑاخ تڑاخ کی آوازیں، ہاؤ ہو۔........... لگے جیسے قدیم قبائلی حملہ آور لشکر خدا کا قہر بن کر نکلا ہو۔آدمیوں کی دوڑ بھی ایک بہت پر جوش منظر ہوتا ہے۔اس دوڑ میں حصہ لینے والے جیت کے لیے خودبھی اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، اوران کے غم خوار دوست وعزیز تماش بین بھی سید، پیر اور پیغمبروں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔وہ منتیں مانگتے ہیں اپنے ساتھی کے جیتنے کے لیے بھی اور مخالف کھلاڑی کے پاؤں سوکھ جانے کی بھی۔ بہت بار قبیلہ کا بزرگ بھی اپنی قمیص اُتارتا ہے، پگڑی سر سے اُتارتا ہے، اپنی ننگی پشت پہ چھوڑ دیتا ہے اپنے سر کے لمبے سیاہ وسفید بالوں کو، اُٹھاتا ہے پائنچے اپنی شلوار کے،اوراپنی جوانی کی محبوبہ کو یاد کرتے ہوئے دوڑ کے مقابلے

میں اُترتا ہے۔زندہ رہیں تمہارے میلے اوردیوان!۔

شادی میں مدعو حضرات اپنا اپنا ''بجاری'' اُٹھائے بہت اکڑتے ہوئے اور ہرطرح کی فارملٹیز پوری کرتے ہوئے ٹولی ٹولی میں اکٹھ کی طرف اڈاڈ کر چلے آتے ہیں۔اور یک آواز ہوکر کہتے ہیں؛''سلام علیک''۔مصافحہ اور خیر سگالی کے جملوں کے تبادلے کے بعد''حال حوال'' ہوتا ہے۔

نکاح عموماً جشن کے دوسرے روز صبح ہوتا ہے۔اس وقت دلہن کے لیے خصوصی طور پر تیار کیے ہوئے مرصع و مسجع خیمے کے پاس دولہا کے بھائی، چچازاد، اور ماموں زاد آکر بیٹھ جاتے ہیں۔دلہن کی ماں، اس کی سہلیاں اور خواتین عزیز خیمے کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ملّا نکاح پڑھاتا ہے۔

دلہن کی ماں دولہا کے کسی قریبی عزیز یا اُس کے دوست کو دلہن کے ''وکیلی بھائی'' کی حیثیت سے منتخب کرسکتی ہے۔ بعد کی ساری زندگانی یہ شخص اور دلہن آپس میں ''منہ بولے'' بہن بھائی ہوتے ہیں۔

بلوچ کی اکثریت میں الحمد اللہ رب العالمین کہ جہیز موجود نہیں ہے۔ نہ ظاہر نہ خفیہ۔ نہ اس کی نمائش ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دلہن اپنے باپ کے آباد گھر سے اپنے ساتھ دو تین چٹائیاں، ایک چکی، ایک تھالی، ایک کٹورا، ایک آدھ مشکیزہ، ایک چولہا، ایک چائے جوش، بیل گائے باندھنے کے لیے ایک رسی، ایک بستر، ایک آدھ جوڑا کپڑا صندوق میں ڈالے ہوئے لے جاتی ہے۔توخ (گلے کا زیور) اورٹل (ہاتھ کا زیور) مل جائیں تو بہت اچھا وگرنہ ضروری نہیں ہوتا۔ یہ روزمرہ ضرورت کی چیزیں ہیں۔جنہیں مکہ ماں اور عاریف باپ اسے دیتے ہیں۔اس سامان کو ''لوغ'' (گھر) کہتے ہیں۔

کُل

بلوچی کلاسیکل وفوک شاعری میں محبوبہ کے گھر کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔گھاس پھوس سے بنا ہوا کمرہ۔ یہ تکریم وتعظیم والا لفظ ہے۔اس لفظ کے ساتھ اُس گھر، خیمے کی طرف عمیق محبت اور احترام بندھا ہوتا ہے۔ غیرت،توجہ،عزم۔اس لفظ کے ساتھ مزید محبت وابستگی دکھائی ہوتو اس میں لفظ''گورغیں'' ملا دیتے ہیں؛ گورغیں کُل یعنی حسین گھر۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

2۔طرزِ معاشرت

خوردونوش

بلوچ سادہ غذا کھاتا ہے۔کھانے پینے کا کوئی لمبا چوڑا انصرام وانتظام نہیں ہوتا۔روٹی کو نغن (نَ غَ ن) کہتے ہیں۔مخصوص پتھر (Sand Stone) کی سِل کو توا کی طرح تراش کراسے توا کی شکل دیتے ہیں۔اسے تافغ کہتے ہیں۔درگڑی، بسری، پوآ گندم سے پکی روٹی کی اقسام ہیں تافغ پر،اور جوار باجرہ سے ڈوڈی اور پوآ بنتا ہے۔

ایمر جنسی میں ایک اور روٹی پکائی جاتی ہے اس کو ''کاک'' بولا جاتا ہے۔یہ آج کل بلوچی ڈشز کی ایک مخصوصیت میں شامل ہے۔یہاں توا،تافغ اور تنور کے بجائے جلتی آگ کے کنارے ایک گرم کردہ گول پتھر کے گرد آٹا لپیٹ کر رکھا جاتا ہے۔باہر سے آگ اور اندر سے گرم پتھر اسے پکا دیتے ہیں۔

ایک خانہ بدوش زندگی میں سالن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔موسم کے مطابق جنگلی سبزی مثلاً میہل اور کیٹغ وغیرہ کو آگ میں بھون کر نمک لگا کر بطور سبزی استعمال کیا جاتا ہے۔ابھی ماضی قریب تک سرخ مرچ یا گرم مصالحہ ہم لوگوں کے استعمال میں نہیں تھا۔

پانی عام طور پر بارش کا استعمال ہوتا ہے۔بعض اوقات چھوٹے سے کم گہرے تالاب میں انسان اور جنگلی جانور اکٹھے پانی پیتے ہیں۔کہیں کہیں میٹھے اور کڑوے پانی کے چشمے بہتے ہیں۔کبھی کبھار یہ خشک ہوجاتے ہیں اور لوگ نقل مکانی کر جاتے ہیں۔

لباس

کہنے کو تو ہم پہ سفید کپڑے پہننے اور لمبے بال رکھنے کے اثرات قدیم پارس سے ہیں۔مگر ہم چونکہ مہر گڑھ کے اہل وعیال ہیں جہاں کپاس (جو کہ سفید ہوتی ہے) کاشت ہوتی تھی۔لہٰذا سفید پوشی دراصل وہیں سے آئی ہے۔بلکہ اس سے بھی قبل جب مہر گڑھ کی کپاس کاشت نہ ہوتی تھی،تب پشم (جو سفید ہوتا ہے) ہی ہمارا لباس ہوا ہوگا۔بعد میں تو خیر سفید پوشی واقعی ایک امتیازی

صفت بنی۔معتبر،سردار تو ضرور سفید کپڑے پہنتا رہا۔زرتشتی مولوی اور قبیلوں کے سردار سفید لباس پہنا کرتے تھے۔

بلوچ کا لباس شلوار اور کڑتی (کرتہ) ہے۔کڑتی گھیرے دار عظیم الجثہ قمیص ہوتی ہے۔لیکن اب کڑتی کا رواج کم ہوتا جارہا ہے اور دوسری عام قمیص اس کی جگہ لیتی جارہی ہے۔ہماری پگڑی بیس گز کی ہوتی ہے۔اسے بہت خوبصوتی سے سر پر باندھا جاتا ہے۔اور یہ بہت بارعب اور وضعدار دکھائی دیتی ہے۔

بلوچوں میں سر کے بال بہت لمبے رکھے جاتے تھے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی شوقین لوگ جب بیٹھ کر بالوں کا دوسرا سرا پاؤں کے انگوٹھے سے باندھ دیتے ہیں اور سیدھے کھڑے ہوجاتے ہیں،تو ان کے بال اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ جسم تن کر سیدھا ہونے کے باوجود بالوں پر کھچاؤ تک محسوس نہیں ہوتا۔ان گھنے اور خوبصورت بالوں کے لیے پگڑی ہوتی ہے جو عزت وعصمت کی علامت ہوتی ہے۔کسی کی پگڑی گرانا بہت بڑا جرم تصور ہوتا ہے۔اپنی پگڑی کسی کے پاؤں پر رکھنے سے بڑے سے بڑا جرم بھی معاف کیا جاتا ہے۔بڑی سے بڑی اور خوفناک ترین لڑائی میں اگر پگڑی لمبی کر کے درمیان میں بچھائی جائے تو یہ گویا جنگ بندی کی لائن ہوئی اور کوئی باشرف اور غیرت مند شخص اس پگڑی کو نہیں پھلانگے گا۔بے شک وہ لڑائی بعد میں جاری رکھے مگر اُس سے سیز فائر۔

بلوچ کی بل دی ہوئی مونچھوں کے ساتھ اس کی خوبصورت لپیٹی ہوئی داڑھی دراصل، انسانی آبادی میں اسے یکتا بناتی ہے۔داڑھی سخن،قول اور عہد کی نشانی ہوتی ہے۔ہاتھ داڑھی پر رکھ کر جو قول دیا جائے وہ پھر ہر حال میں پورا کرنا ہوتا ہے۔............ چاکر، جاڑو، مرید، بیورغ، ہیوتان اور نوذبندغ کی قسم بلوچوں کی تباہی کا باعث بنیں۔

تمباکو نوشی، تمباکو خوری

بلوچ چاکر کے دور تک بھنگ پیا کرتے تھے جس کی روایت مست توکلی تک آ گئی۔کلاسیک شاعری میں جگہ جگہ اس کا ذکر ملتا ہے۔مست کے بعد البتہ بھنگ ہمارا واحد مشروب نہ رہا۔کچھ اور چیزیں بھی میدان میں آ گئیں۔شراب بھی پہلے سے چلی آرہی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمباکو البتہ ایک نیا مرض تھا بلوچ معاشرے میں۔ تمباکو کو دراصل پہلے پہلے سپین کے لوگوں نے 1492 میں کیوبا کے لوگوں سے سیکھا اور پھر وہ اسے یورپ لے گئے۔ مشرق میں تمباکو کی عادت پرتگالی لے آئے۔ وہ اسے جنوبی ہند میں لائے۔ بعد میں اکبر کے زمانے میں تمباکو شمالی خطوں میں آیا۔(2)

تمباکو حقے میں بھی ڈال کر پیا جاتا ہے اور چلم میں بھی، جسے ''پوڑ'' کہا جاتا ہے۔ پوڑ کو لکڑی، گپ (گارا)، اور پیش سے خوبصورتی سے بنایا جاتا ہے۔ آژگیژ (چقمک) آگ جلانے کا لوکل انتظام ہے جو ابھی بھی استعمال ہوتا ہے۔ پیش کے پودے کی جڑوں پہ زرد اور سرخ رنگ کے ریشے ہوتے ہیں جنہیں پُرز کہا جاتا ہے۔ اسے شورے میں بھگو دیتے ہیں اور خشک کرتے ہیں۔ مری علاقے میں بوآخ نامی پانی کی جھیل میں بھی یہ خاصیت ہے۔ پڑز اُس پانی میں بھگو دیتے ہیں، خشک کرتے ہیں اور پھر ایک خصوصی چمکدار پتھر پر یہ پڑز رکھ کر اس سے ایک لوہا (چقمک) زور سے اس طرح مارتے ہیں کہ رگڑ پیدا ہو۔ اور اس سے بننے والی چنگاری سے پڑز سلگ جاتا ہے۔

مہمان نوازی

دنیا کے ہر قبائلی معاشرے کی طرح بلوچوں میں بھی مہمان نوازی ایک بہت ہی اہم سماجی فریضہ تصور ہوتا ہے۔ اور ہر سماج اپنی ساخت کے مطابقت میں مہمان نوازی کرتا ہے۔ بلوچ ایک نیم خانہ بدوش معاشرہ ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں دودھ بیچنا گرا ہوا فعل تصور ہو، اور جہاں گندم کی روٹی پیسوں پر بیچنے کا تصور نہ ہو تو وہاں ہوٹل اور ریسٹورنٹ کا قیام کہاں ممکن ہوگا۔ اس لیے مسافروں کے کھانے اور رہائش کے لیے ہر بلوچ کا گھر اور خیمہ گویا ایک ہوٹل کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر مسافر کا حق ہے کہ راہ گزرتے ہوئے جو خیمہ سامنے آئے وہ ایک وقت کا کھانا وہاں کھا سکتا ہے۔ ....معزز انداز میں خورد ونوش اور بستر پیش کرنے والا مفت ہوٹل۔ مسافر کا یہ استحقاق ہوتا ہے کہ کھانے کے وقت راستے میں کسی پہاڑ کے کسی بھی جلتے چولہے کا حصہ دار بن جائے۔ اسے محض ''مسافر ہوں'' کہنا پڑتا ہے۔ میزبان اس کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے اور جو روکھی سوکھی ممکن ہو اسے لا دیتا ہے۔

مہمان نوازی غیرت کا باقاعدہ حصہ تصور ہوتی ہے۔ روکھی روٹی سے لے کر سجی تک جو ممکن ہوا، حاضر کی جاتی ہے۔ خاص مہمان خواہ ایک بھی ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی تکریم میں دنبہ کاٹ دیا جائے۔ عام لوگوں میں سات مہمانوں کے لیے میزبان دنبہ ذبح کر کے گوشت سے تواضع کرتا ہے۔ مہمان ایک گھر سے صرف ایک وقت کا کھانا کھا سکتا ہے۔ دوسرے ٹائم کا کھانا لازماً اسے کسی اگلے پڑاؤ کے آس پاس کسی دوسرے خیمے میں کھانا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگلے ٹائم کے لیے میزبان اسے روٹی پکا کر دے تاکہ وہ اپنی چادر کے پلّو میں باندھ کر لے جائے اور سفر کے دوران جہاں کہیں بھوک لگ جائے کھالے۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے کھانے کے وقت تک وہ کسی خیمے تک پہنچ پائے گا یا نہیں۔

بلوچ کے لیے مہمان نوازی مقدس اور مہمان کی حفاظت کرنا لازمی ہے۔

مچی (جرگہ)

قبائلیوں کے گروپ کی ایسی میٹنگ جس میں کسی جھگڑے کا قابلِ قبول حل نکالنے کی کوشش ہو۔ جرگہ اور مرکہ میں ایک دو بڑے فرق موجود ہیں۔ جرگہ ایک بڑا اجتماع ہوتا ہے جس میں ''ٹکر'' کے بڑے یکجا ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص برابر کی عزت و سٹیٹس رکھتا ہے اور ہر شخص رائے رکھتا ہے۔

ہر بڑے تاریخی موقع پر جرگہ منعقد ہوتا ہے جس میں مسئلے کے پیش ہوتے ہیں۔ یہاں راضی نامے بھی ہوتے ہیں، معاہدے بھی اور جرمانے بھی۔ جرگہ کا فیصلہ ماننا ضروری ہوتا ہے۔ جرگہ آریا لوگ کرتے تھے۔ بعد میں انگریز نے اسے ترقی دی اور باقاعدہ ادارے کی شکل دی۔

مرکہ (میڑھ)

ناراض کے منانے اور تصفیہ کرنے کی رسم کو مرکہ کہتے ہیں۔ مرکہ افراد اور گروہوں کے درمیان جنگوں اور جھگڑوں کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ دکھ پہنچنے والی پارٹی سے رابطہ کیا جاتا ہے اور اس سے رواج کے مطابق مرکہ کے لیے راضی ہونے کی درخواست کی جاتی ہے۔ اسے ''دگّہ دیغ''، یعنی راستہ دینا کہتے ہیں۔ جب تک مرکہ کو ''دگ'' نہ ملے، لوگ مرکہ کرنے نہیں جاتے۔

اجازت ملنے کی صورت میں مرکہ کے وفد میں علاقے کے بڑے، وڈیرے اور سفید

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریشوں کے ہمراہ سید یا ملّا بھی موجود ہوتے ہیں۔عورت،قرآن اور سردار حسبِ ضرورت ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔وفد ناراض خاندان کے گھر جاتا ہے اور معافی مانگی جاتی ہے۔قتل کا مرکہ بہت جنجال مانگتا ہے اور بہت مصیبتوں اور شرائط کے بعد معافی مل جاتی ہے۔جو کہ ایک خون ریز علاقے میں رواداری اور بڑے پن کی علامت ہے۔

3۔مذہبی معاملات

بلوچ ایک مدہم مبہم خدا پر عقیدہ رکھتے تھے۔عبادت منظّم نہیں ہوا کرتی تھی۔اُس زمانے میں عقیدہ رکھنا اور اسے جاری رکھنا آسان ہوا کرتے تھے۔نیک اور برے کاموں کو رواج کے کوڈ میں سمجھا جاتا تھا۔خدا اور انسان کے بیچ کوئی تیسرا شخص (ملا) موجود نہ تھا۔گو کہ نصیر خان اول ایک بنیاد پرست حکمران آیا مگر اس کے بعد بلوچ دوبارہ اپنے آسان، مہربان اور دوستانہ خدا کو مانتے رہے۔ضیا الحق کے آنے تک یہاں لوگ مذہبی نہیں بلکہ قبائلی معاشرت میں رہتے رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کے باوجود ان کو اسلام کے کئی بنیادی ارکان سے واقفیت کی ضرورت کبھی نہیں پڑی۔ البتہ مہذب ترین، نرم رو اور شفیق معاشرہ قائم تھا۔مذہب بالکل غیر دوستانہ نہ رہا۔میر گل خان نصیر کے بقول،''بلوچ قوم .... مذہبی معاملات میں توہمات اور مذہبی جنون سے مبرّا ہے'' (کوچ و بلوچ:110)۔بلوچ مذہبی رسم ورواج اور فرائض سے بے پرواہ لوگ ہیں۔

بلوچ اپنے مذہب میں سادہ ہے۔اس کے ہاں مذہبی جنون بالکل نہیں ہے۔ویسے بھی دنیا بھر میں ساحلوں اور پہاڑوں کے لوگ لبرل ہوتے ہیں۔بلوچستان کا بھی یہی حال ہے۔

دلکش وحیران کن مائتھالوجی البتہ موجود ہے۔ہماری مائتھالوجی دنیا کے دیگر علاقوں کی مائتھالوجی سے زبردست انداز میں ملتی جلتی ہے۔ مثلاً کہکشاں کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ اُس دنبے کے گرد و غبار ہیں جو دوڑتے ہوئے حضرت آدم کے پاس گیا تا کہ حضرت اسماعیل کے بجائے اُسے ذبح کیا جائے۔گریک مائتھالوجی میں کہکشاں اُس دودھ کی چھینٹیں ہیں جو دیوی، ہیرا کے پستان سے چھلکنے سے وجود میں آئیں (جب وہ ہنی مون منا رہی تھی)۔ ہماری یہ قدیم مائتھا

لوجی خواہ جس قدر بھی اپنا گاڑھا پن ختم کر چکی ہو مگر ہمارے رویوں میں کہیں نہ کہیں یہ موجود بہر حال رہتی ہے۔

بلوچستان میں لوگوں کی بڑی اکثریت سُنّی ہے، شیعہ اور ذگری بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ بلوچوں میں ہندو عیسائی اور سکھ مذہب کے پیروکار بھی ہیں جن میں بلوچستان اسمبلی میں ایک ایک ممبر ہوتا ہے۔یہ عموماً بگٹی، ڈومبکی یا قلات کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بلوچ من حیث القوم ایک بار مسلمان ہوا تو پھر اس نے مذہب بدلا کبھی نہیں۔وہ عقیدہ برآمد کرنے والا مسلمان بھی کبھی نہیں رہا۔

چونکہ قبائلی علاقوں میں مسجدیں زیادہ نہیں ہیں اس لیے ملا بھی بہت کم ہیں۔روزہ نماز ان جگہوں پر ہیں جہاں لوگ خیموں کے بجائے مکانوں میں رہتے ہیں۔سید بھی سب باہر کے ہوتے ہیں۔ملاّ نکاح اور جنازہ کے لیے ہوتا ہے مگر پیر پرستش کی حد تک مانے جاتے ہیں۔اولیا کا ذکر ہماری شاعری، ہمارے محاوروں اور روزمرہ گفتگو میں بہت ہوتا ہے۔حضرت علیؓ معہ پورا خانوادہ ہم سب کا مرشد ہے، بالخصوص بلوچ شعرا کا۔اس کے بعد ولی تقریباً ہمارے اپنے مقامی لوگ گزرے ہیں۔سید باہر کے ہوتے ہیں مگر پیر و ولی ہمارے اپنے۔شیہہ مرید ہیں۔بگٹیوں میں پیر سوھری، بزداروں میں پیر گھنڑوں، کھیتر انڑ کے علاقہ میں شاہ محمود، اِدھر مستیں توکلی، سمو مائی، ڈھادر کے دو پاسی، تونسہ میں خواجگان، ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں سخی سرور، نوشکی میں بلانوش، جنوب مشرق میں شاہ نورانی کراچی کا عبداللہ شاہ غازی، خضدار میں رابعہ خضداری اور پیر عمر بہت مریدوں والے پیر ہیں۔جیکب آباد میں پہلوان فقیر، گنداواہ کے علاقے میں......، سبی میں شے کٹے۔

اس کے علاوہ قبیلے کا سردار بھی بزرگی و کرامت سے خالی نہیں سمجھا جاتا۔بحالتِ جنابت ناپاکی سردار کا نام لینا گناہِ عظیم تصور ہوتا تھا۔جنابت کی حالت میں گندم بو آئی، گندم لاب، گندم کی روٹی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

مائتھالوجی کی تعمیر بہت مزیدار کی گئی ہے۔ذرا پیر سوھری کو دیکھیں۔وہ ایک پیروزانی نوثانی تھا۔ایک چرواہا۔جب ''چہار یار'' آ گئے۔اور اُس سے ایک بکری مانگ لی تو پیر سوھری نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب دیا کہ سارے ریوڑ میں اس کی اپنی صرف ایک بکری ہے۔ اور اُس نے خوشی خوشی وہ بکری انہیں دے دی۔ جس کو انہوں نے بیچ کر کے کھالیا۔ عوض میں انہوں نے پیر سوہری سے کہا کہ جس وقت مالک اُسے چرواہا گیری سے نکال دے تو وہ اپنا حصہ تقسیم کر کے جدا کر لے۔ اس کا ایسا ریوڑ بنے گا جو پہلے اس علاقے میں نہیں ہوا۔ انہوں نے اسے ایک ڈنڈا بھی دے دیا کہ جب ضرورت محسوس کرے زمین پہ مار دے، وہیں سے پانی نکلے گا۔ اس طرح اسے اپنے ریوڑ کو پانی پلانے کے لیے میلوں کی مسافت طے نہیں کرنی پڑے گی۔

پیر سوہری ایک صبح جب جاگا تو دیکھا کہ ریوڑ ایسی بکریوں سے بھرا ہوا تھا جن کی رنگت نسواری تھی۔ ایسی بکریاں پورے علاقے میں نہ تھیں۔ بلیدی قبیلہ والے آئے اور آ کر پیر سوہری کا سرتن سے جدا کر دیا اور اس کی بکریاں لے گئے۔ مگر پیر سوھری اپنا سر اپنے ہاتھوں میں لیے دشمنوں کے پیچھے گیا اور اپنی بکریاں چھڑا لایا۔

بلوچوں کے پیروں کے مزار دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے بال کاٹ کر یا اپنی کشیدہ کاری اور کڑھائی کی چیزیں لا کر مزار پر لٹکا دیتی ہیں۔ یہ منت مانگنے سے پہلے کی رشوت بھی ہوتی ہے اور منت پوری ہونے کے بعد کا شکرانہ بھی۔ اسی طرح نرینہ اولاد کے سر کے بال جب پہلی بار اتار دیے جاتے ہیں تو وہ بھی پیر کے مزار پر لٹکا دیے جاتے ہیں۔ کوہِ سلیمان سے لے کر سبی تک آپ کو جو بھی بڑا، سرسبز اور پرانا درخت نظر آئے تو وہاں خواتین کے گُندھے ہوئے بال لٹکتے نظر آئیں گے۔ سایہ دار درخت تو مست کی اوطاق ہوا کرتا تھا۔

بچے کے بالوں کے ساتھ ساتھ پیر کے مزار پر ٹافیوں کی تھیلیاں، بلیڈ، خوبصورت چھوٹے موٹے پتھر، رنگین رومال، الغرض بے شمار چیزیں رکھی اور لٹکائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی قبر پر حسبِ توفیق قیمتی یا عام سے کپڑے کی چادریں بچھادی جاتی ہیں۔ یہ کام بالخصوص مست توکلی کی شان والی محبوبہ سمو کے مزار پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

وھاوگند

''وہاوگند'' یا خواب دیکھنے والوں کو پیر کا درجہ حاصل ہے۔ زیادہ تر بوڑھی عورتیں اور نیم

مجنون لوگ ہی خواب دیکھنے کے ماہر تصور ہوتے ہیں۔ بارش کے بارے میں خواب دیکھنے والوں کی طرف خصوصاً دیکھا جاتا ہے، اسی طرح دشمن داری، مال مویشی اور نرینہ اولاد کی پیدائش میں بھی دلچسپی لی جاتی ہے۔ سائنسی سوچ کی عدم موجودگی اور سائنسی ماحول کی عدم دستیابی کے باعث لوگ خواب پر اچھا خاصا عقیدہ رکھتے ہیں۔

براخواب دیکھنے پر صبح سویرے اس کی مداوائی تدبیر کے بطور خیرات کی جاتی ہے۔ کچھ اور نہ ملا یا مالی سکت نہ تھی تو اپنے ہی کنبے میں ''بروخ'' تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک چپاتی کے چھ آٹھ ٹکڑے بنا کر گھر کے افراد میں خیرات کے بطور تقسیم کی جاتی ہے۔

چنشغ

''چنشغ'' یا چھینکنا ایک اور واہمہ ہے جسے عموماً برا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ سفر پہ روانگی کے وقت کسی کے چھینکنے کے باعث اپنا ضروری تک سفر ملتوی کرتے ہیں۔ سوداگری اور اسی طرح کے دیگر اہم معاملات پہ فیصلوں کو موخر یا منسوخ کیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر نقصان ہونے کا عقیدہ عام ہے۔

پذگوانك

''پذگوانگ'' یا چلتے ہوئے شخص کو پیچھے سے بلانا یا پکارنا براشگون تصور کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ضروری سفر کو ملتوی یا منسوخ کیا جاتا ہے۔

چبو

گھر میں جوتی اتاردیں تو اگر چپلی ایک دوسرے پر چڑھ جائے تو خیال کیا جاتا ہے کہ سفر پر جانا پڑے گا۔ اسی طرح چپلوں کی پوزیشن بھی بہت سارے ممکنہ واقعات و حادثات کی علامت ہوتی ہے۔

چمه پڑّ ینغ

آنکھ کے پپوٹے اگر غیر ارادی طور پر پھڑکنے لگیں تو اس میں کئی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اگر آنکھ کی اوپر والا پپوٹا حرکت کرتا رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر سے بارش کے قطرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس پر گریں گے اور اسے بھگو دیں گے، یعنی بارش ہوگی۔

اگر خدانخواستہ نچلی پلک پھڑکنی شروع ہوجائے تو یہ آنسوؤں کی علامت ہوتی ہے جو بہرحال کسی حادثے اور ہلاکت کا پیش خیمہ تصور ہوتا ہے۔

پونز ہ مُشغ

ناک کی کھجلی عموماً گوشت کھانے کی پیش بینی کرتی ہے۔ یہ گوشت خوری خوشی کی بھی ہوسکتی ہے اور غم کی بھی۔ اسی طرح اگر کتے والی مکھی (ڈھنگ) آدمی پر آ کر بیٹھ جائے تب بھی گوشت کھانا قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔

ونگہ کیغ

پیٹھ کی خارش البتہ ڈنڈے کھانے کی نوید ہوتی ہے اور یہ کسی لڑائی کی پیش گوئی تصور ہوتی ہے۔

پاذہ تلی ءَ کیغ

پاؤں کی ہتھیلی کی خارش یا تو گیلی مٹی پر پاؤں رکھنے یعنی بارش ہونے کی نشانی ہوتی ہے یا پھر کسی یار آشنا، یا کسی عزیز رشتہ دار اور یا کسی مہمان کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔

دستہ تلی ءَ کیغ

کوہستانی بھیڑ پال زندگانی میں کسی سے ہاتھ ملانے کی نعمت ونوبت شہر کی بہ نسبت بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ ہاتھ کی ہتھیلی میں خارش اس بات کا شگون ہوتی ہے کہ آج کوئی مسافر، کوئی عزیز رشتے دار، یا دوست سے مصافحہ کرنے کا خوش نصیب موقع ملے گا۔

سڈ کی

ہچکی ہمیشہ یہ بتاتی ہے کہ آپ کو کہیں کوئی اداس دل پکار رہا ہے، یا آپ کا کہیں ذکر ہو رہا ہے۔ ڈیہی پڑھیے:

مہ گرمئیں ناما

مارسڈکی زیراں سیالانی نیاماڈ

(میرا نام نہ لینا۔ مجھے ہم مرتبت دشمنوں کے بیچ ہچکی آئے گی)

بڑدست

مویشی کی بڑدست یا شانے والی ہڈی پڑھ کر بلوچ بہت ساری پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ اس سے بارش، ٹڈی دل، جنگ، خوشحالی، علاقے پر فوج کشی یا کسی بڑے انسان کی موت واقع ہونے کی پیش گوئیاں ہوسکتی ہیں۔ ''بڑدست بیں'' کے مطابق شانے کی ہڈی میں موجود نقشہ میں تقریباً 400 مربع میل کے دائرے میں پیش آنے والے واقعات کے اشارے موجود ہوتے ہیں۔ عام طور پر پیش گوئی کے لیے تازہ ہڈی استعمال ہوتی ہے۔

ھیرانی پٹغ

یہ ایک ایسا واہمہ ہوتی ہے جس میں عموماً رات گئے جب کوئی عورت بچے کو دودھ پلانے اٹھ جاتی ہے تو اسے آسمان سے فرشتوں کے ماتم کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ ہیر یا فرشتے تعداد میں تین ہوتے ہیں جو فریاد کرتے اڑتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ یہ کسی بڑے انسان کی موت کا ماتم ہوتا ہے۔ ایک فرشتہ سیٹیاں بجاتا رہتا ہے، دوسرا اس آدمی کا (عورت کا ہرگز نہیں) نام لیتا جاتا ہے اور تیسرا فرشتہ ''ہائے ہائے'' کی آوازیں نکالتا رہتا ہے۔

گھانچ

بلوچ، پرندوں کو شگون کے بطور اچھا یا برا مانتے ہیں۔ وہ مافوق الفطرت پر ایمان رکھتے ہیں اور چانس اور بری بلاؤں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

گھانچ نامی پرندہ اگر انسان کی دائیں طرف سے گاتا ہوا گزرے تو زبردست خوشی اور خوشخبری ملنے کی نوید ہوتی ہے، مگر بائیں طرف سے اس کا چیخنا بہت ہی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

ڈوڈوکرانکغ

''کرانک کرانک ڈوڈو وشیں حالے بیار''۔ یہ میوزیکل فقرہ ہم بچپن میں سنا کرتے تھے۔ ہمارے پورے خطے میں کوے کا کائیں کائیں کرنا خوشخبری جانا جاتی ہے۔ لیکن یہ کوا شہر والا بدتمیز کوا نہیں ہے جو ہمیشہ کا ابوالکلام ہے۔ ہمیں اچھی خبر سنانے والا کوا زیادہ کالے رنگ کا ہوتا ہے اور کم تعداد میں بھی۔ انسانی عقائد ہیں، دلچسپ و رنگین!!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بینگانی اوآرغ

عموماً تو کتا بھونکتا ہے مگر کبھی کبھی وہ گیدڑ کی طرح چیختا بھی ہے، بالخصوص رات کو، زمستانی رات کو۔ بہت منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ کتے کی ویسے بھی کوئی خاص عزت نہیں کی جاتی ماسوائے چرواہے کے کتے کی۔ کتا تو یورپ میں سر پر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

ذکر

ذکری ماما، ہم تمام بقیہ بلوچوں کی طرح بہت توہمات والے لوگ ہیں۔ ''ذکر'' سے ان کا نام نکلا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی عبادتوں میں اس کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عقیدے اور مکران میں بلیدیوں کی حکمرانی میں خاصا تعلق تھا۔ اس کے لیے کہ بلیدیوں کی حکمرانی میں یہ عقیدہ خوب پھیلا ہوا پھولا۔ گوادر شہر میں 50 فیصد لوگ ذکری ہیں۔ یہاں مچھیروں کی اکثریت ذکریوں کی ہے۔ بقیہ مغربی اور وسطی بلوچستان، اور کراچی میں بھی ان کی بڑی تعداد ہے۔ ان کا پیشوا ''ملئی'' کہلاتا ہے۔ ملئی، موروثی عہدہ ہے۔

ابھی تک ذکری اور نمازی باہم شادیاں کرتے ہیں۔ قبرستان، البتہ الگ الگ ہیں کہ ''نان بلوچ'' ملّا بالآخر یہ نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ پروپیگنڈہ کے برعکس یہاں مرد الگ عبادت کرتے ہیں اور عورتیں الگ۔ یار بلوچ معاشرہ میں یہ کہاں ممکن کہ مخلوط عبادت گاہیں ہوں۔ کتنے ناترس ہیں وہ لوگ جو یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ 27 رمضان کی رات کو مرد وزن بے لباس عبادت نما بداخلاقی کرتے ہیں۔ ناروا اور ناترس لوگ۔ ذکری پسماندہ، پہاڑی اور غیرت میں بنیاد پرست بلوچوں کا مذہب نہ ہوا اور گویا جدید یورپ کا ہو۔ جھوٹے پر خدا کی .... (چلو میں ''مار'' لکھتا ہوں)۔

مردوں کا ذکر خانہ مردانہ وجاہت اور بناؤ سنگھار کا نمونہ ہے جبکہ عورتوں کا ذکر خانہ بلوچ عورت کے سماجی مقام کی طرح بدحال تھا۔

بلوچی میں صبح کی عبادت کو ''بامسار'' کہتے ہیں جو ایک گھنٹہ کی ہوتی ہے۔ جبکہ ظہر اور عشا کو ذکر ہوتا ہے۔ جمعہ کو نماز نہیں ہوتی۔ میں نے جب کراچی میں اپنے ایک غیر مسلم دوست کو بتایا کہ

ذکری کا سجدہ پانچ منٹ لمبا ہوتا ہے تو اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''جس کے سجدے اس قدر طویل ہوں، میں اس فرقے میں شامل نہیں ہوسکتا''۔

ذکری اب ہمارے سنی ملا کے اکسانے اور اشتعال دلانے پر بالآخر ایک واحد مذہب بن جائے گا وگرنہ اب تک تو وہ مختلف علاقوں میں مختلف انداز میں عبادت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی مرکزی اور واحد شکل نہیں ہے۔ کوئی بلوچ کہاں پڑا ہوا ہے، کوئی کہیں رہائش پذیر ہے اور رسل و رسائل ہیں نہیں۔ لہٰذا ہر وادی نے اپنی الگ ذکری گیری قائم کر رکھی ہے۔ جونپوری صاحب کے بارے میں ان میں متضاد باتیں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ آیا تھا مکران، کچھ کہتے ہیں کہ وہ خود تو کبھی نہیں آیا مگر اس کا کوئی چیلا شاگرد آیا تھا۔ اسی طرح کچھ کہتے ہیں کہ وہ شیعت کے قریب ہیں۔ کچھ کو تو کوئی بات معلوم ہی نہیں۔ (ارے بابا اکثریت کو کچھ معلوم نہیں!)۔

بلوچ اپنے عقیدوں میں بہت لبرل ہے۔ مگر جب پشین، قندھار، اور جھنگ، ہزارہ کے سارے ملا اکٹھے ہو کر کلاشنکوف سے مسلح ہو کر ذکریوں کی عبادت گاہوں پر حملہ کرنے تربت پہنچیں، کرفیو کی نوبت آئے، کافر، غدار کے فتوے بٹیں، تو اگلا بھی بلوچ ہے، ضد میں آ کر کوئی بھی اعلان کر سکتا ہے۔ اور توبہ ہے بلوچ کی ضد سے !!۔ اسی ضد میں تو اس نے اپنا وطن بلوچستان بیگوں کے حوالے کر کے خود کو شاہ حسین کی پناہ میں جھونک دیا تھا۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا ذکری فرقہ میں کون سا ایسا پیغام، سیاسی یا معاشی کشش یا دنیاوی نجات کی بات تھی کہ سارے غلام، چرواہے، ماہی گیر، محنت کش اور نچلے طبقے کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پنجگور سے لے کر مند اور سیستان تک سارے لوگ ذکری ہیں۔ اس لیے کوئی تو سماجی انصاف کی بات ہوگی اس میں۔ اس ذکری عقیدے کا سماجی پیغام ڈھونڈنا محققوں کے لیے ایک اچھا خاصا بڑا چیلنج ہے۔

یہاں کے لوگ ایک اور روایت کی پیروی بھی کرتے ہیں جسے مولود کہتے ہیں۔ اس تقریب میں لوگ دائرے میں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ تک اذکار کرتے ہیں۔ یہ تقریب عموماً کسی خوشی کے موقع پر منعقد ہوتی ہے جس کے بعد میزبان حسبِ استطاعت دعوت کا انتظام کرتا ہے۔ پھر ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عجیب مظاہرہ ہوتا ہے۔ایک لوہے کی زنجیر ہوتی ہے جسے آگ میں سرخ کر کے لٹکا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ لوگ ہاتھوں پر تیل مل کر زنجیر پر اوپر سے نیچے لٹکنے کے انداز میں مضبوطی سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اس طرح کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے شعلے نکلتے ہیں مگر خود ان کا ہاتھ بالکل بھی نہیں جلتا۔ مولودرات کی تقریب ہوتی ہے۔

مگر ''شے پرجا'' دن رات کو کسی بھی وقت منعقد کی جاسکتی ہے۔اس میں زنجیری کرتب تو نہیں ہوتا لیکن لوگ وجد میں آ کر اپنے بدن میں سوئیاں چبھوتے ہیں، سینے اور پیٹ میں چھرا گھونپ لیتے ہیں۔لیکن نہ تو انہیں درد کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی زخم کا کوئی نشان باقی رہتا ہے۔

یہاں کے لوگ خواجہ خدر (خضر) کو مانتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ وہ سمندروں کی حفاظت کرتا ہے، مگر رہتا ساحلی علاقوں میں ہے۔ جنوبی مغربی چا بہار میں تو اس کے قدموں کے نشانات بھی ''دریافت'' ہوئے ہیں جو وہاں کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اِدھر سلیمانی علاقے میں بھی خواجہ خدر کا تصور موجود ہے، مگر اُس جگہ ایک اور اساطیر نے لے لی ہے:

شہ مرید مع اپنے اونٹ کے
بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے

4۔ممنوعات

بلوچ کچھ کام ایسے بھی کرتے ہیں جن کا سبب یا افادیت خود انہیں بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر وہ عقیدے کی مانند بڑی سختی سے ان پر عمل کرتے ہیں۔مثلاً مری قبیلے میں بجارانی گردہ نہیں کھاتے۔نہ وجہ کا پتہ نہ یہ معلوم کہ یہ رسم کب سے آئی، کس نے ایجاد کی؟ بس ایک قسم، ایک حلف کی طرح وہ اس پر قائم ہیں۔مری قبیلہ ہی میں گزینی لوگ جب پکی ہوئی بجی سیخ سے جدا کرتے ہیں تو گوشت کا جو ٹکڑا اس سیخ پہ چپک کر رہ جاتا ہے اسے بالکل نہیں کھاتے۔لاشاری بلوچ آلڑو کو ہاتھ نہیں لگاتا جو ایک مزے دار پودا ہے جسے عورتیں بہت شوق سے کھاتی ہیں۔ایک اس کے ذائقے

کے سبب، اور دوسرا اس لیے کہ چبا کر کھائیں تو میٹھی آواز نکلتی ہے۔

مری کو اوجھری اچھی نہیں لگتی۔رند اونٹ کا گوشت نہیں کھاتا۔کلات کے چشتی سید اندھیرا ہونے کے بعد بھیڑ کی سری نہیں کھاتے۔بھلک گردہ نہیں کھاتے۔لڑاؤ چھٹہ آنتیں نہیں کھاتا، عمرانی لمبی گردن والے پانی کے برتن یعنی صراحی کی شکل سے نفرت کرتا ہے۔ جمالی اوپلے جلانے کو برداشت نہیں کرتا۔بگٹی میں پیش بُر لوگ بڑ دست یعنی شانے پر موجود گوشت نہیں کھاتا۔ ہاجچہ بلیدی جانور کا گردہ نہیں کھاتے، واگہ جت فاختہ نہیں کھاتے، کلوار جَت کسی جانور کا دل اور کلیجہ نہیں کھاتے۔اسی طرح بہت سارے لوگ کبوتر اور خرگوش کا گوشت نہیں کھاتے۔

5۔کھیلیں

آئوٹ ڈور گیمز :

کمان جنگ

تیر کمان سے شکار کیا جاتا رہا ہے۔نیز اس کی نشانہ بازی کے مقابلے ابھی حال تک بہت مقبول ہوا کرتے تھے۔یوں تو پہاڑی بکرا، دنبے اور ہرن کو بھاگ کر پکڑنے کا شغل بھی ہوتا رہا ہے۔میلہ و جشن میں تیراندازی کے مقابلے منعقد ہوتے تھے۔تن و توانا رند نشاں جنگ (تیراندازی) کے شوقین تھے۔

مگر پندرہویں سولہویں صدی کے بلوچستان میں تیر کمان اہم بنا، تلوار اہم بنی اور گھوڑا اہم بنا۔اُس وقت کی جنگوں میں یہی ہمارے ایف 16 ہوا کرتے تھے۔تیر اور کمان کے تذکروں سے بلوچی کلاسیکل شاعری بھری پڑی ہے۔جنگوں میں تو ہتھیار ہی یہ اور تلوار ہوا کرتے تھے، اس کے مقابلے بھی روزمرہ کے امور ہوا کرتے تھے۔حتیٰ کہ اسی کھیل سے تو رند و لاشار کی تیس سالہ بلوچ ''سربُر'' کھیل شروع ہوا تھا۔

انسان کی خون آشامی ہمارا اس قدر قدیم حصہ ہے کہ اس کا خاتمہ کرنا بہت مشکل ہے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالخصوص اس صورت میں جب لڑائی یا شکار کو کھیل کا حصہ بنا لیا گیا ہو۔

ہمارا کندھا اور ہمارا تیر کمان، ہمارا کندھا اور ہماری بندوق، ہمارا کندھا اور ہماری کلاشنکوف، ہمارا کندھا اور ہمارا راکٹ لانچر..........کیا ہم جنگی دیوتا کی رعیت قرار دیے گئے ہیں؟!

تیر کمان کی نشانہ بازی کی جگہ البتہ کلاشنکوف کی انسان کشی نے لے لی، باقی باتیں وہی ہیں۔

تلوار بازی

تلوار بازی بلوچوں میں کبھی کھیل نہ رہی۔ یورپ میں یہ کھیل ہے۔ اس کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو تلوار خواہ مصری ہو یا، ہندی، اصفہانی ہو یا شیرازی یہ صرف انسانی خون بہانے کے لیے ہوتی ہے۔ تلوار ہماری کلاسیکل شاعری میں بہادر انسان کے بعد دوسری سوپر پاور رہی ہے۔

جانوروں کا شکار

ہم غلیل و پتھر و بندوق کے شکار کی بات نہیں کر رہے کہ وہ تو دنیا بھر میں رائج ہیں۔ نہ ہی ہم پہاڑی دنبے اور ہرن کے شکار کی بات کر رہے ہیں۔ ہم دست و بازو سے خطرناک درندہ نما جانوروں کے شکار کی بات کر رہے ہیں۔ بلوچ کانٹوں بھرے جانور سیخن کو اپنی جوار کی فصل کو تباہ کرنے کے جرم میں ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لگڑ بھگڑ کو اس کے بل کے اندر جا کر زندہ سلامت پکڑنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔

کوھہ سٹغ

پتھر کون کتنا دور پھینک سکتا ہے۔ اچھا شغل ہے جوانوں کا۔ اس کے لیے کھیل کے میدان کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، نہ ہی اس کھیل کے انعقاد کے لیے خاص جشن و تقریب کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جہاں چار چھ نوجوان اکٹھے ہوئے یہ ٹورنامنٹ جم گیا۔

بک

قبائلی بلوچ ایسی کھیلوں پہ عاشق تھے جو کھلے اور وسیع میدانوں میں کھیلے جا سکتے۔ نشانہ

بازی، شکار اور گھڑ دوڑ.......... بازو آزمانا اور کشتی (بک) ''نیم اِن ڈور گیمز ہیں اور نیم آؤٹ ڈور''۔ بک میں کپڑے اتارنے ضروری نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کو بچھاڑنے کی کوشش ہوتی ہے۔ عید، شادی اور جشن کے مواقع پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کمر کے بجائے نیفہ سے پکڑ کر کُشتی لڑی جاتی ہے۔

دِرک (جمپنگ)

لانگ جمپ میں کھلاڑی دور سے بھاگا ہوا آتا ہے۔ دو آدمیوں نے اپنے کندھوں کی اونچائی میں چادر پکڑی ہوتی ہے۔ کھلاڑی اسے پھلانگتا ہے اس طرح کہ جسم کا کوئی حصہ اس چادر سے چھوئے نہیں۔ اگلی دفعہ چادر مزید اونچائی میں پکڑی جاتی ہے۔

''جلکشی درک'' میں کھلاڑی بھاگ کر نہیں آتا بلکہ وہیں کھڑے کھڑے چادر کو پھلانگتا ہے۔ یہ اونچائی کے درک ہوتے ہیں۔ دراژاذہ دِرک (لانگ جمپ) تو عالمی طور پر ایک ہی طریقہ سے لگائی جاتی ہے۔

تیلچکائی

تیل چکائی (رسہ کشی) بھی ہوتی ہے۔ جہاں ایک ٹیم میں دس سے لے کر پچاس تک کھلاڑی ہوتے ہیں۔ سلیم خان گمی کے بقول اس کھیل میں طاقت اور صبر دونوں ضروری ہیں۔(3)

ھست

ھست نامی ایک کھیل بلوچوں میں بہت شوق سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ گویا کھیل بھی ہے، ورزش بھی اور جواں مردی و قوت کا اظہار بھی۔ ہر ٹیم میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ ایک ٹیم کے کھلاڑی اس طرح کا دائرہ بناتے ہیں کہ ان کی پیٹھیں باہم ملی ہوئی ہوتی ہیں اور چہرے بیرونی طرف مخالف ٹیم کی جانب ہوتے ہیں۔ باہر کے ٹیم کے آدمی اندر والوں میں سے کسی کو ہاتھ لگانے کی (خاص کر سینے پر) کوشش کرتے ہیں۔ اندر والی ٹیم کے کھلاڑی ان ہاتھ لگانے والوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاتھ لگانے والا اول تو پکڑائی نہیں دیتا اور اگر پکڑا بھی جائے تو خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پکڑے جانے کی صورت میں اس وقت تک نہیں چھوٹتا جب تک کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''بل'' (چھوڑ دو) نہ بولے۔ یہ گویا اپنی ہار تسلیم کرنے کا اعلان ہوتا ہے۔

پنجری زیرغ

ایک 5 سے لے کر دس گیارہ سالہ لڑکا اس طرح اکڑوں بیٹھ جاتا ہے کہ ایک گول گٹھڑی جیسا لگتا ہے۔ کھلاڑی نے ایک ہاتھ سے اسے اٹھا کر اپنے سر تک لے جانا ہوتا ہے۔ وہ کتنی بار ایسا کر سکتا ہے۔ یہی سکور بورڈ ہے۔

ڈٹی ڈوک

ایک طرح کا گلی ڈنڈا ہوتا ہے۔

لکاں بوٹی

یہ ہو بہو آنکھ مچولی ہوتی ہے۔

کلیڑو

بچوں کا کھیل ہے۔ ایک ٹیم نے آنکھیں بند کرنی ہوتی ہیں۔ دوسری ٹیم مختلف پوشیدہ جگہوں پہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں بناتی ہے۔ پھر آنکھیں بند کی ہوئی ٹیم آنکھیں کھولتی ہے، اِن ٹیکریوں کو ڈھونڈتی اور مٹاتی ہے۔ مِٹ جانے سے بچنے والی ٹیکریاں سکوار بناتی ہیں۔

دستانی مڑا ئیننغ

اسی طرح بازو آزمانے یعنی ''دستانی مڑائینغ'' بھی مقبول کھیل ہے۔ دلچسپ ہے کہ یہ کھیل یورپ وایشیا میں ہر جگہ مقبول ومشہور ہے۔

گرگاں پسی

''گرکاں پسی'' ورزش اور سانس کو لمبی دیر تک روکے رکھنے کے لیے کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی ایک دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک کھلاڑی اس دائرہ کے گرد اس وقت تک دوڑتا ہے جب تک کہ اس کی سانس ٹوٹ نہیں جاتی۔ تب اس کی جگہ دوسرا کھلاڑی لے لیتا ہے۔(4) یہ سارا کھیل آج بھی جاری ہے۔

آدمی دوڑ، گھڑ دوڑ

کھلاڑیوں کے درمیان دوڑ کے مقابلے اور اسی طرح گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے ہیں۔

آدمی شادیوں اور دیگر جشنوں میں دوڑ کے مقابلوں میں دوڑتے ہیں۔ ایسی سماجی زندگی میں جب سماج ابھی ترقی یافتہ نہ تھا، گھوڑے کی اہمیت مرکزی تھی۔ گھوڑی جان سے بھی پیاری تھی۔ ہم اُس دور کی شاعری میں گھوڑی کے لیے بے شمار نام پڑھ سکتے ہیں۔ بے شمار نسل گنوا سکتے ہیں: ایرانی، عربی (تازی)، سمند، ترکی مُشکی، بور، کمیث، مہلب، ملّ، سُہرنگ، کنڈھی............سبک رفتار گھوڑی جنگ میں فتح کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔

اِن ڈور گیمز:

مرد لوگ اِن ڈور گیمز میں چیاری، نوتڑ (کتار)، کشک، ویری، ٹوٹ، بازاری، ششہ ترنپ، بھیڈی اور بوک (چھدا) کھیلتے ہیں۔

چونک: اب تقریباً نایاب اِن ڈور گیم ہے۔ اس سے متعلق باتیں بلوچی زبان میں محاوروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی کھیل کی بساط کو ''ڈبر'' کہتے ہیں۔ محاورہ ہے ''بھیڈی میں ڈبراں''۔

عورتوں کی البتہ ساری کی ساری کھیلیں اِن ڈور ہیں۔ ان میں کلشغ ہے، لکاں بوٹی ہے۔ آلی بھر کنڑ سندھی ٹاکی، ٹوپی، کلیڑو اور گھمر ہیں۔ چلو پوچ ہے۔

6۔ادب

لفظ کی اہمیت کوئی بلوچوں میں دیکھے۔ بلوچ کی Sensitivities میں جن عناصر کو مرگ وزیست کی اہمیت حاصل ہے، اُن میں لفظ اہم ترین ہے۔ ویسے بھی انسان نے تباہی کی جتنی خطرناک چیزیں ایجاد کی ہیں ان میں سب سے خطرناک اور طاقتور چیز ''لفظ'' ہے۔ خنجر اور نیزے خون کے دھبے چھوڑ جاتے ہیں، تیروں کو دور سے دیکھا جا سکتا ہے، زہر آخر میں معلوم کیا جا سکتا ہے مگر لفظ بغیر نشان چھوڑے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ بلوچی ضرب المثل ہے کہ: دف کلائے، دف بلائے (منہ کرامت بھی ہے، منہ بلا بھی ہے)۔ یا ''کوری ہنگری شوشاں مریانی پذی گلا (ہمیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مریوں کا بعد کا گلہ کور کے انگارے کی طرح جلاتا ہے)۔ یا ''کوش کار ینوگلانہ کار'' (میرا قتل تم پہ جائز ہے مگر مجھ سے گلہ کرنا ناجائز)۔ بات کو بلوچی میں ''ہبر'' یا ''ہور'' کہتے ہیں۔ اور یہی لفظ قول کے معنی بھی دیتا ہے۔ ''ہوریں'' یعنی لفظ کی قسم۔

بلوچ ادب کٹھن اور رنگین زندگانی کے ہر موڑ کے ہر موسم کی عکاسی کرتا ہے۔ بلوچی ادب راست بازی، راست گفتاری، غیرت و محبت، سخاوت و مہمان نوازی، ہمسایہ کے حقوق کی حفاظت، قول وقرار کی پابندی، عزم واستقلال اور اخلاصِ عمل کی تعلیم دیتا ہے۔

بلوچ معاشرے میں ادب کا مطلب اب تک صرف ''شاعری'' رہا ہے۔ ادب کی دیگر اصناف میں قصہ گوئی، حال حوال وغیرہ تو غیر محسوس طور پر موجود رہے ہیں۔ مگر بلوچ کا اب تک کا اصل ادب شاعری ہے۔

شاعری کے موضوع یا تو جنگی ہوتے تھے یا بارش اور فطرت والے اور یا پھر عشقیہ۔ یہاں موسیقیت والے اشعار آتے ہیں جس میں لئی لاڑو، ہالو، لولی، ڈیھی، تاریخی واقعات پر مبنی اشعار، جنگی قصوں، ڈرامہ، طنز ومزاح اور پند ونصیحت کے اشعار ملتے ہیں۔ بلوچی قدیم ادب میں قصیدہ سرائی نہیں ملتی۔ بہت ڈائریکٹ، بہت سچی، رواں اور پر لطف شاعری ہوتی تھی۔

قبائلی نظام والی ہماری شاعری میں غزل وغیرہ نہیں تھے، طویل نظمیں ہوتی تھیں جن میں صرف بحر کا خیال رکھا جاتا تھا۔

بلوچ ادب کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور

سولہویں صدی میں بلوچ بھیڑ پال معیشت سے منسلک تھے۔ قبیلوی نظام رائج تھا۔ Shivalery کا دور تھا۔ یہاں شاعری جو ماہ جبینوں کی سیاہ زلفوں کے پیچ وخم میں گم گشتہ اور محبوباؤں کے بدمست کرنے والے حسن میں مست ہو کر شاعر کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلتی تھی۔ وہ آج بھی وادیِ عشق کے راہ رووں کے دلوں کو معطر کرتی ہے، آج بھی وہ اسے گنگناتے ہیں۔ محبت اور عشق مجھے معلوم نہیں کہ ہماری اس کتاب کا موضوع ہیں یا نہیں۔ لیکن اس کتاب کو

پڑھنے والا ہر فرد یا تو اس کے کھٹے میٹھے ذائقے کو یاد کر رہا ہوگا، یا پھر زندگی کے اس سبک اندام دور سے گزر رہا ہوگا۔

نیز اس دور کے شعرا رند ولاشار کے درمیان لڑی جانے والی تیس سالہ طویل ترین تاریخی جنگ کی مفصل تاریخ پیش کرتے ہیں۔ جنگ کی ہولناکیاں، انسانوں کا بے دریغ قتل، بہادروں کے کارنامے، بزدلوں اور میدانِ جنگ سے بھگوڑوں پر لعن وطعن، انسانوں کے درمیان نفرتوں اور وحشتوں کے رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات، جنگ کی پیدا کردہ قحط و بھوک اور پھر جنگ کے نتیجے میں وطن بہ در ہونے والوں کے دلوں میں اپنی سرزمین کی تڑپ کو اس دور کے شعرا نے جس انداز میں پیش کیا وہ آج ہمارے بیش بہا ادبی ورثے ہیں۔ یہ عہد زیادہ تر ڈرامہ کی صنف پر مبنی شاعری کا عہد تھا۔ لگتا ہے کہ ہر شخص اپنی زبانی اپنے کردار کے حصے کی شاعری کر رہا ہو۔ اس قدیم بلوچی شاعری میں شعور کی بلندی، نفسیاتی وداخلی جذبات کا شعور وشناخت، الفاظ اور ضرب الامثال کا لاجواب انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس دور کے اقدار اور رواجوں کا مفصل اظہار ایسی باتیں ہیں جو ہم عصر دیگر زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتیں۔ الفاظ کی نزاکت اور خوبصورتی، ان کا صاف وستھرا پن داخلی جذبات کا اظہار اور منظر کشی، اور خیالات کی واضح نقل وحمل کا یہ دور لازماً بلوچی شاعری کا سرچشمہ دور ہے۔

دوسرا دور

بالاچ اور جام درک کے اس درخشاں ستارے ہیں۔ بلوچی کلاسیک اس عہد کے بغیر نانِ بے نمک کی مانند ہے۔

جام درک اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ہنستی بولتی، چلتی پھرتی زندگی کا گہرا مشاہدہ کرنے اور پھر اسے الفاظ اور موسیقی کے سانچے عطا کرنے والا عظیم فنکار تھا۔ محترمہ سیمک کو بھی اس دور میں شامل کیا جانا چاہئے جس کی شاعری میں جام کی طرح رنگ ریزی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

بالاچ کے ہاں پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں۔ ان کے خزانے یہی کٹھن پہاڑ ہیں، ان کا گزر بسر مزری سے بھرے درے ہیں۔ ان کی سواری ان کی سفید چپلیاں ہیں، ان کا قالین ان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرزمین کا پلو ہے۔ان کا گدیلا گھاس پھونس اور بیل بوٹے ہیں۔ان کے بالشت سوکھے ہوئے درختوں کے تنے ہیں۔ان کے بیٹے بہادر اور جری انسان ہیں۔ان کے بھتیجے اُن کے تیز خنجر ہیں۔

تیسرا دور

انگریزی تسلط کے دور میں ہمیں اگر ایک طرف مولوی حضور بخش جتوئی اپنے بے پناہ ادبی اور اشاعتی کاموں میں مصروف نظر آتا ہے تو دوسری طرف توکلی مست، رحم علی، محمد خان گشکوری، ملا فاضل، ملا بہرام، جوانسال بگٹی اور میر یوسف عزیز مگسی، آفاقی شاعری کے آسمان میں محو پرواز دکھائی دیتے ہیں۔یہاں مزاحمتی و رزمیہ شاعری اپنے عروج پر ہوتی ہے۔طنز و مزاح بھی نہایت اعلیٰ پائے کا موجود ہوتا ہے۔

چوتھا دور

سرمایہ داری عہد کا ادب ہے جو 1917 کے سوویت انقلاب سے لے کر آج تک کے صنعتی، ٹکنالوجیکل اور پوسٹ ٹکنالوجیکل انقلابات کو بھگت رہا ہے۔ یہاں اب شاعری کے ساتھ تیزی سے ابھرتا ہوا نثری ادب بالغ شکل میں سامنے آتا ہے۔

7۔موسیقی

یہ تو طے بات ہے کہ اپنی مضبوط تہذیبی اقدار کے سبب بلوچ اپنے امیر روایتی ورثہ کو زندہ رکھنے کے قابل رہے ہیں۔آیئے ذرا اُس موسیقی اور اُس کے آلات کا مختصر تذکرہ کرتے چلیں جس کے بغیر بلوچی شاعری، بلوچی کلچر اور بلوچ کی زندگانی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

بلوچوں کے سارے سُر اور ساز دراصل اس شاعری کے ساتھی ہوتے ہیں جس میں بہادروں کے قصے بیان ہوتے ہیں، حسن و زیبائی کے مجسمے تراشے جاتے ہیں، وفا کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں، جفا کی دل سوز تفصیلیں ہوتی ہیں، نازک رفیقوں کی جلا ڈالنے والی جدائی ہوتی ہے، سورماؤں کی موت پہ آنسو بہائے جاتے ہیں، مرشد و محبوبہ کی توصیف ہوتی ہے۔ یہ محض گانے کے ساتھی کی حیثیت سے، اور رقص کے لیے آہنگ پیدا کرنے کے لیے نہیں بجائی جاتی بلکہ نفسیاتی بیماریوں کے

علاج کے بطور بھی موسیقی سے کام لیا جاتا ہے۔

بغو

واضح طور پر چرواہے کا ''ساز'' ہے۔ گلے سے خوش الحانی کے ساتھ ''دستانغ'' کی مطابقت میں آواز نکالی جاتی ہے اور ہاتھ کی انگلیوں سے نرخرے کے اوپر سٹرائیک کیا جاتا ہے۔ بیابان ہو، پہاڑ ہوں، مویشیوں کی بجتی گھنٹیاں ہوں، پھوال کا بغو ہو اور اس کی بازگشت ہو تو سمجھئے آپ بلوچستان میں ہیں۔

شفیلی

ہمارے چرواہے کی بانسری ہوتی ہے۔مگر بلوچ کی شفیلی بیرونی دنیا کی بانسری سے فرق رکھتی ہے۔ یہ پانی کی عام جھاڑی ''کوندر'' (سرکنڈے) سے چاقوں سے کاٹ تراش کر بنائی جاتی ہے۔اس کی لمبائی ''سرکاری'' بانسری سے ذرا کم ہوتی ہے۔اسے نڑ کی طرح سر کی طرف سے پھونک مار کر بجایا جاتا ہے نہ کہ بانسری کی طرح درمیان کی کسی سوراخ میں پھونک مار کر۔

ڈؤو(Dau)

نڑ سے باریک و مختصر مگر شفیلی سے لمبا اور موٹا ہوتا ہے۔اسکی آواز بہت اچھی ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ سرّی گا بھی سکتا ہے۔ڈؤو بھی لوگ مقامی طور پر بناتے ہیں۔ یہ دستانغ کا انسٹرومنٹ ہوتا ہے۔

نڑ

یہ شہروں سے خریدا جاتا ہے اس لیے کہ بانس بلوچستان میں نہیں ہوتا۔ یہ بانس کی پتلی کھوکھلی لکڑی ہوتی ہے جس کی لمبائی پونا گز اور قطر آدھا انچ ہوتی ہے۔نصف لمبائی کے بعد اس میں سوراخ بنے ہوتے ہیں۔اس کو گلے کی آواز موٹا کر کے بجایا جاتا ہے۔مگر اُس سے قبل عام بانسری کی طرح دو تین سانسیں چلاتے ہیں تاکہ اپنا منہ، گلا اور نڑ کی Calibration ہو۔اسے ''پیش گواث'' کہتے ہیں۔پیش گواث بہت ہی میٹھا ہوتا ہے، بہت ہی پسندیدہ، مگر اسے مختصر ہی رکھنا پڑتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ آگے تین چار سو مصرعے جو گانے پڑتے ہیں۔اور چونکہ ناڑی سری کو چار پانچ سو مصرعے بھگتنے پڑتے ہیں اس لیے نڑسر کی میوزک بہت فاسٹ ہوتی ہے۔

ناڑی درمیان میں بالکل وقفہ نہیں کرتا۔ جب سانس لینا ہوتا ہے تو وہ ایک میوزیکل آواز نکالنے کی آڑ میں سانس لے لیتا ہے۔سرّی البتہ ایک آدھ مصرعے جتنا وقفہ اپنی سانس کی درستگی کے لیے کرسکتا ہے۔درمیان درمیان میں وہ دونوں ''آ'' کی آواز مشترک نکال کر اپنے سُر ملا لیتے ہیں۔ پورے دستانغ میں ناڑی سری ایک دوسرے کے ساتھ سر ملانے کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔

زندگی بھر گلے پر بہت بوجھ دیے رکھنے کے باوجود گلے کے کینسر کے کیس کم ہوتے ہیں۔

نڑسر کا ایک سیشن ڈیڑھ دو گھنٹے کا ہوتا ہے۔سامعین چٹکیاں بجاسکتے ہیں،''جی ترا باں'' کہہ سکتے ہیں،ایک آدھ موسیقی شناس بوڑھا دونوں میں سے تیز کو کہہ سکتا ہے۔''مڑ داسنگت کس''۔بس......

ناڑی سری عام قبائلی لوگ ہوتے ہیں۔شوقیہ محفل سجاتے ہیں۔کوئی معاوضہ وغیرہ نہیں لیتے۔ناڑی سُری باہم رازداں اور گہرے دوست ہوتے ہیں۔محبوباؤں کے مالک۔ایک دوسرے کے رازدان اور محافظ۔یہ خود بھی شاعر ہو سکتے ہیں۔

رنگین پوش کے اندر چرب کردہ نڑ چرواہے کے شوق کی تکمیل کا زبردست وسیلہ ہوتا ہے۔
بس صرف سُرّی کی کمی ہے جو اس کے ساتھ ساتھ گائے۔اب یا تو کوئی دوسرا چرواہا ملے جسے سُر گانا آتا ہو، یا پھر کوئی مہمان مسافر ایسا ملے جو سر گانا جانتا ہو،تو پھر تو جنگل میں منگل ہوجاتا ہے۔
بلوچستان کا پہاڑی وطن، دورہ افتادہ آبادیاں.......... یہاں میلہ تو کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔مگر جب ہوتا ہے تو پھر جم کے ہوتا ہے۔

بین (Been)

اسے سندھی میں الغوزہ کہتے ہیں۔اور بلوچستان کے کچھ علاقوں میں اسے ''دونلی'' کہا جاتا ہے۔ یہ شاید سارے بلوچی سازوں میں سے میٹھا اور شیرین ترین ہوتا ہے۔ باید ہے کہ یہ بچوں اور بڑوں کو سکھایا جائے تا کہ بلوچستان کا یہ زبردست میلوڈی والا ساز بلوچستان کے کوہ و دمن کا زیور

بنا رہے۔اس پر دستانغ سُر کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔اور بغیر سُر کے اسے الگ بھی بجایا جاتا ہے۔ دُھن بھی ضروری نہیں کہ دستانغ والے ہوں۔ کچھ ایسی دُھن بھی اس پہ بجائی جاتی ہیں جن کے ساتھ شاعری گائی نہیں جاتی۔انہیں ''لہرؤ'' کہتے ہیں۔

شینزار (سیٹی)

یہ تو ہر انسان کے لیے سب سے سستا اور زیادہ بجنے والا ساز ہے۔ اور آلہِ موسیقی خود آپ کے اپنے ہونٹ ہوتے ہیں۔ چرواہا تو مزدور ہے۔اس کی محنت ہی اسے زندہ رکھتی ہے ....اس کے وجود کو بھی، اور اس کے دل اور روح کو بھی۔محنت انسان کو خود مجبور کرتی ہے کہ اپنی روح اور فن کی ہمیشہ آبیاری کرتا رہے۔اور اگر چرواہے کی کوئی محبوبہ بھی ہو تو اس کے منہ کو روس اور امریکہ بھی سیٹی بجانے سے نہ روک سکیں۔

دمبیرو (طنبورہ)

یہ عام استعمال ہونے والا میوزیکل انسٹرومنٹ ہے۔لمبی گردن والا ستار جیسا آلہ ہے۔ پہ مشتمل یہ ساز قدیم ترین ہے۔اب تو اس کے مخصوص فنکار اور گھرانے بن چکے ہیں۔ یہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔اس قدیم انسٹرومنٹ میں سُر کی طرح آواز بھاری اور موٹی کر کے گانا نہیں پڑتا۔مشرقی بلوچستان میں اس کا استعمال بہت ہوتا ہے۔اب یہ ہر چرواہے کا ساز نہیں رہا بلکہ اب یہ مخصوص اور تربیت یافتہ فنکاروں سے مخصوص ہو چکا ہے۔

سریندا (سروز)

یہ بلوچوں سے مخصوص ساز ہے۔ گو کہ آج یہ کردستان، ایران، افغانستان میں بھی بجایا جاتا ہے۔ نیز پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بھی ۔مگر یہ بلوچستان میں بہت مقبول ساز ہے۔شادیوں،محفلوں کا مقبول ساز یوں سمجھئے کہ سروز (سریندا) بلوچوں کا قومی ساز ہے۔

میرا خیال تھا کہ سریندا کوئی ہندی سندھی لفظ ہے مگر یہ تو ''سرینده'' ہے،سُر دینے والا۔ چاہیں تو اسے بلوچی کا لفظ کہیں،لیکن اگر علاّ ماؤں سے ڈر جائیں تو آنکھیں بند کر کے فارسی کا لفظ کہہ دیں،آپ پر کوئی دفعہ نہیں لگے گی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ بہت ہی میٹھا اور پُرسوز ساز ہے۔قدیم بلوچی شاعری میں اس کے لیے ''شاغ'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔یہ یورپی وائلن جیسا آلہ ہے۔اس کا بڑا حصہ تو لکڑی کا ہوتا ہے۔اس میں پانچ تار ہوتے ہیں۔ان تاروں میں درمیان موٹی تار کو ''نرتار'' کہتے ہیں۔اس کو بجانے کے لیے دائیں ہاتھ میں ایک کمان کی طرح کی قوسی شکل کی لکڑی ہوتی ہے۔جس کے دونوں سروں کو عموماً گھوڑی کے دُم کے بالوں سے باہم ملاتے ہیں۔اسے گج یا گز کہتے ہیں۔یہ آلہ فنکار لوگوں کے ہاتھ میں بولتا ہے۔آرٹسٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہے، سریندا اپنی گود میں رکھتا ہے اور سامعین کی طرف رُخ کر کے اُسے بجاتا ہے۔مست توکلی کا بھائی پیرک سریندا بجانے میں ماہر تھا۔اس کی جواں مرگی پر مست نے اس کے ہاتھ کے ''وش گوانک'' (سریندا) کے لیے حسین ترین شاعری کی۔ ایسا موسیقی بھرا مرثیہ شاید ہی ملے۔

چنگ

یہ بھی بلوچستان کے ہر علاقے میں بجایا جاتا ہے۔یہ نوجوانوں کی جیب میں سما جانے والا ساز ہے اور قیمت میں بھی ان کی پہنچ میں ہوتا ہے۔

بنجو

بلوچی سازوں میں نسبتاً بہت نیا ہے۔مگر یہ وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا ہے۔یہ تقریباً ایک میٹر لمبا ساز ہے۔اچھی واضح آواز۔اس میں ٹائپ رائٹر جیسے کی بورڈ ہوتے ہیں۔بنجو تو آج کے دور میں تاج محمد تاجل کے نام کے ساتھ گویا لازم و ملزوم ہے۔مری قبیلے میں وڈیرہ سہراب خان سومرانی بہت خوبصورت بنجو بجاتا تھا۔بہت سے لوگ بالخصوص میوزیکل گروپس اس کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔

ڈُھل

بھاری بھرکم ڈرم ہے جس کے دونوں سرے چمڑے سے ڈھکے ہیں۔یہ عموماً سُرنا کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔

سُرنا

یہ قدیم ساز ہے۔عام استعمال کا لفظ بھی ہے جو بے شمار معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً شور کرنا، بکواس کیے جانا، اعلان کرتے رہنا، جھنجٹ میں ڈالنا، وغیرہ۔

8۔رقص

رقص کا مجموعی نام ''چاپ'' ہے۔کچھ لوگ اسے ''دھریس'' بھی کہتے ہیں۔

ساحلی بلوچ کا رقص بالکل ایک نمایاں اور خوبصورت رقص ہوتا ہے۔اس کا مجموعی نام ''لیوہ'' پڑ گیا ہے۔حالانکہ رقص کے لیے پورے بلوچستان میں ''لیو'' (Laiv) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ساحل کا رقص تو ڈُھل اور سُرنا کے ساتھ ہوتا ہے۔افریقہ، بلوچ اور جدید طرزوں کو ملا کر اس رقص کی کئی قسمیں بنالی گئی ہیں۔

بلوچی رقص کے میدان میں مکران، ماونڈ اور نوشکی نے بہت ترقی و تخلیق کی ہے۔اسے باضابطہ بنایا گیا، ادارتی شکل دی گئی، ایک سپیشلائزڈ طرز جس نے بلوچ رقص کو بے انتہا ترقی دی ہے۔

مگر بلوچ کی پہچان تو ''ہمبو'' نامی قدیم رقص ہے۔بلوچ قبائلی معاشرہ ''ہمبو'' جیسے اس گرم و پرشور وہم آہنگ طرز کا دلدادہ ہے۔یہ بالکل افریقی رقص لگتا ہے جس میں رقص کے ساتھ اور اس سے ہم آہنگ منہ سے خوفناک آوازیں نکالی جاتی ہیں۔بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ''ہمبو'' صرف مری بگٹی قبائل میں ہوتا ہے مگر ہمارے خاران کے دوست ضیا شفیع کا کہنا ہے کہ رخشانی علاقے کے کوچیوں میں مرد و زن سریندا اور دمبیرو پہ ''ہمبو'' کرتے ہیں۔مگر وہ کہتا ہے کہ وہاں یہ خاموشی سے کھیلا جاتا ہے۔اسی طرح سمیر بلوچ کا دعویٰ ہے کہ نرخرے سے نکالی جانے والی آوازوں کے ماسوا یہ رقص نوشکی میں بھی کیا جاتا ہے۔یہ بہت تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔اسے بچانے کی سخت ضرورت ہے۔بے شک رقص کنندگان کو انتہائی تکلیف دِہ اور تھکا دینے والی آوازیں نکالنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔مگر اس بہت ہی خوبصورت رقص کو بچانا بہت ضروری ہے۔

سہ تاپ، ھشت چاپ سب کی سب ''چاپ'' کی قسمیں ہیں جو بلوچ قبائلی معاشرے کے خوبصورت اور دیکھنے سے تعلق رکھنے والے ڈانسز ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

9۔لوک کہانی

بلوچی ادب کا ابتدائی ارتقا شاید خوبصورت انداز میں ہماری لوک کہانیوں میں موجود ہے۔

بلوچی فوک کہانیاں اپنی لطافت،تغزل اور بُنت میں ادب کا حسین ترین حصہ ہیں۔بلوچوں کی کہانیاں بہت شہرت رکھتی ہیں جو قصّہ گوؤں کی طرف سے انتہائی مہارت کے ساتھ سنائی جاتی ہیں۔

بوڑھی عورتیں یا مرد، بچوں کو رات کو سوتے وقت کہانی سناتے ہیں۔لمبی زمستانی راتیں بھلا بغیر کہانی سنائے گزرتی ہیں!۔لہٰذا بلوچ کے ہاں کہانی شاعری جتنی ہی قدیم ہے۔اور دونوں نے ساتھ ساتھ چل کر الگ صنفوں کی صورت اختیار کرلی۔حالانکہ دونوں بنیاد میں ایک ہی تھے۔ شاعری میں کہانی بیان ہوتی تھی اور کہانی کو شاعری میں بیان کیا جاتا تھا۔

انسانوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہوتے رہنے اور دوسرے انسانی گروہوں سے ثقافتی لین دین نے کہانی کو بھی بہت امیر بنا دیا۔

مشغول رکھنے کی اس صنف میں دیو مالائی باتیں بھی تھیں اور ہماری زمین پہ موجود مادی حقیقتیں بھی۔مگر ایک بات عیاں ہے کہ کہانی کا ایک اخلاقی سبق ضرور نکلتا تھا۔ بلوچ کہانی ہمیشہ سے میوزیکل رہی ہے۔اس کا ابتدائیہ باقاعدہ شعر نما ہوتا تھا۔ درمیان درمیان میں بھی کبھی اصل اور کبھی مجہول فقرے بار بار استعمال کرکے اسے دلچسپ بنایا جاتا تھا اور اس کا خاتمہ بھی بہت خوبصورت الفاظ میں ہوتا تھا؛

قصه میں جهرا
مں په درا
پکه درژ بر
ما واڑته میور
بانگھا سُرگذی ایں لڈے گزی
ترا ڈسّانی

ترجمہ:

کہانی گری انگاروں میں
میں باہر
میوے پک گئے ہیں
ہم نے میور نامی میوہ کھایا
کل صبح سرخ پوش قافلہ گزرے گا
تمہیں دِکھاؤں گا

ہماری ابتدائی لوک کہانیوں میں ہمیں زرتشی عہد سے لے کر بدھ ازم تک جیسا زمانہ ملتا ہے۔ جہاں بس فطرت ہے اور انسان ہیں۔فطرت کی مہربانیاں ہیں اور انسان ہے۔اور فطرت کی قہر مانیاں ہیں اور انسان ہیں۔راکھشس ہیں،انسانی جنگ و استقلال کے مظاہر ہیں۔ان کہانیوں میں دکھایا گیا ہے کہ فطرت کی ہر شیطانی موت سے ٹکرانے کے بعد انسان ہی کامیاب و سرخرو ہوتا ہے۔انسانی آبادیوں سے ہزاروں میل دور عبادت میں مصروف فقیر ہیں، جوگی ہیں، بھائی چارہ ہے، باہمی مدد و امداد ہے اور ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہے، جہاں نیکی ہی نیکی ہے۔

بعد ازاں جب بلوچ بادشاہی نظاموں کے ساتھ رابطے میں آئے تو پھر یہ لوک کہانیاں اُس عہد کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔بھئی، بادشاہ صرف مغل درباروں میں ظلِ الٰہی نہیں ہوا کرتا تھا، وہ تو اپنا نظریاتی عکس قدیم بلوچی ادب میں بھی ڈالتا رہا۔

''بیثہ بادشاہے۔بادشاہ خذائے جندیں کہ آزماں گوں بے توڑیں آ داشتئی ، ہر کس وثی زمیں ٹوٹا بادشاہیا کنغیں ....''۔

بلا شبہ بادشاہ کے باغی بھی ہوتے ہیں ، جو اسے للکارتے ہیں ، اس کی حکمرانی کو چیلنج کرتے ہیں مگر بلوچ کہانی کار اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔وہ بادشاہ کا زیادہ ہمدرد رہتا ہے اور بادشاہ اُس کا ملجاو ماوی۔ بادشاہ واقعتاً باپ کی طرح کا طرزِ عمل رکھتا ہے اور رعیت کو واقعی اولاد گردانتا ہے۔لہٰذا وہی اس کا ہیرو رہتا ہے۔وہ جو باغی ہوتا ہے اس کے پاس کوئی عوامی پروگرام نہیں ہوتا۔بس ایسے ہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باغی ہوتا ہے۔سوچ میں نابالغ، ناتجربہ کار...... پھر یا تو شکست کھا کر وہ بادشاہ کا مطیع ہو جاتا ہے یا کامیابی کی صورت میں خود ظلِ الٰہی بن جاتا ہے۔اُس دور کے کہانی ساز کو اور کوئی متبادل میسر ہی نہیں تھا۔بادشاہت ہی طرزِ سلطنت ہوتی تھی۔وہ اور کچھ نہ دیکھتا تھا، نہ سوچ سکتا تھا۔

البتہ ہماری لوک کہانیوں میں نیچر کے خلاف انسان کی جدوجہد بھی موجود ہے۔بادشاہ اپنی اُرد کے ساتھ جنگل جاتا ہے اور اس سارے سفر میں نیچر اور انسان کی لڑائی موجود ہوتی ہے۔اسی طرح لکڑ ہارا اپنے حوالے سے نئے نئے اوزار اور وسائل کے ساتھ نیچر پر فتح مند ہوتا جاتا ہے۔کسان کاشتکاری کی نئی نئی اقسام اور آلات وضع کرتا رہتا تھا اور ہر لحاظ سے فطرت کو اپنا مطیع بناتا جاتا ہے۔چرواہا جنگلی حیوانات کو پالتو بناتا جاتا ہے، اور درندہ (کتا) کو چوکیدار۔وہ اپنے دشمنوں (بھیڑیوں، گیدڑوں، لومڑیوں' گوحوں) کے خلاف نئی نئی ٹیکنالوجی سے مسلح ہوتا رہتا ہے۔وہ گھاس، اس کی اقسام اور چراگاہوں کی موجودگی کے علوم حاصل کرتا جاتا ہے۔

اس دور کا کہانی کار درندوں، پرندوں، درختوں اور پتھروں کو بھی اپنی کہانی کا کردار بناتا ہے، ان سے باتیں کرواتا ہے، اُن سے انسان کی طرفداری یا دشمنی کرواتا ہے، انہیں آپس میں محبت یا عداوت میں دکھاتا ہے۔

بعد کی لوک کہانیوں میں وطن، آزادی، قبضہ گری، حب الوطنی کی باتیں نظر آتی ہیں۔گو کہ ابھی تک وطن بادشاہ کا ہی ہے مگر کہانی کار اپنی اور اپنے عوام کی شناخت بھی کچھ کچھ اپنی سرزمین سے کرتا دکھائی دیتا ہے۔اِدھر ہی ہمیں غلام اور لونڈی کا ذکر بھی ملتا ہے اور اُن کی حالتِ زار کا تذکرہ بھی۔مدھم، دھندلا............

10۔حال حوال

خانہ بدوش اور مالداری کے سخت ماحول میں، وسیع طور پر دُور دُور بکھرے ہوئے بلوچ اپنی بقا کے لیے کمیونی کیشن کے ایک نیٹ ورک پر انحصار کرتے ہیں۔بلوچ عوام عمومی طور پر سیاسی فیصلوں کی بہ نسبت چراگاہوں، پانی کی جگہوں، اور دوسرے لوگوں اور کیمپوں کی نقل وحرکت کے

بارے میں اطلاعات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔اطلاعات کے اس نیٹ ورک کو' حال حوال' کہتے ہیں۔

حال حوال کا تبادلہ انسان کی ایک عالمگیر عادت ہے۔انسان اپنی دلچسپی کے امور کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے۔حیوان اور انسان کی سرحدوں کو واضح کرنے کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والی چیزوں میں سے ایک '' حال حوال' ہے۔اگر حال حوال اور اطلاعات کا تبادلہ نہ ہوتو ترقی یافتہ ساری انسانیت لگڑ بھگڑوں کی ٹولیوں میں بدل جائے۔

بلوچ کا حال حوال اس کی اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔بلوچ کو نہ تو حال احوال کی ایجاد کے زمانے میں کسی خلائی جہاز میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، نہ اُسے اس زمانے میں بنڈوگ کانفرنس کی شرائط یاد رکھنی تھیں اور نہ ہی ریسرچ کی دنیا میں پیش رفتوں کا جائزہ لینا تھا۔اس نے تو مسافر اور راہی سے یہ معلوم کرنا ہوتا تھا کہ وہ کس سے ملا، اُس کا سفر کیسے کٹا، مویشی کا نرخ اور ریٹ کیا چل رہا ہے، غلہ کس بھاؤ میں مل رہا ہے، فصل کی حالت کیسی ہے، گڑ اور پتی کی قیمت کیا ہے، سردار اور سرکار کی سیاست وسیاحت کی کیا خیر خبر ہے، بیماریوں کی آمدورفت '' بھائی بندی'' کے جھگڑے جھمیلے، '' چچازادوں'' کے آپسی قتل وقتال، '' ہم قوموں'' والی سیاسی وسیاہ کاری کی چال و رفتار........، یہ تھیں بلوچ کی '' دوراندیش'' آنکھوں کی منزل وبصیرت۔البتہ ان سب باتوں سے ضروری بات تھی بادل برسات کی، چراگاہ وگھاس کی۔وہ آج بھی باقی ہر حال وخبر کو بے کار سمجھ سکتے ہیں مگر مال اور مالداری کے بارے میں کسی بات کو چھوٹی بات نہیں گن سکتے۔مالداری اس کی ضرورت اور اس کی زندگی ہے۔اس کے بارے میں ہر بات کو وہ دل کے کانوں سے سنتا ہے، اس انداز میں کہ اس کا منہ کھلا ہوا ہوتا ہے، آنکھیں حال سنانے والے پر ٹکی ہوتی ہیں اور وہ مکمل طور پر '' ہمہ تن گوش'' اور بت کی طرح ساکن ہو جاتا ہے۔

حال حوال لازم ہے کہ خود بلوچ کی طرح سچ ہو، اُس کی گُندھی ہوئی خوبصورت داڑھی کی طرح حسین ہو، اس کی روح کی طرح سادہ اور اس کے دل کی طرح صاف ہو۔تازہ ترین خبر کا پھیلانا حال حوال کا اصل مطلب ہوتا ہے۔اس رواج کی پیروی کرنا ہر '' شلوار پہننے کی عمر کے مرد' پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرض ہوتا ہے۔ نہ تو حال طلب کرنا کوئی شرم کی بات ہے اور نہ حال نشر کرنا کوئی احسان یا بوجھ ہے۔

حال ایک امانت ہے جسے آگے ہی پاس کرتے رہنا چاہیے۔ اور یہ ٹریفک یک طرفہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک قسم کا تبادلہ ہے اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان انفارمیشن سبک رفتاری سے پھیل جاتی ہے۔ گو کہ حال حوال کی سرحدیں اور رقبہ بہت محدود ہوتا ہے مگر پھر بھی لوگ اس کی وجہ سے تازہ ترین تبدیلیوں سے باخبر ہوجاتے ہیں۔ اور انفرادی طور پر یا مل کر React کرتے ہیں۔

بلوچ اپنی ضرورتوں کی خبریں سننے اور انہیں ایکسچینج کرنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ یعنی حال حوال کی خاطر اسے ایک نادیدہ اور بھوکی قوم کہا جاسکتا ہے۔ یہ بھوک قرنوں سے اس کے اندر موجود ہے۔ اس کے دل کی رگ رگ پیاسی ہے حال حوال کے لیے، یہ پیاس اس کے جینز کے اندر جذب ہے۔ اصل میں یہی بھوک ہے جو بلوچوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی راہگیر کو ''بے حال'' نہیں چھوڑتے۔ ہر سلام کہنے والے شخص کا حال لینا لازمی ہے وگرنہ سخت بے رواجی ہوجائے گی۔ سلام کہنے والے شخص کے تئیں اس کا حال طلب نہ کرنا گویا اُس کو کمتر درجے کا شخص قرار دینا ہوتا ہے۔ جس کے بڑے تباہ کن نتائج نکلتے ہیں۔ لہٰذا سارا بلوچ اس کا پابند ہے۔

خیر خیریت پوچھنے کی ترتیب بھی بالکل میوزیکل انداز میں وضع کی ہوتی ہے۔ خاص کر اگر لوگ زیادہ ہوں تو ایک ہی آواز میں یوں بولتے ہیں جیسے ساون کے بادل گرجے ہوں۔ بلوچ کا خیریت پوچھنا بھی دبدبہ اور بڑے پن سے بھرا ہوا ہوتا ہے، کسی دوسرے سماج میں تحکم اور فوجی کاشن جیسا خیریت پوچھنے کا انداز شاید ہی ہو۔

کچھ وقفے کے بعد میزبان اس سے پیاس کے بارے میں لازمی طور پر پوچھتا ہے۔ اور پانی پلانے کے بعد اس سے حال مانگتا ہے۔ پھر وہ اپنی خبریں شروع کرتا ہے۔

سلام اور خیر خیریت پوچھنے کا سلسلہ ایک قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً سوار شخص پہل کر کے پیادہ کو سلام کہتا ہے، بلندی کی طرف سے اترائی کی طرف آنے والا شخص، آنے والا شخص بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کہتا ہے۔ بلوچوں میں سلام کہنے کے لیے کمسنی اور بزرگ سنی کی اہمیت نہیں ہے۔ عورت کو کوئی بھی سلام نہیں کہتا۔ سلام کہنا اگر رواجاً لازم ہوتے ہوئے بھی نہ کہا

جائے تو احتجاج کا حق حاصل ہے حقدار کو۔ اور احتجاج کی حد اور سرحد اور انداز وشمار بلوچ وطن میں متعین نہیں ہے۔

سلام کہنے والے شخص کا حال لینا ہر حال میں ضروری ہے، خواہ آپ کو حال اور خبر کی ضرورت ہو یا نہ ہو، یا حال سنانے والے شخص کا موڈ ہو یا نہ ہو، رواج تو بہرصورت پورا کرنا ہی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹہ کے لیے بھی باہر گئے تو واپسی پر خبروں کا بلیٹن ضرور ہوگا۔ اس رواج کو اس قدر دلائل کے زور سے مضبوط بنایا جاتا ہوتا ہے، اس قدر قصے بنا بنا کر بلوچ رواجوں کو مستحکم کیا گیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک قصہ یہ ہے کہ ایک شخص محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے باہر چلا گیا پیشاب کرنے۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو محفل کو سلام کہا۔ اب دس پندرہ منٹ کے فراق کا کیا حال حوال؟ لہٰذا لوگوں نے اس سے حال نہیں لیا۔ اس شخص نے احتجاج کیا کہ میرا حال کیوں نہیں لیتے؟ محفل کے لوگوں نے کہا کہ ''بھائی ابھی ابھی تو یہاں سے گئے ہو، کیا حال لیں؟ تمہارے پاس کونسا دہلی کا کوئی حال ہے؟'' بہرصورت اس کا حال لیا گیا۔ اس نے حال میں بتایا کہ ''میں پیشاب کرنے گیا تو کھڈے میں ایک لاش پڑی دیکھی''۔ کم آبادی والے بلوچستان میں لاش بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مثال صدیوں سے ایک ڈھال بن گئی حال حوال والے رواج کے لیے۔ اگر کوئی حال نہ لے تو فوراً اس قصے کو دہرایا جاتا ہے۔

ایک، دو یا تین مسافر یا راہگیر کئی اطراف سے بہ یک وقت آجائیں تو ''پہلے آؤ، پہلے پاؤ'' کے اصول پر باری آنے پر حال حوال دیتے جاتے ہیں۔ میزبان بغیر کسی رکاوٹ کے ہر ایک کو Deal کرتا رہتا ہے۔ البتہ جواب میں میزبان کا حال تو ظاہر ہے کہ ایک ہی شخص نے لینا ہوگا۔ رواج یہ ہے کہ حال لینا آخری شخص کا ''حق'' بن جاتا ہے۔ اگر وہ خود خدائی خدمتگار بن کر کسی اور کو اپنا حق عطا کردے تو الگ بات ہے، ورنہ سارے لوگوں سے اجازت لیتا ہے اور جوابی حال میزبان سے وصول کر کے ''رسید لکھی''۔ اب جس وقت یہ بہت ہی فارمل فریضہ پورا ہوجائے تبھی دونوں فریق ذرا سا Relax ہوجاتے ہیں۔ گردن کی پھولی ہوئی رگیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہیں، چہرے کا سرخ ہونا کم ہونے لگتا ہے۔ چلم پیا جاتا ہے۔ ''آسمان واپس اوپر چلا جاتا ہے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زمین واپس نیچے آتی ہے۔'' ہنگامی حالت ختم ہوجاتی ہے۔ حال حوال کا ختم ہونا سمجھو کہ جنگ میں ذاتی بہادری دکھانے کا مرحلہ ہوتا ہے اور خیر خیریت سے جب یہ اختتام پذیر ہوجاتا ہے تو ظاہر کہ آدمی فتح کے احساس میں شکر اور چین کا سانس لیتا ہے، اس لیے کہ بہت دفعہ کئی لوگ بڑے مجمعوں کے اندر بالکل بند ہوجاتے ہیں۔ وہ حال کہنا شروع تو کرتے ہیں۔ مگر پھر اچانک ان کی بولتی بند ہوجاتی ہے اور وہ ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتے۔ بہت سے سفید ریش افراد، باتونی، گپ شپی، محفل و دیوان کے لوگوں کا منہ اس طرح بند ہوجاتا ہے جیسے مری میں میھ کانی کے جادو سے دشمن کی بندوقیں چلنا بند ہوجائیں۔

فرض کرو کہ الف نے ب کو اپنا حال دیا۔ مگر ب سے حال لینا بھول گیا، تو صاحب اسے رواجاً ایک دنبہ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ یا پھر صدق دِل کے ساتھ بلند آوازی سے ایک غیر مستحسن آواز، غیر مستحسن جگہ سے نکالنی ہوگی۔ تا کہ ساری دنیا کو خبر ہوجائے۔ (بلوچ کے استحقاق کے مجروح ہونے کی اتنی بڑی سزا!)۔

بلوچ کا حال شروع سے لے کر آخر تک اللہ کی بزرگی، نعمتوں پہ شکر، خیر کی دعا کے کلمات اور جی و جان سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ بلوچ بہت ہی خوبصورتی اور ترتیب کے ساتھ الفاظ کو پروتے جاتے ہیں۔ مثلاً ''جی خدا کو جس نے نبی پیدا کیا'' وغیرہ۔ خیر کا ورد سمجھ میں آجاتا ہے کہ جنگ بلوچ کی سب سے بڑی دشمن ہے، اور اُس کی Antidote ہے خیر۔ اس لیے بلوچ کے حال حوال سے اگر لفظ ''خیر'' نکال دیں تو گویا پھر کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ بلوچ جس قدر بھی خیر اور امن مانگے، خیر اور امن اسی قدر دور بھاگتے جاتے ہیں۔ بلوچ کہتا ہے'' روٹی''، روٹی نایاب ہوتی جاتی ہے۔ بلوچ کہتا ہے'' سکھ''، سکھ قریب نہیں پھٹکتا۔ شالا منظور ہوں ہماری دعائیں اور ہم پہ امن کی نہ تھمنے والی بارش دائمی طور پر رم جھم کرتی رہے۔

یہ حال حوال'' خیر'' کے الفاظ سے شروع ہوکر خیر ہی کے کلمات پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں Passive نہیں بلکہ جوش اور جاندار انداز میں دونوں فریق حال حوال کو اختتام بخشتے ہیں۔ حال دینے والا آخر میں کہتا ہے؛

''اور خیر ہے''۔

حال لینے (سننے والا) لمبی تان میں جواب دیتا ہے؛

''خیر ہوجائے، کہ اچھا میوہ بھی خیر کا ہوتا ہے''

(اس بلوچ جملے کا نعم البدل تو لا کر دکھاؤ!)

ہمارے حال حوال کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ گھنٹہ بھر لمبے حال حوال کو شروع کرتے وقت بلوچ کہتا ہے،'' میں نے خبر کوئی سنی نہیں'' یا'' میں کسی سے ملا نہیں''۔ مطلب تو یہ ہے کہ میرے پاس کوئی حال سنانے کو نہیں ہے مگر پھر بھی وہ پورے ایک گھنٹے تک تازہ اور ضرورت کی خبریں براڈ کاسٹ کرتا جاتا ہے۔ اور وقفے وقفے میں کہتا جاتا ہے کہ'' میں نے کوئی خبر نہیں سنی''۔

بڑے بڑے مجمعوں، محفلوں، دیوانوں میں حال لینا کسی بھی فرد کے لیے اعزاز اور سٹیٹس کی بات ہے، اور حال دینا ایک ناموس کی بات ہے۔ ایسی جگہوں پر ہر عام و خاص آدمی نہ تو حال دے سکتا ہے اور نہ لے سکتا ہے۔ ایسی جگہوں پر حال حوال کرنے والا شخص حکمران خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ گو کہ ہر چرواہا حال حوال کا ماہر ہوتا ہے مگر قبائلی بیوروکریسی کی موجودگی میں وہ اس وقت صرف'' جی آپ'' کہے گا جب'' بڑا'' اسے کہتا ہے کہ'' تمہیں بھی حال حوال کرنے کی پیشکش کی جاتی ہے''۔

بہر حال بلوچ عوام دور دراز آباد ہیں، ملکی، علاقائی اور بیرونی دنیا کے حالات سے باخبر ہونے کا کوئی وسیلہ نہیں۔ نہ چھٹی، نہ ٹپال، نہ ڈاک نہ تار، نہ انسٹا فون و موبائل اور نہ ٹی وی۔ لہٰذا عوام نے اپنا متبادل راستہ بنا دیا جس کا نام انہوں نے حال حوال رکھا۔ اس کے بلیٹن دن میں بہت بار بہت سے سٹیشنوں سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اور میر مٹھا خان مری نے برحق طور پر اس رسم کو'' کیشرالورڈ'' کہا۔(5)

11۔ گالی

گالی تو چرواہے کی روزمرہ کی ایجاد ہے۔ اور اس میں سپیشلٹی میں بکری استاد ہوتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھیڑ چونکہ شریف جانور ہے اس لیے اسے زیادہ تنگ نہیں کرتی، اس لیے چرواہا اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ مگر بکری چونکہ بہت بے آرام جانور ہوتی ہے اس لیے مقدر میں زیادہ اور اخلاق میں گندی سے گندی گالی اسی کو پکڑتی ہے۔

12۔ نظامِ انصاف

پیر اڑو

جرائم کی دنیا کے ساتھ بلوچ اپنے دیسی طریقوں سے نمٹتا ہے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا طریقہ ''رندہ جنغ'' ہے۔ یعنی قدموں کا کھوج لگانا۔ اس کے ماہر ہوتے ہیں جو کبھی موروثی ہوتے ہیں کبھی ماہر۔ یہ لوگ مطلوبہ گھوڑے، اونٹ، درندے وغیرہ سے لے کر آدمی (چور ہو یا قاتل) کے پاؤں کے نشان کو شناخت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کی چال، اور رفتار سے اُس کا قبیلہ، ذیلی قبیلہ، خاندان تک بتاتے بتاتے خود اُس مجرم کا نام بتا دیتے ہیں۔

آسہ جنغ

منصف کو بلوچی میں شرابُر کہتے ہیں۔ سرمایہ دارنہ پاکستانی عدالتی نظام کے برعکس قبائلی نظام میں سوائے سردار کے، منصف اوپر سے نازل نہیں ہوتا۔ بلکہ منصف وہی شخص ہوتا ہے جسے دونوں فریق باہمی رضامندی سے منتخب کریں، جس پر دونوں فریقوں کو اعتماد ہو۔ اور وہ جسے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں۔

وہ فریقین کا بیان باری باری سنتا ہے۔ فریقین پابند ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بیان میں مداخلت نہ کریں بلکہ تحمل سے دوسرے کے دلائل سنیں اور اپنی باری پر اپنا بیان جس قدر چاہیں تفصیل سے بیان کریں۔ شرابُر اگر ضروری سمجھے کہ اسے مزید انفارمیشن کی ضرورت ہے تو وہ فیصلہ ملتوی کر کے گواہ وغیرہ سے اپنی تشفی کر لیتا ہے۔ وگرنہ اگر مقدمہ سیدھا سادہ ہو تو وہ وہیں فیصلہ سنا دیتا ہے۔ ''فلانے! تم ملامت ہو''۔ اور سزا بھی وہیں بیٹھے بیٹھے سنا دیتا ہے۔ جو عموماً جرمانے کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ جہاں دیدہ اور غیر جانبدار منصف اپنی مرضی سے ''یہ منجور، یہ نا منجور'' نہیں

کہتا۔ وہ پابند ہے کہ آئین وقانون (رواج) کے مطابق فیصلہ دے۔ اس لیے کہ فیصلہ تو فوراً بعد عوامی ملکیت بن جاتا ہے۔ منصف کا وقار، نام، اور شہرت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔

اس فیصلے کی اپیل سردار کے پاس ہی ہو سکتی ہے۔

جو بات بلوچ میں خصوصی تکریم وستائش کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کسی سے کہہ دو کہ میرا تم سے فلاں بات پر تنازعہ ہے اور مجھے ''شرابُر'' (منصف) کے پاس پلو، شرا، یا انصاف دے دو، تو وہ انکار کبھی نہیں کرے گا بلکہ اپنے دلائل اور سچائی کے ذریعے اپنی بے گناہی ثابت کرے گا۔ ضرب المثل ہے کہ ''جو آدمی شرا سے انکار کرے، وہ شرا (انصاف) کا بیٹا ہی نہیں''۔ اور یہ بڑی گالی تصور ہوتی ہے۔

تمام قدیم معاشروں میں متنازعہ معاملات کا فطرت کے مظاہر کی مدد سے فیصلہ ہونے کی روایتیں موجود ہیں۔ اور اُن میں آگ اور پانی سب سے اہم ہیں۔ یہ دونوں بہت سے علاقوں کے خدا، یا، دیوتا رہے ہیں۔ لوگ سیکڑوں برسوں تک اُن کی پرستش کرتے رہے ہیں۔

انہی طاقتور اور کارآمد مظاہر سے لوگ جھگڑوں کی صورت میں قسم کھانے، قسم دلانے، یا پھر منصف کے بطور کام لیتے چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً قدیم فیوڈل یورپ میں، بلوچوں کی طرح ملزم اپنی صفائی آگ اور پانی سے گزر کر کرتا تھا۔ ہمارے کچھ قبائل میں تو ''آس آف'' کی عدالت باقاعدہ ایک ادارہ ہے۔ قتل سے لے کر معمولی چوری تک ملزم اپنی صفائی آگ میں ''نہ'' جل کر گزرنے یا پانی میں ''نہ'' ڈوب کر ہی ثابت کر سکتا ہے۔ آگ اور پانی بہت مقدس تصور ہوتے ہیں۔ آتش پرستی ہمارے جینز میں جو شامل ہے۔ کیسے؟!

یوں ہے کہ اگر آپ شاہنامہ دیکھیں تو وہاں آگ میں ڈالنے کا عہد، کیکاؤس کا بتایا گیا ہے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ سیتا کو چودہ سال تک راونڑ اغوا کر کے رکھ لیتا ہے۔ جب وہ آزاد ہو کر اپنے شوہر رام کے پاس واپس آ جاتی ہے تو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے راونڑ نے نہیں چھوا، اُسے آگ پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ رامائنڑ کی سب سے مقبول کہانیوں میں سے ایک ہے۔ جس نے پورے ایشیا کی Mythology کو متاثر کیا۔ پھر، شاہ لطیف کے ''شاہ جو رسالو'' میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پنوں کی محبوبہ سسی کو بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آگ پر سے چلنا پڑتا ہے۔ وہ عمر ماری کی داستان میں بھی اس ''آس'' کا ذکر کرتا ہے جہاں ماری کو اپنی پاکیزگی اور عصمت ثابت کرنے کے لیے ایک امتحان سے گزرنا پڑا۔ وہاں آگ سلگائی گئی اور اس میں لوہے کی سیخ کو گرم کیا گیا اور جب وہ گرم ہوکر سرخ ہوگئی اور بجلی کی طرح چمکنے لگی تب ماری کو اُسے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر انگاروں پر ننگے پاؤں چل کر دکھانا پڑا۔ فیوڈل یورپ میں ابلتے ہوئے پانی میں ڈالے ہوئے لوہے کے ایک ٹکڑے کو انگلیوں سے باہر نکالنا پڑتا تھا۔ یا اپنی زبان پر آگ سے سرخ کی ہوئی سرخ سلاخ رکھنی پڑتی تھی۔

بلوچ سماج میں، رواج کے بطور صرف بگٹی قبیلے میں ملزم کو ننگے پیر جلتی آگ میں گھس کر اس پر چلنا پڑتا ہے۔ باقی قبائل میں یہ مرض موجود نہیں ہے۔ بگٹی میں بھی یہ پہلے عام نہ تھا، مگر شہید نواب اکبر خان بگٹی نے اس کی اچھی خاصی حوصلہ افزائی کی۔ اور اسے میڈیا وغیرہ میں دکھا دکھا کر اسے مشہور کر دیا۔ چونکہ یہ رواج بگٹی قبیلہ سے باہر موجود نہیں ہے، اس لیے معلومات لینے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس خاص رسم کے لیے تقریباً ایک دس گز لمبا نالہ کھودا جاتا ہے اور اسے جلتے ہوئے انگاروں سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ نالا انگاروں سے اس قدر پیک ہوتا ہے کہ پاؤں ٹخنہ تک انگاروں میں دھنس جاتے ہیں۔ نالے کے دونوں سروں پر ایک چپٹا پتھر رکھا جاتا ہے۔ اک نامی پودے کے پتے انگاروں پر پھینک دیے جاتے ہیں...... ملاّ تین بار آگ کے چاروں طرف طواف کرتا ہے اور ''پیر'' نامی پودے کے سات پتے اس کے اندر یہ ورد کرتے ہوئے پھینکتا جاتا ہے کہ، ''جس طرح یہ پتے جلے ہیں، ملزم اگر مجرم ہے تو اس کے پاؤں بھی اسی طرح جلیں''۔ پھر دو دنبے ذبح کیے جاتے ہیں اور جونہی ذبح کیے جانے والے دنبوں کا خون بہنے لگتا ہے، ملزم آگ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اگر ملزم جلنے اور ritual کو درمیان میں ختم کرنے پہ مجبور نہ ہو تو اس کے پیر دیکھے جاتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے اس کے پیروں کے تلووں پر خون یا پانی پھینکا جاتا ہے تا کہ اگر اس کے پاؤں پر معمولی سا چھالا بھی بنا ہو تو وہ واضح نظر آسکے۔

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ پارس اور سنسکرت رواجوں سے آئی ہوئی یہ منحوس رسم اپنی

پیدائش کی جگہوں میں تو مرگئی مگر ہم میں یہ وحشت زندہ رہی۔ اس بات میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ ''آس'' سے فیوڈل کی اتھارٹی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات بھی تاریخی اہمیت والی ہے کہ آج تک کسی بلوچ سرار یا وڈیرہ کے خاندان کے کسی بھی فرد کو آگ پر نہیں چلایا گیا۔ یہ ہمیشہ غریب لوگ ہیں جو آگ کا بوجھ اپنے ننگے پیروں تلے ڈھوتے رہتے ہیں۔

کولمبو میں تعیناتی کے زمانے میں پبلو نرودا نے یہ عمل خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نرودا نے اسے یوں لکھا............''1929 کی ایک رات...... میں ہجوم کو اکٹھا ہوتے دیکھتا ہوں۔ یہ مسلمانوں کی چھٹی کا دن ہے۔ وہ گلی کے وسط میں جمع ہوگئے ہیں۔ وہاں ایک گڑھے میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ ذرا نزدیک ہوتا ہوں۔ راکھ کی پتلی تہہ کے نیچے جلتے انگاروں کی حدت سے میرا چہرہ تمتماتا ہے۔ اچانک حیران کر دینے والا ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔ سرخ اور سفید رنگ ملے وہ چار لوگوں کے کندھوں پر سوار سرخ لباس میں ملبوس ہے۔ اور وہ جیسے عالمِ خمار میں اللہ اللہ چیختا ہوا جلتے ہوئے کوئلوں پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

''سارا مجمع اس منظر میں گم ہے۔ جادوگر کوئی نقصان اٹھائے بغیر جلتے کوئلوں پر سے گزر گیا۔ تب ایک اور آدمی ہجوم کو چیر کر آتا ہے اور اپنے چپل اتار کر اسی طرح ننگے پیروں دہکتے انگاروں پر چلتا ہے۔ اسی طرح رضا کارانہ طور پر لوگ آگے آتے ہیں اور جلتے انگاروں پر چلتے رہتے ہیں۔ کچھ آگ کے وسط میں رک کر اللہ اللہ کا ورد کرتے ہیں اور رونگٹے کھڑے کر دینے کی حد تک چیختے ہوئے اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف کرتے ہیں''۔(6)

708ق۔م کے قریب مغربی ایران میں ماد حکومت قائم ہوئی۔ اس کا پایہ تخت موجودہ ہمدان تھا۔ اُس زمانے میں کرد بلوچ ''آھورا'' کی پرستش کرتے تھے۔ ''ھور'' کا مطلب ہے، آگ اور ''آ'' کا مطلب ہے: آیا،............ ''وہ حقیقت جو آگ سے دائمی ہے''۔ جب بلوچوں نے توران اور مکران میں سکونت اختیار کی تو انہوں نے اپنے مذہب کو رواج دیا۔ توران کی بت پرستی متروک ہوگئی۔ کرد بلوچ دن میں تین بار آگ کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''آرینم'' کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے آتش کدہ۔ آتش کدہ کے معبد کو آری وان کہتے ہیں۔ شہروں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیہاتوں میں آتش کدہ ہوا کرتے تھے۔ بلوچ کردوں کے حکمرانوں نے دو بڑی عبادت گاہیں کیکان (موجودہ نال) اور خضدار میں ''آرین زوراک'' اور ''آرین حلوان'' کے نام سے تعمیر کی تھیں۔ جو کوہ زوراک اور کوہ حلوان کی چوٹیوں پر بنائی گئی تھیں۔

بلوچ آج بھی آگ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے محاوروں اور ضرب الامثال میں آج بھی آگ کی طرف پیر کرنے، آگ کی طرف تھوکنے، آگ کی طرف ہاتھ کے پنجے سے لعنت بھیجنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ہمارا بچہ بھی غیر ارادی طور پر آگ کی تکریم کرتا ہے۔ موجودہ دور کے ناکام شدہ عدالتی نظام کے ہاتھوں ''آگ'' کو ایک غیر ضروری مقام پہ مل رہا ہے کہ وہ ہمارا چیف جسٹس بھی بن بیٹھی ہے۔ یہ آگ کی جانب سے ایک ناقابلِ قبول تجاوز ہے جس نے بہرحال ختم ہونا ہے۔ مگر آگ کی حرمت کرنے کی خصلت بلوچ میں قرنوں تک جاری رہے گی، اس لیے کہ یہ ہمارے اجداد کا مذہب تھی۔

اسی طرح نیچارہ اور پندران کے علاقہ میں کئی پہاڑوں، چٹانوں اور قبرستانوں میں زرتشتی آثار موجود ہیں۔ خاران اور ماشکیل میں بھی زرتشتیوں کے آثار اور قبریں اس خطے میں اس مذہب کی موجودگی کی دلالت کرتے ہیں۔ کوئٹہ (شال) میں سرینا ہوٹل کی تعمیر کے دوران تہہ خانوں کی کھدائی کے وقت ایسے آثار دریافت ہوئے جن سے زرتشتی معتقدات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

آفہ جنغ

آگ کی طرح پانی بھی کچھ بلوچ قبائل کا سپریم کورٹ رہا ہے۔ ملزم کو اپنی صفائی کے لیے پانی میں جانا ہوتا ہے۔ پانی کی ایک گہری جھیل میں ایک لمبی سوٹی ڈال دی جاتی ہے۔ ملزم کو اس ڈنڈے کے سہارے جھیل میں اترنا ہوتا ہے۔ اس کو اپنا سر اس وقت تک پانی کے اندر رکھنا ہوتا ہے جب تک کہ دو منصف ایک مقررہ جگہ تک دوڑ لگا کر واپس جھیل کے کنارے تک آ جائیں۔ اگر ملزم کا دم دوڑنے والوں کی دوڑ ختم ہونے سے قبل گھُٹ جائے اور وہ سانس لینے کے لیے اپنا سر باہر نکال لے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ پانی نے اسے مجرم قرار دے کر اسے اپنے اندر رہنے نہیں دیا۔

یہ رسم بھی کچھ چھوٹے قبیلوں میں مروج ہے۔ بڑے اور وزن دار قبیلوں میں '' پانی

شریف'' سے چیف جسٹس کا کام نہیں لیا جاتا۔

13۔ دستار و داڑھی

بلوچ ویلیو سسٹم میں ضروری ہے کہ دستار و داڑھی کو بطور شان و وقار عزت دی جائے۔ اگر منت سماجت کی آخری حدود کو چھونا ہو تو اُس کی داڑھی پہ ہاتھ رکھ کر یا اپنی دستار اتار کر اس کے پیروں پہ ڈال کر عرض کریں تو ایک باوقار بلوچ بہت کچھ تج کر بھی اس کی التجا منظور کرے گا۔ وہ پورا کرے گا۔ اگر دشمنی کی انتہا کرنی ہو تو اس کی واڑھی پکڑیں یا نوچیں، یا پھر اُس کی پگڑی گرا دیں یہ گویا موت جتنی دشمنی کو دعوت دینا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی قول دینا ہو تو اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جو قول دیا جائے گا وہ بہت ہی معتبر گردانا جائے گا۔

اگر دو گروہوں یا قبائل میں خون ریز جنگ ہو رہی ہو اور کوئی بلوچ اپنی پگڑی اتار کر لمبائی میں بچھا دے تو کوئی بھی شمشیر زن اُس کو پھلانگ کر دوسری طرف حملہ نہیں کرے گا۔ یہ گویا جنگ بندی کا تیر بہ ہدف نسخہ ہوا کرتا تھا۔

کوئی بہت بڑی منت (جی ہاں غیر معمولی منت) مانگنی ہو تو داڑھی مونڈی دی جاتی ہے۔

بہت ہی گری ہوئی دشمنی میں بھی کسی کی داڑھی مونڈ جاتی ہے۔ مگر اس طرح کے معاملات بہت ہی انتہائی اقدامات ہوتے ہیں جو کہ شاذ و نادر ہوتے ہیں۔

14۔ بیماری کے عقائد

ھُدّو

بلوچوں کو جھاڑ پھونک پر بھی بہت اعتقاد ہے۔ دَم کرنے کو جھاڑ کہتے ہیں جبکہ تھوک مارنے کو ''ھدو'' کہتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھنڈ جنغ

کچھ لوگ مریض کے پاس آ کر موسیقی کی دُھنوں پہ ناچتے ہیں اور ناچتے ناچتے بے ہوش ہو جاتے ہیں، ہوش میں آ کر وہ بتا دیتے ہیں کہ آیا وہ کرامت کے زور پر مریض کو ٹھیک کر سکتا ہے یا نہیں (انہیں ''شَیھ'' کہتے ہیں)۔ اس عمل کو ''جھنڈ جنغ'' کہتے ہیں۔

تعویز

ملا کی عدم موجودگی، یا کم موجودگی کے باعث تعویز والا معاملہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ اس کے حصول کے لیے دور دراز سفر کر کے مشہور ملا کے پاس جایا جاتا ہے۔ تعویز صرف بیماری کے علاج کے لیے نہیں لیا جاتا بلکہ اس سے بچاؤ کے لیے بھی۔ تیغ بند والا تعویز رکھنے والا شخص جنگ میں زخمی ہونے سے بچ جاتا ہے۔ تعویز زن بازی میں کامیابی کے لیے بھی لیا جاتا ہے۔ المختصر باور یہ کیا جاتا ہے کہ یہ زندگی کے تمام معمولی اور غیر معمولی حادثات کا تریاق ہے۔ اسے روزانہ پانی میں بھگو کر پیا بھی جاتا ہے اور تین یا سات پوشوں میں لپیٹ کر گلے، یا بازو میں باندھ بھی دیا جاتا ہے۔

جاگرو

مریض کی تیمارداری اور بالخصوص اُس کی سخت حالت میں اس پر شب بیداری انسانی بھائی چارے کی ایک زبردست مثال ہوتی ہے۔ رشتہ دار، ساتھی معتمد اور احباب دوست تشویش، مشوروں اور سوالوں کے ساتھ مریض پہ سخت رات جاگ کر گزارتے ہیں۔

علاج معالجہ

بلوچ کا علاج معالجہ مائتھالوجی اور بہت ہی ابتدائی سائنسوں کا مجموعہ رہا ہے۔ بہت ہی عملی مگر بہ یک وقت بہت ہی مافوق الفطرت............

داغ: بلوچ بہت ساری معلوم اور نامعلوم بیماریوں کے لیے لوہا گرم سرخ کر کے پیٹ، سر، یا گردن کو داغتا ہے۔ ٹائیفائڈ، جگر کی بیماریاں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب آٹھ دس سال سے داغ دینے کا کوئی کیس یا واقعہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ سائنس کی روشنی بھاری ہوتی جا رہی ہے۔ اور علاج کا ہسپتال والا طریقہ تیزی سے رواج پاتا جا رہا ہے، گو کہ اچھے ہسپتالوں کی کمی ہے، علاج پرائیویٹ اور

مہنگا ہو چکا ہے اور عام آدمی کی قوت خرید بہت گھٹ چکی ہے۔

پوست: فالج، صفرا، بخار اور دیگر درجنوں بیماریوں کے لیے مخصوص عمر کی بھیڑ یا بکری ذبح کر کے مریض کو کھال پہنائی جاتی ہے۔ راس آنے کی صورت میں کھال جسم کے ساتھ مکمل طور پر چمٹ جاتی ہے اور پسینہ آ جاتا ہے۔

کرہ شیر: ٹی بی کے لیے گدھی کا دودھ پلایا جاتا ہے۔

اوجھ: بہت سے لوگ لاغر کرنے والی بیماریوں کی صورت میں گائے کی اوجھری میں موجود غلاظت کے اندر مریض کو دو تین گھنٹے تک لٹا دیتے ہیں جسے ''اوجھ'' کہتے ہیں۔ کئی بیماریوں کے لیے گندم کی گرم روٹی یا مرغی کوٹ کر سر پر باندھ لی جاتی ہے۔

ماندری: ''ماندری'' سانپ کے کاٹے کو اپنے دم چھو سے بھی ٹھیک کر سکتا ہے او رعلاج سے بھی۔ لُنڈ، مشکی، سرخ، کالا اور کوبرا۔ اگر کسی کو سانپ کاٹے تو مرغی کے چوزے پکڑ کر اس کی مقعد کو انسانی جسم کے سانپ کاٹنے والی جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ مرغی کا چوزہ اپنی مقعد سے زہر چوس لیتا ہے اور خود مر جاتا ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس چوزے اس طرح مر جاتے ہیں، انسانی جسم سے زہر چوستے چوستے۔

جِن کشغ: ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا عورت کو لاٹھیوں سے بری طرح پیٹ کر اس کے ''جن'' نکالے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرچوں کی دھونی دے کر بھی اس کے جن بھگائے جاتے ہیں۔

پیراھی: مریض کی صحت مندی کے لیے پیر کے نام پر دنبہ، بکرا یا بیل ذبح کیا جاتا ہے یا ایسا کرنے کا عہد کیا جاتا ہے، اس کو ''پیراھی'' کہتے ہی۔

دانت درد: 1000 سال قبل مسیح میں جقدیم ایشیائی باشندوں یعنی Assyrians نے تصور کر لیا تھا کہ دانت کا درد ایک کیڑے سے ہوتا ہے تو انہوں نے اس کے خلاف ایک منتر پڑھنا شروع کیا؛

جب انّو دیوتا نے آسمان پیدا کیا اور آسمان نے زمین پیدا کیا اور زمین نے دریا پیدا کیے اور دریاؤں نے لہریں پیدا کیں اور لہروں نے دلدلی زمین پیدا کی اور دلدلی زمین نے کیڑا پیدا کیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیڑا روتے ہوئے اسی یوتا کے پاس گیا۔'' آپ مجھے کھانے کے لیے کیا دو گے؟ آپ مجھے پینے کے لیے کیا دو گے؟'' ''میں تمہیں، خشک انجیر دوں گا اور زردالو دوں گا''۔ ''میں ان کو کیا کروں گا خشک انجیر کو، زردالو کو! میرا درجہ بلند کردو اور دانتوں اور مسوڑھوں کے بیچ رہائش دے دو......''۔

''او کیڑے چونکہ تم نے یہ کہا تھا کہ دیوتا تمہیں اپنے ہاتھ کی قوت سے مار ڈالے شاید ۔دوسرے درجے کا بیئر اور تیل ملاؤ تین دفعہ منتر پڑھو اور دوائی دانت پر رکھو۔'' (7)

یہ سارے علاج معالجے، تعویز ٹوٹکے مریض کی عیادت کے موقع پر ایجاد اور سیلیکٹ کیے جاتے ہیں۔

عیادت

عیادت کا رواج بلوچ بھائی چارے میں اہم مقام رکھتا ہے۔مریض کے عزیز و اقارب جمع ہوجاتے ہیں، مریض کے اطراف ایک محفل جیسا مجمع لگا رہتا ہے۔ رات کو رت جگا یعنی ''جاگرو'' ہوتا ہے۔گپ شپ، ہنسی مذاق، شور شرابا اور یہیں پر فقیروں اور پیروں کی کرامات کی تعریف، مرض میں احتیاط اور پرہیز کی داستانیں، طبیبوں کی دانائی، جڑی بوٹیوں کی اقسام، خوردنی اشیا کی گرمی سردی، جونک، نسخے اور ہر طرح کے ٹوٹکوں پر کھلے عام بحث چلتی رہتی ہے۔ اور مریضوں پر یکے بعد دیگرے ہر نسخہ استعمال ہوتا رہتا ہے۔

15۔موت کی رسوم

میت

بلوچ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اپنوں کی میت ہمیشہ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہو۔ جنگ کے بھڑ کے شعلوں میں بھی بلوچ اپنی میت نہیں چھوڑتے ۔ اُسے کسی بھی طرح محفوظ رکھتے ہیں۔اگر ساتھ لے جانا اُس وقت ممکن نہ ہو تب وہ اسے پتھروں میں عارضی طور پر دفن کر لیتے ہیں جسے ہم گرو (Grav) کہتے ہیں۔''امانت'' رکھی ہوئی میت کو ہنگامی حالت ختم ہونے کے بعد آ کر

دوبارہ نکالتے ہیں اور اپنے آبائی قبرستان (جیرانڑ) میں تکریم کے ساتھ دفن کرتے ہیں۔

آس روخ

بلوچی زبان کا لفظ ہے جو آس بمعنی آگ، اور روخ بمعنی روشن (جلانا) ہے۔کسی عزیز کی موت پر بلوچ تین یا سات دن تک چولہا نہیں جلاتا۔سوگ میں کہ آگ اور اندھیرا، روشنی اور تاریکی انسانی سماجی زندگی کے استعارے ہیں۔اس دوران پڑوسی اور دیگر عزیز اور دوست غم زدہ گھرانے کے لیے چائے کھانا لاتے ہیں۔

معینہ مدت کے ختم ہونے پر حسبِ توفیق ایک خیرات کی جاتی ہے جو عوام الناس کے لیے ہوتی ہے۔اس خیرات کو، اور اس کے نتیجے میں گھر میں دوبارہ چولہا جلنے کی رسم کو ''آس روخ'' کہتے ہیں ۔ یہ لفظ ایک ضرب المثل بھی ہے جہاں دشمن کی موت کی خواہش میں اُس کا ''آس روخ'' (موت کی خیراٹ) کھانے کی خواہش کی جاتی ہے۔

بلوچوں میں چالیسواں نہیں ہوتا لیکن پہلی برسی ضرور ہوتی ہے جسے ''سال'' بولتے ہیں۔ (اور یہی سال صرف اور صرف برسی ہوتی ہے۔اس لیے کہ بلوچوں میں سالگرہ نہیں، ہوتی)۔

حوالہ جات

1- میکلگین ای ڈی، روز ایچ اے۔ترجمہ: یاسر جواد۔ ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا۔2004۔بک ہوم لاہور۔ صفحہ 66

2۔مبارک علی، بازار اور دوسرے مضامین۔1998، نگارشات ٹمپل روڈ لاہور۔صفحہ 73

3۔گی، سلیم خان، بلوچی ادب......بلوچی ثقافت۔1990، صفحہ 122

4۔ایضاً۔صفحہ 125

5۔مری، مٹھا خان۔ثقافت اور ادب وادی بولان میں، بزم ثقافت کوئٹہ، صفحہ 135

6-پلونر ودا/انور زاہدی۔یادیں۔1996۔عفرا پبلی کیشنز لاہور۔صفحہ 95

7- ساگاں، کارل۔Cosmos۔1998۔ایکس لندن۔صفحہ 12

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں